نبوّت کا ظہورِ اتم

المعروف بہ

نبئ کامل

تالیف

مبلّغ اسلام الحاج حضرت خواجہ کمال الدّین صاحب مرحوم

شائع کردہ

دارالاشاعت کتبِ اسلامیہ۔ ۱۷۔ مولانا آزاد روڈ۔ فاطمہ بائی کورٹ
چوتھا منزلہ جیکب سرکل بمبئی ۴۰۰۰۱۱

ٹیلی فون ۳۰۹۲۲۳۸ ، ۳۰۸۸۲۳۰

نام کتاب : نبوّت کا ظہور اِتم المعروف بہ نبیٔ کامل

تالیف : الحاج حضرت خواجہ کمال الدین صاحب قبلہ

سن اشاعت : ۱۹۹۶ء

تعداد صفحات : ۲۴۲۔

کتابت : محمد حنیف بستوی احمدی

قیمت : ۷۵/ روپے

ناشر : دارالاشاعت کتب اسلامیہ

۱۷۔ مولانا آزاد روڈ چوتھا منزلہ فاطمہ بائی کورٹ
جیکب سرکل۔ بمبئی ۴۰۰۰۱۱۔ {فون: ۳۰۸۸۳۳۰
۳۰۹۳۴۳۸

بھارت پریس : ۲۰۴۵۔ گلی قاسم جان بلیماران دہلی ۶ ۱۱۰۰۰

ISBN 81-900537-5-2

فہرست مضامین

بیادگار

قبلہ امُ

حضرت

خواجہ جمال الدینؒ صاحب مرحوم (بی اے)

انسپکٹر مدارس محکمۂ تعلیم ریاست جموں و کشمیر

یہ چند اوراق اس لئے لکھتا ہوں کہ خواجہ صاحب مرحوم میرے حقیقی خواجہ اور ہر معنوں میں محسن تھے. قارئین کرام میری درخواست پر اُن کے لئے دُعائے مغفرت کریں۔

خواجہ کمال الدینؒ ———

"دوستو۔ اُٹھو۔ جاگو غفلت کو چھوڑو۔ میرے ساتھ ہو جاؤ۔ میں آپ کو اس کام کی طرف بلاتا ہوں جو آپ کا فرض اولین ہے۔ یہ وہ کام ہے جس کے لئے قرآن دنیا میں آیا یہ وہ کام ہے جس کے لئے آنحضرت صلعم نے بعثت فرمائی۔ یہ وہ فرض ہے جس کے لئے سیدالعرب والعجم نے ہر قسم کے دُکھ اٹھائے۔ صحابہؓ کی عزیز جانیں اسی راہ میں قربان ہوئیں۔ یہ وہ درخت ہے جسے آپ کے بزرگوں کے خون نے سینچا۔ دیکھو آپ کے کل قومی کام ایک طرف اور انگلستان میں تبلیغ و اشاعت اسلام کا کام اپنی اہمیت اور نتائج کے لحاظ سے ایک طرف۔

آہ میں کہاں سے وہ طاقت لاؤں۔ جو آپ کو آپ کے اس فرض اولین کی طرف لے آوے وہ کونسا منتر پڑھوں جس سے آپ ہمہ تن اس کام کی طرف متوجہ ہو جاویں۔

یاد رکھو تمہاری قومی اہمیت تمہاری طاقت تمہاری فلاح و عزت صرف اس ایک کام سے خاص کر وابستہ ہے۔ جس طرف میں گیا ہوں۔ خواہ تم مانو یا نہ مانو"

{ کمال الدین ۔ اگست ۱۹۱۵ء }

الحاج حضرت خواجہ کمال الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سنہ ۱۸۷۰ء میں پنجاب میں پیدا ہوئے اسکول کی تعلیم مقامی اسکول میں حاصل کر کے وہ فورمین کرسچین کالج لاہور میں داخل ہوئے ۔ یہ کالج پنجاب کی قدیم ترین انگریزی درسگاہ ہے ۔ اور ایک مدت کلکتہ یونیورسٹی سے بھی منسلک رہ چکی ہے ۔ اس زمانے میں عیسائیوں کا تبلیغی مرکز یہی کالج تھا ۔

خواجہ کمال الدین صاحب مسلمانوں میں وہ واحد ہستی ہے ۔ جنہوں نے سنہ ۱۸۹۳ء میں اندرونی شہر لاہور میں سب سے پہلے بی ۔ اے ۔ ایل ایل بی کیا اور اکنامکس میں طلائی تمغہ حاصل کیا ۔ آپ اسلامیہ کالج لاہور کے بانیوں میں سے ہے ۔ اور وہ شخصیت ہیں ۔ جو اسلامیہ کالج کے سب سے پہلے پرنسپل منتخب ہوئے انھوں نے ہی مسلم ہائی اسکول کی عمارت اور جامع مسجد کے لئے اپنی زمین پیش کی فورمین کرسچین کالج کی تعلیم نے انھیں اسلام سے بے گانہ کر دیا ۔ اور وہ رواں دواں عیسائیت کی دہلیز پر آن پہنچے ۔ اکثر علماء سے انھوں نے باتیں کی ۔ لیکن وہ ان کی تسلی نہ کرا سکے ۔ نتیجتاً خواجہ صاحب بپتسمہ کے لئے تیار ہو گئے ۔ قبل اس کے کہ وہ ایسا کر گزرتے ۔ ان کے ایک ہمدرد نے انھیں کہا کہ "قادیان میں ایک انسان اسلام کو سچا دین ثابت کرنے کا مدعی ہے ۔ آپ اس سے بھی مل لیں" خواجہ صاحب یہ حجت بھی پوری کرنے کے لئے قادیان گئے ۔ نہ جانے انھوں نے وہاں کیا دیکھا ۔ کہ پھر اسلام ہی کے لئے اپنی تمام زندگی وقف کر دی ۔ اشاعتِ اسلام کے فریضہ کو سرانجام دینے کے لئے تمام کام چھوڑ چھاڑ کر انگلستان تشریف لے گئے ۔ اور اسی کو اپنی جولان گاہ بنایا ۔ اور اسلام کی تبلیغ کے لئے دن رات کوشش کی سنہ ۱۹۱۲ء میں ووکنگ مسلم مشن کی بنیاد رکھی ۔ اور تبلیغ اسلام کے لئے ایک انگریزی مجلہ اسلامک ریویو" جاری کیا ۔ جو دسمبر سنہ ۱۹۷۰ء تک باقاعدہ شائع ہوتا رہا ۔ آپ نے دفاع اسلام کے لئے تقریباً ایک سو انگریزی اور اردو میں نادر کتب تصنیف فرمائی ۔

سنہ ۱۹۲۶-۲۷ء کی سلطنت برطانیہ کی سالانہ رپورٹ میں خواجہ صاحب موصوف کو برطانیہ کے GREAT MEN کی لسٹ میں پیش کیا گیا ہے ۔

سنہ ۱۹۳۲ء میں آپ کی صحت بہت خراب ہو گئی ۔ تو لاہور آئے اور وہیں ۲۸ ، دسمبر سنہ ۱۹۳۲ء کو وفات پائی ۔ آپ کے ہاتھ پر جو انگریز مسلمان ہوئے تھے آج ان کی تعداد بڑھ کر ہزاروں تک پہنچی ہے ۔ اور وہ دن قریب ہیں جب پورا انگلستان مسلمان ہوگا ۔ یہ خدا تعالیٰ کے وعدے ہیں ۔ (تم مجھ سے کئے گئے وعدے پورے کرو میں تم سے کئے گئے وعدے پورے کروں گا) یہ خدا تعالیٰ کا بیان ہے اور ہمارے ایمان کا امتحان ! آیئے اس پیمان کو مضبوطی سے پکڑ لیں اور دعوت کو مضبوط کریں ۔

منجانب : ناشر

مُقدمہ

اس کتاب کا مُصنف، جس کی تصنیف زیر نظر نے اسلامی تاریخ میں نہایت قیمتی اضافہ کیا ہے۔ محتاج تعارف نہیں کیونکہ اُن کا نام بلادِ مغرب و مشرق دونوں میں یکساں طور پر معروف ہے۔ اور جس نیک نیتی اور اعتدال کے ساتھ وہ مختلف مضامین پر قلم اُٹھاتے ہیں، اُس کی تعریف اُن کی تصانیف کے تمام پڑھنے والے کرتے ہیں۔

مثل دیگر کُتب کے جو دس یا بارہ ہوں گی۔ اِس کتاب میں بھی وہی خصُوصیت صحت نمایاں ہے جو کچھ لکھا ہے وہ قابلِ اعتماد اسناد سے مؤیّد اور مُصدّق ہے۔ مثال کے طور پر اس سے پہلی تصنیف یعنی "ینابیع المسیحیت" ہی کو لے لیجئے، قابلِ غور امر یہ ہے کہ کوئی شخص حتےٰ کہ ارکان و رسائل کلیسائی بھو واقعات مندرجہ کی صحت کے خلاف اپنے قلم کو جُنبش نہ دے سکے۔

یُورپ میں جو کتابیں حال میں شائع ہوئی ہیں۔ اُن میں اس امر کے دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہم مسلمان آنحضرت صلعم کو ایک نئی شکل میں پیش کر رہے ہیں۔ اور ہمارا اسلام "بہ لباسِ دگر" جلوہ گر ہو رہا ہے۔ تاکہ اس طور سے ہم یُورپ میں اشاعت اسلام بہ آسانی کر سکیں۔ یہ کتاب محض اُن دشمنانِ اسلام کے اِس باطل پروپگنڈہ کے دفعیہ میں لکھی گئی ہے۔ اور مجھے کامل یقین ہے۔ کہ جو لوگ اطمینان کے ساتھ اس کتاب کو اوّل سے آخر تک پڑھ لیں گے۔ وہ اس بات کا اقرار کریں گے کہ خواجہ صاحب کو اپنے مقصد میں نہایت شاندار کامیابی نصیب ہوئی ہے۔

ہمارے نقاد ایک امر فراموش کر جاتے ہیں۔ وہ نہیں سوچتے کہ آنحضرتؐ کے واقعات زندگی اس قدر نمایاں اور اس درجہ مُنضبط ہیں۔ کہ اُن میں کسی تغیّر و تبدّل کی گنجائش ہی نہیں۔ احادیث نبوی کی ضخیم مجلّدات موجُود ہیں۔ جن پر کافی تنقید ہو چکی ہے۔ اور اُن کی صداقت ہر شخص کے نزدیک مُسلّم ہے۔ اُن کتب کی مدد سے آنحضرتؐ کے سوانح حیات پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ اور مُصنف نے تمام واقعات د

بیانات کو انہی پر مبنی کیا ہے۔ مسلمان اس معاملہ میں اس قدر محتاط واقع ہوئے ہیں۔ کہ اگر آنحضرت صلعم کے سوانح کا کوئی حصہ احادیثِ نبوی میں نہ ہو تو وہ اس کو قبول نہیں کرتے خواہ اس سے آنحضرتؐ کی کتنی ہی شان کیوں نہ بڑھتی ہو۔ اس ضمن میں مصنف نے ایک خاص سوانح نگار یعنی واقدی کا ذکر بھی کیا ہے۔ جس کے بعض بیانات اور سوانح متعلقہ حیاتِ آنحضرت صلعم کو کئی مستند اور معتبر علماء نے محلِ نظر قرار دیا ہے۔ ان علماء اور ائمہ میں سے ایک زبردست ہستی امام شافعیؒ بھی ہیں۔ جو اوائل اسلام میں ہوئے ہیں۔ بدقسمتی سے بعض یوروپین مصنفین نے اسی واقدی کو اپنا ماخذ گرداناہے۔ اور اس کی جن بیان کردہ باتوں کو علمائے اسلام نے مردود قرار دیا ہے۔ انہی کو ان معاندانِ اسلام نے رنگ روغن لگا کر اپنی کتب میں بیان کیا ہے۔ اس سلسلہ میں پروفیسر مارگولیتھ کا نام خلافِ محل نہ ہوگا۔ اس لئے کہ ان کی عربی دانی کا عام طور پر شہرہ ہے۔ امام شافعیؒ نے جو کچھ واقدی کے متعلق لکھا ہے۔ وہ ان کی نظر سے ضرور گزرا ہوگا۔ ابن خلکان نے جو کچھ لکھا ہے۔ انہوں نے وہ بھی پڑھا ہوگا۔ جو کہتا ہے کہ "واقدی سے جو روایات ہم تک پہنچی ہیں۔ وہ سب کی سب ضعیف اور ناقابلِ اعتماد ہیں۔ ان کی صحت اکثر علماء کے نزدیک مشکوک ہے" امام صاحب فرماتے ہیں "واقدی کی ساری تصنیفات دروغِ بے فروغ کا انبار ہیں" پروفیسر مذکور نے جب واقدی سے روایات نقل کیں۔ تو ان کا یہ فرض بھی تھا کہ ان جیّد علماء نے جو خیالات اس کے متعلق ظاہر کئے ہیں ان کو من وعن بیان کر دیتے۔ اور اگر وہ ان علماء کے فیصلوں سے واقف نہیں تو پھر لامحالہ یہ کہنا پڑے گا کہ عربی تاریخ وسیر پر ان کی نظر نہایت ناکافی ہے۔ اور جو کچھ ان کی وسعتِ معلومات کے متعلق سنا وہ افسانہ سے زیادہ وقیع نہیں ہے۔

کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ کہ عیسائی مشنری اور دیگر علماء مغرب دیدہ ودانستہ اسلام کے متعلق غلط بیانیاں کرتے رہتے ہیں۔ بارہا عیسائیوں نے دورانِ گفتگو میں مجھ سے کہا ہے "تم لوگ محمدؐ کی پرستش کرتے ہو۔ اور چار عورتوں سے شادی کرنے پر مجبور ہو" یا "تم مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہو کہ عورتوں میں روح نہیں ہوتی اور انھیں مسجد میں جانے کی اجازت نہیں ہے" یہ باتیں قطعاً سادگیٔ قلب سے کہی جاتی ہیں۔ اور ان سے دل آزاری بھی مقصود نہیں ہوتی۔ لیکن ایک بات ثابت ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ عیسائی پادریوں نے اسلام کے متعلق اس قدر مہمل اور غلط باتیں یوروپ میں

شائع کردی ہیں کہ اس کی اصلی تعلیم قطعاً نظروں سے پوشیدہ ہوگئی ہے۔

غالباً ہر سمجھدار آدمی اس امر میں مجھ سے متفق ہوگا کہ دوسرے مذاہب کے متعلق دروغ گوئی اور غلط بیانی سے اپنے مذہب کی اشاعت کرنا نہایت ہی مکروہ اور کمینہ حرکت ہے۔ چنانچہ خود خواجہ صاحب اسی کتاب میں لکھتے ہیں۔ "اس معاملہ میں عیسائی پادری بدترین مجرم ہے۔ وہ اپنے انبیائؑ کی بھی عزت نہیں کرتا اور میں اس کی ذہنیت کے سمجھنے سے بکلّی قاصر ہوں۔ ایک طرف تو وہ بہت سے یہودی مشائخ کو نبی تسلیم کرتا ہے۔ دوسری طرف ان کی برائیاں مزے لے کر بیان کرتا ہے۔ اور اس طرح وہ ان لوگوں پر نکتہ چینی بھی کر لیتا ہے۔ جو بقولِ بائبل خداوند کے راستہ پر چلتے تھے۔ تو اب یہ سوال ہے کہ عیسائی پادریوں کے ایسے خدا کے متعلق کیا خیال رکھا جائے۔ جو ایسے غیر راستباز لوگوں کو اپنا پیغامبر بنا کر بھیجتا رہا۔ اور انھیں انسانوں کے لئے نمونہ یا اسوہ قرار دیتا رہا۔" مجھے بہت خوشی ہے کہ خواجہ صاحب نے اپنی تحریر میں اسلامی رواداری کی روح کو بخوبی قائم رکھا ہے۔ اور اُن کی سابقہ تصنیفات میں بھی یہی رنگ جھلکتا ہے۔ افسوس ہے کہ یہ بات مسیحی مُصنّفین کی تحریر میں مطلق نہیں پائی جاتی۔ لوگوں نے اس طرزِ تحریر کو بہت پسند کیا ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ ہمارے مسیحی دوست بھی اس طرز کی تقلید کریں۔ مثلاً "حضرت یسوع پھر دائرہ انسانیت میں آگئے ہیں نہ تو خدا اور نہ اس کے بیٹے بلکہ محض انسان اور تحریکِ جدید کے ارکان تو شب و روز اس خیال کی ترویج میں معروف ہیں۔ حضرت یسوع خدا کے سچے نبی گزرے ہیں۔ بلکہ اسلامی انبیائؑ میں سے ہیں۔ یہ بہت ممکن ہے کہ وہ جملہ انبیاء میں برگزیدہ نہ ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ نہایت اعلیٰ کیرکٹر کے مالک تھے۔ آپ حلم، ایثار، اور انکسار کا مجسمہ تھے۔ انسانی تکالیف پر ان کا دل آٹھ آٹھ آنسو روتا تھا۔ ہر آزمائش کا مردانہ وار مقابلہ کرتے تھے۔ اگرچہ سوشل حالت اُن کی اعلیٰ نہ تھی۔ لیکن ان میں اس قدر جرأت اخلاقی ضرور تھی۔ کہ اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کی ریاکاری کا بھانڈا سرِ بازار پھوڑ دیتے تھے لوگوں نے ان کی توہین کی بیحد تکالیف دی۔ لیکن انہوں نے سب باتوں کو صبر اور ضبط کے ساتھ برداشت کیا۔ دوستوں کی خدمت کی اور دشمنوں کے حق میں دعائے خیر۔ معجزات دکھائے۔ مگر کبھی ان پر فخر نہ کیا اور ہمیشہ ان معجزات کو اللہ تعالےٰ کی انگشتِ قدرت سے منسوب کیا۔ اور یہ بھی اعتراف کیا کہ دوسرے لوگ بھی اُن پر قادر ہو سکتے ہیں۔ اپنی کمزوریوں کا کھلے دل سے اقرار کر لیتے تھے۔ اپنے وقت کے

سچے نبی تھے۔ جنہوں نے اپنی سوسائٹی کے ان عیوب کو اچھی طرح پہچان لیا جو اس کے افراد کا خون چوس رہے تھے۔ اور دن بدن ان کو قعرِ مذلت میں گرا رہے تھے۔ سقراط اور دوسرے شہدائے حق کی طرح یسوع نے بھی اپنی جان صداقت کی خاطر قربان کر دی۔ اگرچہ اُن کی ہمدردی ایک خاص طبقہ سے مختص تھی۔ یعنی یہوداور یروشلیم سے، لیکن اُن کی آیندہ تباہی کا خیال کر کے جو آنسو ان کی آنکھوں سے نکلے وہ ان کی اِنسانیت پر نہایت روشن دلیل ہیں۔ فی الجملہ یسوع مختلف پہلوؤں سے نہایت قابلِ تعریف ہستی ہے۔ لیکن اگر ہم ان کو خدا فرض کرلیں۔ تو پھر ان کی خوبیاں، ان کی مفروضہ الوہیت کے لئے باعثِ نقصان ٹھیرتی ہیں۔ بلکہ ان کو مرتبہ الوہیت ہی سے خارج کرتی ہیں۔ اور ان کی تمام خوبیاں عظمت اور شرافت وغیرہ سب خاک میں مل جائیں گی۔"

بطورِ موازنہ مس لوار امیلن سوابرج کی ایک کتاب موسومہ "نظارہ و مقامدنسایت" سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں۔ اس کتاب میں اسلام کے متعلق مندرجہ ذیل عبارات موجود ہیں۔ اور چونکہ بشپ آف لنڈن نے اس کتاب پر مقدمہ لکھتے ہوئے یہ الفاظ بھی لکھے ہیں۔ کہ "یہ ایک قابلِ دید کتاب ہے"۔ اور قوم کو اس کے مطالعہ کی ہدایت بھی فرمائی ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب کلیسیائے انگلستان کے ایک زبردست حصہ کی منظوری سے شائع ہوئی ہے۔ بہرکیف وہ اقتباسات یہ ہیں:۔

"ناظرین اب آپ اس خوفناک خطرہ اور سنجیدہ تنبیہ کی ایک جھلک دیکھ لیجئے۔ اس کاذب (نعوذ باللہ) نبی کا ہلال بائیس کروڑ انسانوں پر لہرا رہا ہے۔ اور یسوع کی صلیب سے برسرِ پیکار ہے۔ ہلال کی شکل اس رُوح مادیت کا نشان ہے۔ جس نے تلوار کے زور سے لوگوں کو اپنا پیرو بنا لیا۔ یہ مذہب انسان کے دنیاوی اور نفسانی جذبات سے اپیل کرتا ہے۔ دنیاطلبی اور محبتِ الٰہی سے مخالفت پر تلا رہتا ہے یہ مذہب اگرچہ توحید باری کے عقیدہ کا بیانگِ دہل اعلان کرتا ہے۔ لیکن اس کا خدا نہ تو اخلاقی طور پر مقدس ہے۔ اور نہ محبت اور رحم کا مظہر ہے۔ علاوہ بریں ہمارے خداوند کی گناہ معاف کرانے والی قربانی کی زبردست تحقیر کرتا ہے۔ یسوع کی مخالفت اس مذہب کی رگ و پے میں جاری ہے۔ اس نے شیطان کی حکومت کی بنیاد قائم کر دی ہے۔ کیونکہ شیطان کا پرانا وعدہ یہی ہے۔ اگر تو مجھے سجدہ کرے تو دنیا کی بادشاہت تجھے دے دوں گا۔ سب کچھ تیرا ہو گا۔ دنیا کی تمام بادشاہتیں

اور ان کی شان و شوکت اگر تو اپنی روح خواہشات نفسانی غرور اور شہوات بصر کے ہاتھ فروخت کر دے"۔

"ذرا محمدؐ (ابی وامی فداہ) کے دعوے پر غور کیجئے۔ یہ وہ شخص ہے جو ہمارے خداوند کے بعد مدعیٔ نبوت ہوا۔ اور اس نے دانستہ ہمارے خداوند کا مقابلہ کیا، انکار کیا بلکہ تحقیر اور اس کے دعاوی کی تردید کی"۔

"عیسائیوں کی باہمی محبت فرقہ وارانہ نفرت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ پس جب اسلام آیا تو عیسائیت کا ایک فرقہ اگر مغلوب ہوا تو دوسرے نے بغلیں بجائیں۔ یسوع کی دلہن (عیسائی قومیں) اپنے خاوند سے بیوفائی پر کمر باندھ چکی تھی۔ اور روح قدس کے بجائے، اس کے رگ و پے میں دنیا کی محبت سما چکی تھی برائے نام زندہ تھی۔ مگر دراصل مردہ۔ نئی خوفناک طاقت کا مقابلہ کرنے کے لئے اس کے پاس سوائے مادی اسلحہ کے اور کچھ نہ تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا کے اکثر ممالک سے یسوع کی کلیسیا حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی۔ جہاں کسی وقت عیسائی عبادت کرتے تھے۔ وہاں اب مسلمان نماز پڑھتے ہیں۔ اور یسوع کے دعاوی کی زبردست تکذیب کرتے ہیں"۔

"ذرا قرآن مجید پر ایک نظر ڈالئے یہ اس کاذب (نعوذ باللہ) نبی کی کتاب کا نام ہے۔ اور تمام دنیا میں یہی ایک کتاب ہے۔ جو ابدی انجیل کا انکار بھی کرتی ہے۔ اور اسے منسوخ بھی۔ نیز یہ کتاب اس خوشخبری کی بھی تکذیب کرتی ہے۔ جو خداوند نے ساری دنیا کے لئے مقرر کی تھی"۔[1]

ان اقتباسات کے آگے اس سے بھی بڑھ چڑھ کر مخالفانہ انداز بیان موجود ہے مجھے افسوس ہے کہ بشپ آف لندن جیسی مقتدر شخصیت نے ایسی کتاب کو اپنے نام سے منسوب ہونے کی اجازت دی۔ پھر یہ عورت لکھتی ہے:-

"محمدؐ (ابی وامی فداہ) سے پہلے عرب میں عورتوں کو بہت آزادی حاصل تھی اور مردوں سے ان کے تعلقات بمقابلۂ حال بہت زیادہ شگفتہ اور آزاد تھے"۔

میں نہیں چاہتا کہ ناظرین کے سامنے اس کتاب سے مزید اقتباسات پیش کروں۔ کیونکہ اس کے ہر صفحہ میں نہایت نازیبا بلکہ مسیحی سپرٹ کے خلاف الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اور اسلام اور بانیٔ اسلامؐ کے خلاف سراسر باطل اور ناپاک خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ لیکن ہر اعتراض کا جواب شافی اس کی کتاب کی طرف اشارہ کئے بغیر دیا گیا ہے۔ میں تو اس کتاب کو قابل ذکر بھی نہ سمجھتا اگر بشپ آف لندن نے ایسی

[1] The Vision and Mission of Womanhood

نازیبا تالیف کے مطالعہ کی سفارش نہ کی ہوتی :۔

اس عورت کے آخری اقتباس "عرب کی قبل از اسلام عورت" کے متعلق خواجہ صاحب لکھتے ہیں ۔

"ملک عرب اُس وقت تاریک ترین جہالت میں غرق تھا۔ ایسا تاریک زمانہ دُنیا کی تاریخ میں اور کہیں نہیں ملتا۔ شرابخوری زناکاری اور قمار بازی کا دور دورہ تھا۔ قتل و غارت، اطفال کُشی اور لُوٹ مار وغیرہ عربوں کے لئے مایۂ افتخار چیزیں تھیں ۔ کسی قسم کی اخلاقی، مذہبی یا تمدّنی قیود کا وجود نہ تھا۔ شادی بیاہ کی کوئی حد نہ تھی۔ طلاق پر کسی طرح کی پابندی نہ تھی ۔ تعلقات زن و مرد میں آزادی کے علاوہ لوگ بیحد اخلاقی برائیوں کا شکار ہو رہے تھے ۔ بیٹے، اپنے باپوں کی عورتوں کو اپنی عورتیں سمجھتے تھے۔ شادی شدہ عورتیں، غیر مردوں سے رسم و راہ رکھنے میں کوئی شرم و حیا محسوس نہیں کرتی تھیں ۔ بلکہ ایسی عورتیں، غیر مردوں سے ناجائز تعلقات کا ذکر بڑے فخر سے کیا کرتی تھیں "۔

آخر میں لارڈ بشپ آف کنٹربری کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں کہ ہم مسلمان سلطنتِ برطانیہ کا جزوِ عظیم ہیں ۔ بلکہ میں نے تو یہ سنا ہے کہ ملک معظم جارج پنجم کی سلطنت میں عیسائیوں سے مسلمان زیادہ ہیں۔ ممکن ہے کہ لارڈ موصوف اپنا اثر اس طرح استعمال کریں ۔ جس کی بناء پر اُن کے دُرشت طبع ہم مذہب رمس مذکورہ کی طرز تحریر اور دل آزار تقریر سے باز آجائیں۔ کیونکہ ایسی باتیں ہمیشہ باہمی اختلافات اور غلط فہمیوں کا موجب ہوا کرتی ہیں ۔

ہیڈلے الفاروق

آئی وی لاج

سینٹ مارگریٹ آن ٹھیمس ٹوئکنیم

مورخہ ۲ / دسمبر ۱۹۲۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

دیباچۂ کتاب

مسیحی رنگوں سے تیار کی ہوئی محمدؐ کی ایک نئی تصویر

یہ جملہ ریورنڈ کیش نے اپنی کتاب "مسلم ورلڈان ریوولوشن" میں آنحضرتؐ کی اُن لفظی تصاویر کے متعلق لکھا ہے۔ جو اسلامک ریویو (ووکنگ مسلم مشن) کے صفحات پر وقتاً فوقتاً کھینچی گئی ہیں۔ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی صحیح شکل وصورت اہل مغرب کی نگاہوں سے اب تک مخفی رہی۔ اور ان کے پاس مذہب اسلام اور اس کے بانیؐ کے متعلق جو کچھ سرمایہ معلومات تھا۔ اس کی حیثیت ایک فرضی افسانے سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن جب آنحضرتؐ کا اصلی حُسن بے نقاب کیا گیا۔ تو ہمارے مخالف نکتہ چینوں کی آنکھیں حیرت سے کُھلی کی کُھلی رہ گئیں۔ آنحضرتؐ کی جو دلرُبا تصویر ہم نے ان کے سامنے پیش کی۔ تو اس نے اہلِ مغرب کی غلط بیانیوں کا پردہ چاک کر دیا۔ اور ان کی تمام گذشتہ محنتیں خاک میں مل گئیں۔ لیکن اس تصویر میں اس قدر دلکشی تھی۔ کہ ان کو کوئی نقص نکالنے کی توجرات نہ ہوسکی۔ ہاں تو یہ کہا۔ کہ ہم نے آنحضرتؐ کی جو تصویر پیش کی ہے۔ وہ غیروں کے مرغوب وپسندیدہ مصالحوں سے بنائی گئی ہے۔ اس لیئے یہ آپؐ کی حقیقی شکل وصورت ظاہر نہیں کرتی۔ ہمارے مخالفین کے نزدیک تصویر کا رنگ وروغن تو فی الحقیقت نہایت دلفریب ہے۔ لیکن یہ اسلامی رنگ وروغن نہیں۔ یہ وہ طریقہ ہے۔ جس سے یہ لوگ اپنا دل توش کر لیا کرتے ہیں۔ جب ان کی پہلی بنائی ہوئی بات بگڑ گئی۔ تو ایک نئی بات بنالی۔ اور جدید اسلام اور جدید محمدؐ[1] کا شور بلند کرنے لگے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ

---

[1] ایک اور شخص ڈاکٹر ڈبلیو سٹنیٹن ہے۔ جس نے غلطی سے یہ سمجھ لیا ہے۔ کہ ہندوستان میں اسکے چند روزہ قیام نے اِسے اسبات کا حقدار بنا دیا ہے۔ کہ وہ اسلام کے متعلق اپنے آپ کو بطور سند پیش کرے۔ اس نے ایک مسیحی اخبار میں یہ لکھ کر کہ "ووکنگ کا اسلام ایک ایسی چیز ہے۔ جسے اس نے اس سے پہلے کبھی نہ سُنا تھا"

لوگ ہمارے کام کی قدر اس سے زیادہ بہتر طریق سے کر ہی نہ سکتے تھے۔ اسی لئے ہم نے ان کے شور کو قدر افزائی پر محمول کیا۔

حضرت محمدؐ مغربی دنیا کے لئے ایک اعتبار سے بیشک "نئے محمدؐ" ہیں اور جس طرح بہترین قدرتی اشیائے جن کا حسن ہر دم ترقی پذیر رہتا ہے۔ اور اس لئے وہ ہمیشہ تازہ نئی اور حیرت انگیز شکل میں نظر آتی ہیں۔ اسی طرح رسول عربیؐ بھی ایک عرصہ تک نئے ہی معلوم ہوں گے۔ وہ اشیاء جو ناواقفیت اور جہالت کی وجہ سے قابلِ نفرت معلوم ہوتی ہیں۔ جب ان کی اصل حقیقت آشکارہ ہو جائے اور وہ علم و بینش کی نظروں سے دیکھی جائیں۔ تو نظر آتا ہے۔ کہ اُن میں حُسن بھی ہے۔ اور دلکشی بھی۔ یہی کیفیت حضور رسُولِ مقبولؐ کی ہے اب تک آپؐ کے متعلق نہ صرف جہالت بلکہ غلط بیانی یا واقعات کو مسخ کر کے صداقت پر پردہ ڈالا جا رہا ہے۔ "نیا محمدؐ" یا "جدید اسلام" کوئی نئی آواز نہیں ہے۔ یہ تو وہ پرانی آوازِ بازگشت ہے۔ جو ہر اس موقعہ پر گونجتی رہی ہے جب یورپ میں آپؐ کا کوئی نیا ثنا خواں پیدا ہوا ہے۔ جس نے آپؐ کی مدحت و ستائش میں بلا توقف و خطر آواز بلند کی ہے۔ گبن اس وجہ سے کافر قرار دیا گیا۔ کہ اس نے آنحضرتؐ کی تعریف کی۔ اور آپؐ کے زمانہ کی مسیحیت پر دیانتداری سے لیکن ناخوشگوار خیال ظاہر کئے۔

جب کارلائل نے آنحضرتؐ کی خوبصورت تصویر مغربی آنکھوں کے سامنے بے نقاب کی۔ تو یہی پرانی آواز ان کے خلاف اس جوش کے ساتھ بلند ہوئی کہ ایڈنبرا یونیورسٹی کا ڈین بھی مرعوب ہو گیا۔ اور مجبور ہوا کہ اپنی آیندہ تحریروں میں آنحضرتؐ کی تعریف و توصیف دبی زبان سے کرے اگرچہ دوسرے معاملات میں وہ نہایت راسخ العزم تھا۔ لیکن کارلائل نے بہت سے لوگوں کے لئے تحقیق کا دروازہ کھول دیا۔

(بقیہ صفحہ ۱۳) اپنی جہالت کا پورا ثبوت دیا۔ اس نے جو کچھ لکھا۔ اپنی دانست میں اس نے کوئی غلط بیانی نہیں کی کیونکہ اس سے پہلے وہ حقیقی اسلام سے قطعی ناواقف تھا، اسلام کا مطالعہ اس نے تعصب کی عینک لگا کر کیا۔ تاکہ اسلام کے خلاف جنگ و جدل میں وہ اس کے کام آئے۔ لیکن ووکنگ کے ذریعہ اصل حقائق اسے نظر آنے لگے۔ اسلام کی سچی تصویر جو ہم نے کھینچی۔ اسکی مخالفت میں تو وہ کچھ کر نہ سکا لیکن کس بیرسی کے عالم میں اپنے بھائیوں کے ساتھ ملکر جو مسیحیت کی نشر و اشاعت میں مشغول ہیں۔ "ووکنگ میں نیا اسلام" "ووکنگ میں نیا اسلام" چلانے لگا۔

اُس کی کتاب ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ کی تقلید میں بگنسر ڈیون پورٹ، بوسورتھ سمتھ نے انگریزی میں کریل اور گریمنس نے جرمنی میں کیتانی نے اطالوی زبان میں نہایت قابلِ ذکر کتابیں تصنیف کیں۔ انہوں نے تعلیم یافتہ یورپ کی نگاہوں میں وہ تمام دلیلیں توڑ ڈالیں۔ جو مسیحیت نے اسلام کے خلاف جمع کر رکھی تھیں۔"اب محمدؐ یورپ کی نظر میں مفتری (معاذاللہ) نہیں۔ بلکہ ایک مصلحِ اعظم ہیں۔ آپؐ کو عارضۂ مرگ بھی نہیں ہے (جیسا کہ پہلے سمجھا جاتا رہا تھا) بلکہ ایک صاحب خُلقِ عظیم اور راسخ العزم ہیں۔ آپؐ کوئی خود مطلب انسان بھی نہیں۔ جو اپنی ذاتی اغراض کے لئے استبداد پسند ہوں۔ بلکہ ایک نہایت شفیق مہربان حکمران ہیں۔ جن کے چاروں طرف محبت اور نور ہی نور ہے۔ آپؐ کوئی کاہن یا ہنگامی امور کے متبع نہیں بلکہ ایک پیغمبر ہیں۔ اور ایک خاص اعلےٰ غرض اور نصب العین اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ اور نہایت اولوالعزم ہیں۔ یہ سب اعلےٰ صفات آپؐ کی ذات پاک میں یورپ نے تسلیم کر لئے ہیں۔ اور نہایت آزادانہ طور پر تسلیم کئے ہیں"۔ لیکن یہ باتیں دشمنانِ اسلام کے دماغی توازن کو قائم رکھنے کا سبب نہیں ہوئیں۔ کیونکہ یہ جو کچھ آنحضرتؐ کے متعلق تسلیم کیا گیا۔ وہ بڑی بڑی لائبریریوں میں بند پڑا رہا۔ اور معدودے چند لکھے پڑھے اشخاص ہی اس سے مستفید ہوئے۔ ہمارے مذہب کے متعلق مغرب کی یہ تازہ بیداری ہے۔ جس نے دشمن کے کیمپ میں ایک آگ لگا دی۔ آنحضرتؐ کی وہ تصویر جو اسلامک ریویو نے پیش کی ہے۔ وہ بلاشبہ ہمارے دشمنوں کی نگاہ میں بے عیب و بے مثل ہے۔ اور ان کے دلوں میں کھُب گئی ہے۔ اسی لئے وہ یہ اعلان کر رہے ہیں۔ کہ ووکنگ میں محمدؐ کو بنی نوعِ انسان کے لئے اُسوۂ حسنہ بنانے کی کوشش ہو رہی ہے اور اس غرض کو پورا کرنے کے لئے آپؐ کی مسیحی رنگوں سے ایک نئی تصویر تیار کی جا رہی ہے"۔

آنحضرتؐ کے سوال سے قطع نظر میں تو اس بات پر حیران ہوں کہ نسل انسانی کیلئے کسی اخلاقی رہنما کی تصویر مسیحی رنگوں سے کیونکر بنائی جا سکتی ہے؟ جن معنی میں یہ لوگ موقعہ بموقعہ بعض چیزوں پر اس لفظ "مسیحی" کا اطلاق کر دیا کرتے ہیں۔ وہ میرے لئے ماوراء الفہم ہیں۔ اس لفظ کے استعمال میں کچھ ایسی لچک پیدا ہو گئی ہے کہ اس کے معنی سب کچھ بھی ہیں۔ اور کچھ بھی نہیں خلاصہ یہ ہے کہ جو چیز کسی پادری کو کسی وقت پسند آ گئی۔ تو وہ فوراً کہہ دیا کرتا ہے کہ یہ مسیحی چیز ہے۔ خواہ اس چیز کا نام تک اس کے صحیفوں میں نہ ہو مثلاً صنفِ لطیف کو لے لیجئے۔ مغرب میں ایک وقت عورت کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ اس وقت یہی

پست حالی فخریہ طور پر شعار مسیحیت سمجھی جاتی تھی۔ اگر آج یورومین سوسائٹی میں عورت کا اقتدار بڑھ گیا ہے۔ تو یہ اقتدار بھی مسیحی تعلیم کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ حالانکہ خود مسیح کے زمانہ میں عورت کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ ان کے ہمقوم اسرائیلی عیش پسندی اور حظ نفسانی کے غلام تھے۔ عورت ان کے گھروں میں دوسرے سامان کی طرح ایک زینت کی چیز تھی۔ جسے جب چاہا علیحدہ کر دیا۔ یا کسی دوسرے گھر والے سے تبادلہ کر لیا۔ اور جناب مسیح نے بھی اس صنف نازک پر توجہ نہ فرمائی۔ ان کی اصلاح حالت میں ایک لفظ بھی ان کی زبان سے نہ نکلا گویا بیچاری عورت ان کے نزدیک قابل توجہ ہی نہ سمجھی گئی۔ آپ کے بعد سینٹ پال تشریف لائے۔ عورت کے متعلق جو بدزبانی اور درشت کلامی ان کی تحریروں میں پائی جاتی ہے۔ اُس سے دنیائے عیسائیت ناواقف نہیں۔ سینٹ پال کے بعد چند ابتدائی صدیوں میں جو قسیس یا راہب یا بڑے پایہ کا معلّم عیسائیت پیدا ہوا۔ وہ طبقہ نسوان پر سخت گیری کرنے میں اپنے متقدمین سے چند قدم آگے ہی رہا۔ کلیسیا کی یہ بدگوئی جاری رہی۔ حروب صلیبی میں اہل یورپ کو اسلامی اخلاق کے مطالعہ کا موقعہ ملا۔ وہیں سے عورت کی عزت کا خیال یورپ میں آیا۔ اس زمانہ میں بعض خارجی اسباب سے متاثر ہو کر مغربی خواتین خود اپنی حیثیت اور عزت قائم کرنے میں جد و جہد کرنے لگیں۔ تو عیسائیت بھی ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مسیحی ادبیات میں فرقۂ نسوان کی بھلائی کا ایک لفظ بھی نہیں۔ اس سے میری مُراد وہ باتیں ہیں۔ جو ہم ہمیشہ سے ارباب کلیسیا کی زبان سے سنتے ہیں۔

بیسویں صدی کا مسیحی نقطۂ نظر قدیمی عیسائیت سے بالکل جُدا گانہ ہے گل ہوف نے اپنی کتاب بعثت مسیحیت میں کیا سچی بات کہی ہے۔ "کہ جن باتوں کا نام آج مسیحیت رکھا جاتا ہے۔ انہیں اوائل مسیحیت کے معلّم حمق اور جہالت سے تعبیر کرتے تھے۔"

مسیحی تعلیم تو ان باتوں کا نام ہونا چاہیے۔ جو مسیح نے کہیں یا جو اُن کی تعلیم مندرجہ انجیل سے اخذ ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا جو بات انہوں نے کبھی تعلیم نہ کی ہو۔ اور ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ انہوں نے صنفِ لطیف کی بھلائی میں ایک لفظ تک نہیں کہا۔ تو اس موضوع پر جو کچھ آج کل کے پادری کہتے ہیں اسے مسیحیت سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟

میں یہ اُوپر کہہ چکا ہوں۔ کہ جو چیز بھی کسی زمانہ میں اچھی سمجھی جائے۔ پادری صاحبان اُسے مسیحیت

کی طرف منسوب کر دیا کرتے ہیں۔ چنانچہ صنف لطیف کے متعلق جو کچھ جناب مسیح یا ان کے ابتدائی متبعین نے کہا۔ وہ میں اوپر بیان کر آیا ہوں۔ لیکن اس زمانہ کا ایک مشہور مسیحی مصنف ڈین فرار اپنی کتاب حیات مسیح میں لکھتا ہے۔ کہ "عیسائیت نے اگر مردوں کو شرافت نفس عطا کی۔ عورتوں کی عزت کو بڑھایا۔ اور بچوں کی زندگی کو ہالۂ معصومیت سے مزین کیا" لیکن یہ کب اور کہاں ہوا؟ مسیحیت کی تاریخ میں تو یہ واقعات نظر نہیں آتے۔ رہا ان امور میں موجودہ زاویۂ نگاہ۔ تو اس کے اسباب دوسرے ہیں۔ جس مذہب کی یہ تعلیم ہو۔ کہ ہر ایک انسان پیدائشی گنہگار ہوتا ہے۔ بچہ پیدا ہوتے ہی گناہ اپنے ساتھ لاتا ہے۔ وہ کس معنی میں بچوں کو نور معصومیت سے منور کرنے کا مدعی ہو سکتا ہے۔ ان عقلمند مصنفوں کو کم از کم تاریخ کا تو احترام کرنا چاہیئے انکا جو دل چاہے کہیں۔ لیکن یہ تو سوچ لیا کریں۔ کہ کلیسیا کے تعلیم کردہ عقائد سے کیا مستنبط ہو سکتا ہے۔ جس مذہب نے گناہ کو ایک ورثہ قرار دیا ہو۔ اور جس کے عقائد میں مسیح کی ولادت کے سوا کسی اور کی ولادت معصوم اور بے عیب نہ تسلیم کی جاتی ہو۔ وہ کس منہ سے مرد کو شریف بچے کو معصوم اور عورت کو عفیفہ کہہ سکتا ہے۔ مسیحی مصنفوں میں ایک اور عادت بھی ہے۔ ان عیسائیت کے حامیوں نے بدقسمتی سے اپنے مذہب کی حمایت اسی میں سمجھی ہے کہ دوسروں کو بدنام کریں۔ اور وہ اپنے مذہب کی نورانیت کا دعوے اسی طرح کر سکتے ہیں۔ کہ دوسرے مذاہب کو تاریک ثابت کریں۔ وہ اپنے مذہب کی حفاظت میں دوسرے مذاہب کو ان کی خوبیوں سے معرا کرنے کی فکر میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ مسیح کی الوہیت و معصومیت کا بڑا ثبوت ان کے نزدیک یہی ہے۔ کہ وہ دنیا کے معصوموں کو گنہگار چور اور دغاباز کہیں ان کا کسی فرضی واقعہ کے ثابت کرنے کا یہ طریق بھی عجیب ہے۔ کیونکہ یہ تو وہ جانتے ہیں۔ کہ تاریخ ان کے دعوؤں کی تکذیب کرتی ہے۔ کسی بات کا ثبوت ان کے نزدیک اس بات کو بار بار دہرانے میں ہوتا ہے۔ اپنی تردید پر تو کان بند کر لئے جائیں۔ اور اپنی ہی بات کی تکرار کی جائے۔ ان مصنفین نے ایک اور طریقہ اختیار کر رکھا ہے۔ وہ عوام الناس کی سطحیت خیال کو خوب جانتے ہیں۔ اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سب سے پہلے ایک مصنف کسی غیر مذہب یا دوسری تہذیب پر حملہ کی نیت سے ایک معمولی سا اشارہ کر جاتا ہے۔ یا بہ انداز قیاس کوئی بات کہہ جاتا ہے۔ دوسرا اس قیاس کے متعلق واقعیت کا امکان ظاہر کرتا ہے۔ تیسرا اس امکان پر نظریہ قائم کرتا ہے۔ چوتھے صاحب آ کر اسی نظریہ کو ایک مسلمہ واقعہ

کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ اسلام کے خلاف جو کچھ اُن پادری صاحبان نے لکھا ہے۔
اُس کی یہی تاریخ ہے۔ ان کی دلی تمنا اس طرح چند ہیئتوں کی تبدیلی کے بعد انکے نزدیک ایک واقعہ
مثبتہ ہو جاتی ہے۔ خصوصاً جب دوسرے مذہب یا تہذیب پر حملہ کرنا مقصود ہو۔ پروفیسر مارگولیتھ اس
فن میں خاصی مہارت رکھتے ہیں۔ ان کی تحریرات پڑھ کر مجھے ہمیشہ حیرت ہوتی ہے۔ اور میں آج تک اس
بات کا فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ ایسی باتیں عدم واقفیت کی بناء پر سپرد قلم کرتے ہیں۔ یا دیدہ و دانستہ لوگوں
کو غلط فہمی میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً بعض اوقات وہ سیدھے سادھے لفظ "قریشی" کو لفظ "قریشیہ"
لکھتے ہیں۔ یہ تغیر سہواً بھی ممکن ہے۔ اس کی وجہ سے چونکہ واقعہ زیر بحث کی نوعیت بدل جاتی ہے
اس لئے ہمیں شک ہوتا ہے۔ کہ یہ تغیر سہواً نہیں کیا گیا۔ بلکہ واقعہ کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی کوشش کی
گئی ہے۔ وقت آ گیا ہے۔ کہ مسلمان اہل قلم، پروفیسر موصوف کی قلعی دنیا کے سامنے کھول کر رکھ دیں۔
لیکن سردست اس انکشاف کو آئندہ فرصت پر ملتوی کیا جاتا ہے۔ اور مخالفین اسلام کے عام طرز
عمل بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ چند ماہ گزرے ڈاکٹر منگانا نے بڑے طمطراق کے ساتھ اخباروں میں یہ
خبر شائع کرائی تھی، کہ میں نے بصد تلاش قرآن کا ایک ایسا شامی نسخہ حاصل کیا ہے۔ جس میں بعض آیات
مندرجہ قرآن مروجہ نہیں پائی جاتیں۔ پس قرآن کا یہ دعوے کہ اس کا متن تحریف و تغیر سے پاک ہے
معرض شک میں پڑ جاتا ہے۔ چونکہ ڈاکٹر منگانا کو اس کوشش میں سخت ناکامی ہوئی۔ لہٰذا اب وہ اس
کے متعلق کوئی بھی رائے دینے میں از حد تامل کرتے ہیں۔ مجھے ان کے طرز عمل پر کچھ لکھنا منظور نہیں۔ میں
یہاں ان معاندان اسلام کی اُس دیرینہ عادت کو دکھلانا چاہتا ہوں جسکے ماتحت وہ رائی کو پہاڑ بنانے
کے شرمناک گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اور میں نے ان لوگوں کا نام اس لئے پیش کیا ہے۔ کہ یہ بزرگ آسمانِ
عنادِ اسلام کے درخشندہ ستارے ہیں۔ ان لوگوں کا طرز عمل یہ ہوتا ہے۔ کہ ان میں سے ایک شخص اسلام
کے خلاف کسی مسئلہ پر اپنی ذاتی رائے پیش کرتا ہے۔ اور اپنی جماعت کے محتاط لوگوں کے دلوں میں اعتبار
قائم کرنے کے لئے الفاظ بہت جچے تلے استعمال کرتا ہے۔ لیکن اسے یہ یقین ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ اس
بُنیاد پر عمارت قائم کر دیں گے۔ اور کوئی ایسی بات وضع کر کے پیش کریں گے۔ جس کی بناء پر میری پیش
کردہ ابتدائی تجویز جو دراصل کسی نیک نیتی پر مبنی نہیں ہوتی عملی صورت اختیار کر لیگی۔ یعنی میرے مشورہ

یا رائے کو لوگ "واقعہ" سمجھنے لگیں گے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر منگانا ہی کے طرز عمل کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ وہ بذات خود اب اس شامی نسخہ کی قدامت پر کوئی یقین نہیں رکھتا۔ چنانچہ اس کے الفاظ یہ ہیں۔ اس شامی ترجمۂ قرآن کی قدامت کے متعلق جو کچھ اظہار خیال ہم نے کیا ہے۔ اس کی نزاکت کا احساس ہم سے زیادہ کسی کو نہیں ہو سکتا۔ اور ہم امید کرتے ہیں۔ کہ جس حزم و احتیاط کے ساتھ ہم نے اب اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ اس کی بنا پر ہمیں یقین ہے کہ شامی زبان کی ایک مثل کے مطابق، عربی اور شامی زبانوں کے علماء کو خواہ وہ عیسائی ہوں یا مسلمان ہم پر جلد بازی یا عدم احتیاط کے الزام لگانے کا موقعہ نہ ملیگا۔ ہمارے سامنے شامی زبان کا ایک ایسا نسخہ (یعنی ترجمہ قرآن) موجود ہے۔ جس کی نوعیت اور ذاتی خصوصیات صاف طور پر نمایاں نہیں۔ ہم نے اس بات پر یقین کرنے کے زبردست دلائل پیش کر دیئے ہیں۔ کہ یہ نسخہ "بار سالیبی" سے ماخوذ نہیں ہے۔ لیکن اس کی تاریخ کتابت کے متعلق وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے۔"

ڈاکٹر منگانا نے تو الفاظ بالا لکھ کر اپنی ساری کوشش پر پانی پھیر دیا۔ اور یہ لکھ دیا ہے۔ کہ ان کا پیش کردہ شامی ترجمہ قرآن قابل اعتبار نہیں۔ لیکن پروفیسر مارگولیتھ اسی بے اعتبار شدہ نسخہ قرآن کے متعلق رسالہ مسلم ورلڈ جلد ۱۵ء صفحہ ۳۴ پر حال میں لکھتے ہیں:

اس سال کی جنوری تک قرآن کی تنقید کے سلسلہ میں کوئی قدیم نسخہ دستیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن ڈاکٹر منگانا کو حال میں ایک سریانی نسخۂ قرآن جو بہت پرانے زمانہ کا لکھا ہوا ہے۔ دستیاب ہوا ہے جس کا ذکر مفصل طور پر جان رائلینڈس لائبریری کے میگزین میں ہو چکا ہے۔ اس لحاظ سے اولیت کا سہرا ڈاکٹر موصوف کے سر ہے۔ انھوں نے اپنی تصنیف "تین قدیم قرآنی نسخوں کے اوراق" میں بھی قدیم نسخوں میں زبردست عبارتی اختلافات دکھلائے ہیں۔"

خدا جانے پروفیسر مارگولیتھ، اسلام کے خلاف لکھتے وقت شرافت نفس کا کونسا معیار پیش نظر رکھتے ہیں؛ جس بات کی قدامت خود اس کے محقق کی نظر میں مشتبہ ہے۔ وہی بات صرف ایک سال کے بعد پروفیسر موصوف کے نزدیک نہایت قدیم قرار پا جاتی ہے۔ ان کے اقتباس کی آخری سطر سے، ساری حقیقت آشکارا ہو سکتی ہے۔ مذکورہ بالا "اوراق" سے جو پروپیگنڈہ اسلام کے خلاف شروع کیا گیا تھا۔

وہ جیسا کہ سب کو معلوم ہے ناکام رہا۔ لیکن اب اس ناکام کوشش کا ذکر، غیر مبہم طرز اور قطعی یقین کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اور میرا خیال ہے۔ کہ تیسرا مصنف پروفیسر موصوف کے الفاظ "قرآن کے قدیم نسخوں میں زبردست اختلافات" کو بطور عنوان استعمال کریگا۔ یعنی رفتہ رفتہ اس خیال کو واقعیت کا جامہ پہنا دیا جائے گا۔ اور مسیحی مصنفین بغلیں بجانے لگیں گے۔ کہ قرآن بھی بائبل کی طرح محرف اور مُبدّل ہے۔ یہ ہے۔ وہ طرز عمل جس کی مدد سے یہ لوگ جہلا اور ناواقف لوگوں میں اپنا وقار قائم کرتے ہیں۔ کیا اچھا ہو کہ پروفیسر موصوف، قبل اس کے ان پر مزید اعتراضات وارد کیے جائیں، اپنے مفتریانہ طریق عمل پر اولین فرصت کے لمحات میں غور کریں۔ کیا انہیں اس امر کا احساس نہیں ہے۔ کہ وہ اپنی غیر ذمہ دارانہ تحریروں سے دوسروں کو تذلیل وافتراء کی ترغیب دے رہے ہیں؟ گمراہ کن اور سراسر غلط باتیں اگر ایسی بیباکی کے ساتھ ان کے قلم سے نکلیں گی تو خواہ مخواہ دوسرے معاندان اسلام، اُن کو لے اڑیں گے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا مفتریانہ جسارت ہو سکتی ہے۔ کہ ڈاکٹر منگانا تو خود قدامت شامی ترجمۂ قرآن کے متعلق مذبذب ہے۔ اور یقینی طور پر اسے "قدیم" نہیں کہتا۔ لیکن پروفیسر صاحب نہایت ڈھٹائی کے ساتھ لکھتے ہیں "نہایت قدیم زمانہ کا نسخہ"۔ ممکن ہے ڈاکٹر منگانا کی تحریر، لوگوں سے محو ہو جائے۔ مگر یہ تو یقینی ہے کہ آیندہ لوگ پروفیسر موصوف کے قول کو بطور سند پیش کیا کریں گے۔ غرضکہ اپنی طرف سے انھوں نے دجل اور فریب کے دروازہ کو کھول دینے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے۔ کیا پروفیسر مارگولیتھ جیسی شخصیت کے لئے یہ بات شایان شان ہے؟ ایک عیسائی مبلغ کو یہ بات فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ صرف لینت و نرمی اور چند نسوانی خصائص کا نام اخلاق نہیں ہے۔ انسانی اخلاق کے ایسے شعبے بھی ہیں۔ جن کا انجیل میں نام بھی نہیں ہے۔ لیکن اس کے متعلق مجھے اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اس سے کوئی مفید نتیجہ پیدا نہ ہوگا۔ بلکہ کسی کی ذات پر نکتہ چینی گو کیسی ہی منصفانہ اور جائز کیوں نہ ہو۔ نفسانیت اور منافرت کی ترقی کا سبب ہوتی ہے۔ اور دو قسم کی تعلیموں کا تقابل ہمیشہ رنجش کا باعث ہوتا ہے۔

ان امور کو پیش نظر رکھ کر میں ان صفحات میں آنحضرت صلعم کے اخلاق و عادات کا ایک خاکہ تیار کرنا چاہتا ہوں۔ میں اپنے بیانات کے ثبوت میں وہ عملی نمونہ پیش کروں گا جس کی کئی معتبر روائتیں شہادت دیتی ہیں۔ ہم بائبل بھی دیکھیں گے۔ اگرچہ یہ ناقابل اعتبار تسلیم کر لی گئی ہے۔ تاہم جو کچھ اس میں جناب مسیح کے

متعلق بیان کیا گیا ہے۔ میں اُسے صحیح تسلیم کروں گا۔ پھر یہ فیصلہ کرنا۔ ناقدین کا کام ہوگا۔ کہ آنحضرتؐ کی جو تصویر میں نے کھینچی ہے۔ آیا وہ اس ذخیرہ سے لی گئی ہے۔ جو بائیبل میں جناب مسیحؑ کے متعلق جمع کیا گیا ہے۔ یا کوئی اور ماخذ ہے۔ میں انہیں یقین دلاتا ہوں۔ کہ ان صفحات میں آنحضرتؐ کے متعلق اس کے عشر عشیر کا بھی ایک شائبہ بائیبل کے صفحات پر نظر نہ آئے گا۔

اس موضوع پر لکھنے والا میں پہلا نہیں ہوں۔ تمام گذشتہ زمانوں میں عربی ایرانی اور ہندوستانی عالم اور اولیاء اللہ دلی فخر و عقیدت کے ساتھ آنحضرتؐ کی برکات کا تذکرہ کرتے رہے۔ (بہت سے یورپیوں کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر میں جرمنی کے ڈاکٹر گستاوویل اور مسٹر لوُل کا نام لیتا ہوں۔ مسٹر کیش ان مصنفین کے بیانات خود پڑھیں۔ اور دیکھیں۔ کہ ان بزرگوں کے قلم کی کھینچی ہوئی تصویر بھی کیا مسیحی رنگوں سے تیار کی گئی ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ منہ سے کوئی بات نکالنے سے پہلے وہ سوچ لے کہ وہ کیا کہنے لگا ہے۔

مسٹر لوُل لکھتے ہیں۔ "اُس ہستی میں کچھ ایسی علیمانہ نسائیت اور اس کے ساتھ ہی کچھ ایسے مردانہ خصائل بھی موجود ہیں۔ کہ انسان کے دل میں نادانستہ طور پر آپ کے متعلق کچھ ایسی عزّت و محبت کے احساسات جوش زن ہو جاتے ہیں۔ کہ ان سے وہ کسی فیصلہ پر آنے کے قابل نہیں رہتا۔ وہ شخص سالہا سال تک اپنی قوم کی نفرت کی آماجگاہ رہا۔ باوجود اس کے اس نے کبھی ہاتھ ملانے والے سے پہلے اپنا ہاتھ نہیں کھینچا۔ بچوں کا محبوب جس نے چھوٹے بچوں کے کسی غول کو اپنی دلفریب آنکھوں کی مسکراہٹ کے بغیر اپنے پاس سے نہیں گزرنے دیا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا۔ کہ بچوں کے متعلق کوئی مشفقانہ بات اس کی زبان سے نہ نکلی ہو۔ اس شخص کی بے ریا دوستی شاندار فیاضی ناقابل تزلزل بہادری اور بلند بالا اُمید مخالفین کی نکتہ چینیوں کو مدح و ستائش میں تبدیل کر رہی ہے"۔ میں نے ان کی کتابوں سے ترجمہ کر دیا ہے ان میں ایک امام غزالی ہیں۔ جن کی قابلیت فضیلتِ علمی کا اعتراف یوروپین مصنّفین کو بھی ہے۔ آپ کی تصنیفات جن میں آنحضرتؐ کے اخلاق و اعمال کا ذکر ہے۔ صحیح بخاری صحیح مسلم و صحاح ستّہ کی دوسری کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ اور یہ وہ کتابیں ہیں۔ جن کی صحت پر آج تک نکتہ چینی نہیں کی گئی ہے۔"

آنحضرتؐ کی زندگی یا سیرت پر ابتداہی سے بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں سے بعض کتابیں مغازی کہلاتی ہیں۔ ان کتابوں کے واقعات درایت و تنقید کے بعد قابل تسلیم ہو سکتے ہیں مشہور محدث حافظ زین الدین عراقی نے اپنی کتاب الفیۃ فی السیّر میں کیا معقول بات لکھی ہے۔ آپ فرماتے ہیں "کتب سیرت میں ہر قسم کے واقعات ہیں۔ معتبر بھی اور غیر معتبر بھی۔ ایک طالب حق کو بہت محتاط رہنا چاہیئے۔ یہ کتابیں تحقیق و تدقیق سے نہیں لکھی گئیں۔ ان کے مصنف آنحضرتؐ کے بعد پیدا ہوئے انہوں نے بہت سی سنی سنائی باتیں جمع کر دیں۔ اس کے برخلاف کتب حدیث کی دوسری ہی شان ہے۔ ان میں کم از کم اُن تیرہ ہزار بزرگوں کی روائتیں ہیں۔ جنہوں نے آنحضرتؐ کی زیارت اور آپؐ سے شرف ہمکلامی حاصل کیا۔ اُن ہی کی روائتیں ہم تک پہنچی ہیں۔ کسی راوی کی صحت روایت پرکھنے کے لئے ہمارے بزرگوں نے اسماء الرجال کی کتابیں لکھیں۔ ان میں راویانِ حدیث کی زندگی اور ان کے اخلاق پر بحث کی گئی ہے۔ جس سے ہم اس قابل ہو جاتے ہیں کہ کس راوی کو معتبر سمجھیں اور کسے غیر معتبر۔ محدثین علیہم الرحمۃ ہماری بیحد شکر گزاری کے مستحق ہیں۔ کئی ہزار محدثین گزرے ہیں انہوں نے تمام زندگی اس شاخ کے لئے وقف کر دی تھی۔ یہ لوگ ان شخصوں سے ملنے کے لئے ہزاروں میل کا سفر طے کرتے تھے۔ جن سے واقعات نبوّی معلوم ہو سکتے تھے۔ وہ اپنے طور پر روایاتِ حدیث کے حالات بھی دریافت کرتے تھے۔ اُن کے اخلاق اُن کی معاشرت کے متعلق صحیح علم حاصل کرنے کے علاوہ یہ بات خاص طور سے پوچھتے تھے۔ کہ ان کا حافظہ کیسا تھا۔ اور اگر کسی ایک بات میں بھی ان کی تحقیق تشفی بخش نہ ہوتی۔ تو وہ اُس راوی کی صحت پر اعتبار نہ کرتے تھے" اس طرح کی چھان بین کے ساتھ حدیث کی کتب صحاح ستہ تیار ہوئیں۔ اور یہی چھ کتابیں آئندہ کتابوں کی اساس قرار پائیں۔ کتب مغازی کی طرف مسلمان صلحاء یا محدثین نے کبھی التفات نہیں کیا۔ نہ انہیں قابل اعتبار سمجھا۔ ان کتابوں میں سے واقدی کی تصانیف خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس نے جو کچھ لکھا۔ نہایت بے احتیاطی اور رطب و یابس سے لکھا۔ ابن خلکان واقدی کی نسبت کہتا ہے کہ اس کی روائتیں نہایت ہی ضعیف ہیں۔ اور اہل الرائے کے نزدیک تو واقدی کی صداقت بھی مشتبہ ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں۔ کہ واقدی کی سب کتابیں جھوٹ کا انبار ہیں۔ دوسرے محدثین

کی بھی یہی رائے ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ کہ اُن یوروپین مصنفین کا معتمد علیہ واقدی ہی قرار پاتا۔ جنہوں نے اسلام کو محض بدنام کرنے کے لئے قلم اٹھایا ہے۔ واقدی جیسے فسانہ نگاروں کے ہاں ایسا مواد موجود ہے۔ جسکو مسخ کرکے یہ مصنف اسلام اور اس کے معصوم بانی پر نکتہ چینی کر سکتے ہیں۔ گزشتہ اگست میں اخبار مانچیسٹر گارڈین نے اپنے ایک مقالہ میں آنحضرت ﷺ کے متعلق کچھ مزیّن شان الفاظ لکھے۔ اور اپنی تائید میں پروفیسر مارگولیتھ کا حوالہ دیا۔ میں نے پروفیسر مذکور سے سند چاہی۔ جیسا میرا خیال تھا۔ اس نے واقدی ہی کا حوالہ دیا۔ میں نے اسے فوراً اطلاع دی۔ کہ اس نے راوی کے انتخاب کرنے میں غلطی کی ہے۔ وہ آئندہ احتیاط کرے۔ اور اپنی غلطیوں کی اصلاح کرے۔ کیونکہ اس کا معتمد علیہ ایک مشہور کاذب ہے۔ بقول 'اسلامک ریویو' وہ زمانے ختم ہوگئے۔ جب یہ لوگ دنیا کے ایک گوشہ میں بیٹھ کر جو چاہتے کر گزرتے۔ اور کوئی پوچھنے والا نہ ہوتا آج کل کی سب دنیا ہمہ تن گوش ہے۔" اور ان نیک معاشوں کے جواب دینے والے موجود ہیں۔ ہم نے مانچیسٹر گارڈین کا معاملہ یہیں تک ختم کرنے پر اکتفا نہیں کی۔ بلکہ میری فرمائش پر سیّد سلیمان صاحب ندوی نے مانچیسٹر گارڈین کے واقعہ پر جو اس نے لکھا تھا مبسوط بحث کی۔ اس مقالہ میں واقدی کی مورخانہ حیثیت پر بھی کامل تنقید کی گئی۔ اور سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ واقدی نے تو جو لکھا تھا وہ لکھا تھا۔ اس خاص فطرت کے پروفیسر مارگولیتھ نے واقدی کی عبارت کا ترجمہ بھی غلط کیا۔ اسلامک ریویو نے اپنے ایڈیٹوریل نوٹ میں اس پروفیسر کی علمیت کا پردہ چاک کیا۔ اس سے کہا گیا۔ کہ یا تو اس نے بالقصد ترجمہ غلط کیا۔ جس سے اس کی نیت کا اندازہ ہم کر سکتے ہیں۔ اور اگر اُس نے واقدی کا ترجمہ اپنی دانست میں درست کیا ہے تو وہ اس قابل نہیں۔ کہ آکسفورڈ جیسی یونیورسٹی کی کرسئ عربیت کو زینت دے۔ اس تحریر کو ایک سال گزر گیا۔ اب یہ بحث ایک دوسرے رنگ میں چھیڑی گئی ہے۔ غالباً مارگولیتھ کے اشارہ سے ڈرہم یونیورسٹی کے پروفیسر عربی گوئیم نامی نے واقدی کا حوالہ دے کر ان وجوہ کو ہم سے دریافت کیا ہے۔ جن کی بناء پر ہم اس کو ناقابلِ اعتبار مورخ سمجھتے ہیں۔ اس کا جواب بھی سید صاحب موصوف نے دیدیا ہے۔ جو اسلامک ریویو میں شائع ہوگا۔ پروفیسر گوئیم نے تو نہایت ہوشیاری سے مارگولیتھ کو درمیان سے نکال دیا ہے۔ لیکن وہ ہم سے بچ کر کہاں جا سکتا ہے۔ خدا خدا کر کے ہم کو یہ موقع ملا ہے۔ کہ دنیائے مغرب کو یہ دکھلا دیں۔ کہ اسلام کے خلاف ان کا معتمد علیہ یا تو متعصّب ہے۔ یا عربیت سے ناواقف

اس مقدمہ کے اختتام سے پہلے میرا فرض ہے کہ میں چند احباب کا شکریہ ادا کروں۔ مثلاً مولانا عبدالمجید ایم۔اے۔ اور خان عبدالخالق خاں بی۔اے وایم۔آر۔اے۔ایس (لنڈن) بوہرہ مسلم مشنری۔ یہ دونوں بزرگ مشن کی کامیابی میں میرے دست و بازو ہیں۔ خصوصًا اس کتاب کی تیاری میں جس قدر احادیث کے ترجمے کی ضرورت مجھے پڑی۔ وہ انہوں نے ہی کیا (انگریزی) کتاب کے پروف بھی انہوں نے ہی پڑھے۔ خدا تعالےٰ انہیں جزائے خیر دے:۔

مجھے اس موقعہ پر عُلیا حضرت سرکار عالیہ بھوپال کا شکریہ ادا کرنا لازم ہے۔ میں اور میرا مشن ہمیشہ سے آپ کا مرہونِ احسان ہے۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں اپنے خاص الخاص افضال کا مورد بنائے۔ اس کتاب نے جو آج انگریزی سے اردو کا لباس پہنا ہے۔ تو اس کی محرک بھی عُلیا حضرت کی ذات والا صفات اور ان کی امداد ہے:۔

خواجہ کمال الدین

(مسجد ووکنگ۔ ار دسمبر ۱۹۲۵ء)

حُلیۂ مُبارک

کسی فرضی عکسی تصویر کی بجائے میں مناسب سمجھتا ہوں۔ کہ آنحضرتؐ کا حلیۂ مبارک بخاری شریف سے نقل کر دوں۔ یہ کتاب آنحضرتؐ کی احادیث کا مستند ترین مجموعہ ہے۔
آپ کا قد نہ تو لانبا تھا نہ چھوٹا بلکہ اوسط درجہ کا۔ جب آپؐ تنہا چلتے تھے تو لوگ آپکو قد القامت کہتے تھے۔ لیکن جب آپؐ کی معیت میں کوئی شخص ہوتا تو آپؐ اُس سے لانبے معلوم ہوتے تھے۔ آپؐ کا رنگ سفید تھا۔ لیکن نہ سانولا نہ بہت ہی سفید۔ بلکہ ایسا سفید جس میں کسی رنگ مثلاً زرد سُرخ وغیرہ کی آمیزش نہ ہو بعضوں نے آپ کا رنگ مائل بسرخی لکھا ہے۔ اور روایت مذکورہ بالا سے مطابقت یُوں کی ہے۔ کہ جو حصّہ جسم مثلاً چہرہ ہاتھ پاؤں گردن کان وغیرہ کھلے رہتے تھے۔ وہ مائل بہ سرخی تھے۔ اندر کا جسم نہایت گورا تھا۔ آپؐ کے بال گھونگر والے تھے۔ لیکن نہ قطعاً آویزاں تھے نہ زیادہ گھنے۔ جب آپؐ شانہ فرماتے تھے۔ تو اُن میں خفیف لہر نمایاں ہو جاتی تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ آپؐ کے بال کندھوں پر پڑے رہتے تھے۔ اکثر روایات یہ ہیں۔ کہ کان کی لو تک آتے تھے۔ کبھی کبھی آپؐ بیچ کی مانگ نکال لیتے تھے۔ اور آدھے بال اِس کان کے پیچھے اور آدھے اُس کان کے پیچھے ڈال لیتے تھے۔ کبھی کبھی آپؐ کانوں کے پیچھے بھی شانہ فرما لیتے تھے۔ جس کی وجہ سے آپؐ کی گردن کا وہ حصّہ بھی نمایاں ہو جاتا تھا۔ جو بالوں سے پوشیدہ رہتا تھا۔ آپؐ کے سر اور بالوں میں صرف سترہ سفید بال تھے۔ اس سے زیادہ نہیں دیکھے گئے۔ آپؐ کا چہرہ نسبتاً بمقابلہ دوسرے لوگوں کے زیادہ دلکش تھا۔ جس شخص نے آپؐ کے چہرہ کا ذکر کیا ہے۔ اس نے ہمیشہ چودھویں رات کے چاند سے تشبیہ دی ہے۔ چونکہ آپؐ کا رنگ نہایت شفاف تھا۔ اس لئے غصّہ اور سرور دونوں کا اثر فوراً نمایاں ہو جاتا تھا۔ اکثر لوگوں نے آپؐ کے رفیق اور دوست حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اس قول کی تصدیق و تائید کی ہے۔ جس کا مطلب یُوں ادا ہو سکتا ہے۔ ''جس طرح چاندنی رات میں تاریکی کا شائبہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہمارا مصطفٰےؐ ہے جو ہمارا خیر خواہ ہے۔ اور نورانی صورت والا ہے''۔

آپؐ کی پیشانی فراخ تھی بھویں باریک مگر بھری ہوئی تھیں۔ دونوں بھوؤں کے درمیانی حصہ میں غضب کی چمک پائی جاتی تھی۔ آپؐ کی آنکھیں بڑی بڑی کشادہ سیاہ جس میں خفیف سی جھلک سرخی کی تھی۔ اور خوش رنگ تھیں۔ آپؐ کے پلک لانبے اور بہت ہی گھنے تھے۔ گویا اب آپس میں ملے۔ آپؐ کی ناک سُتواں اور لانبی تھی۔ دانت کسی قدر کھلے کھلے تھے۔ جب آپؐ ہنستے تھے۔ تو اُن کی چمک بجلی کو مات کرتی تھی۔ آپؐ کے ہونٹ خوبصورت اور دلکش تھے۔ آپؐ کے رخسار چنیچ نہ تھے نہ گداز اور بھاری آپؐ کا چہرہ نہ کتابی تھا نہ بالکل ہی گول بلکہ قدرے گولائی کی طرف مائل تھا۔ آپؐ کی داڑھی گھنی تھی۔ جسے آپؐ کترواتے نہ تھے۔ ہاں مونچھیں ضرور کترواتے تھے۔ آپؐ کی گردن دوسرے لوگوں کی گردنوں سے زیادہ حسین تھی۔ نہ لانبی نہ چھوٹی۔ جو حصہ دُھوپ اور ہوا کیلئے کھلا رہتا گویا چاندی میں سونے کے ذرات ملا دیئے ہیں۔ آپؐ کا سینہ علوم کا گنجینہ تھا اور بے کینہ تھا۔ نہایت فراخ تھا۔ کسی حصہ کا گوشت دوسرے حصوں کے گوشت سے زیادہ نمایاں نہ تھا۔ بلکہ ہموار شفاف اور چکنا تھا۔ گلے سے لے کر ناف تک بالوں کی ایک ہلکی سی تحریر چلی گئی تھی۔ اس کے علاوہ اور بال نہ تھے۔ آپؐ کے کندھے چوڑے چکلے تھے۔ ان پر بال بکثرت تھے۔ آپؐ کے کندھے ٹخنے اور بغلیں پُر گوشت تھیں۔ آپؐ کی پیٹھ چوڑی تھی۔ اور دائیں جانب ایک مہر کا سا نشان تھا۔ اس میں ایک سیاہ مسّہ تھا۔ جس پر چاروں طرف گھنے اور سخت بال اُگے ہوئے تھے۔ آپؐ کے بازو پُر گوشت تھے۔ کلائی لانبی ہتھیلی چوڑی ہاتھ پاؤں چوڑے اور کشادہ تھے۔ آپؐ کی انگلیاں ایسی تھیں۔ جیسے چاندی کی پتریں۔ آپ کی ہتھیلی مخمل کی طرح ملائم تھی۔ اور خوشبودار تھی۔ جیسے کسی عطّار کی۔ آپؐ کی ران اور پنڈلی پُر گوشت تھی۔ آپؐ کا جسم اعتدال کے ساتھ مضبوط تھا۔ اور بڑھاپے میں بھی آپؐ کے عضلات ایسے ہی مضبوط تھے۔ جیسے کسی نوجوان کے۔ آپؐ کی چال ڈھال مردانہ تھی۔ اور قدم مضبوط اور جما ہوا پڑتا تھا۔ چلنے میں آپؐ آگے کی طرف جُھکتے تھے۔ اور قدم چھوٹے چھوٹے رکھتے تھے۔ آپؐ فرماتے تھے کہ جسمانی لحاظ سے میں حضرت آدمؑ سے مشابہ ہوں۔ اور اخلاقی طور پر ابراہیم علیہ السلام سے۔

باب اوّل

کیا اوتار پیرویٔ انسانی کے لیے کوئی نمونہ بن سکتے ہیں

گزشتہ جنگ عظیم بنی نوع انسان کے لئے سبق آموز ثابت ہوئی ہے۔ کیونکہ اس سلسلہ میں مختلف اقوام کو ایک دوسرے کے ساتھ تبادلۂ خیالات کا موقع ملا۔ جو لوگ اس سے پہلے آبادی کو دو متحارب حصوں میں منقسم کرنے کے عادی تھے۔ ان کو دوسرے مذاہب کی خوبیاں مُطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔ اور مغربی اقوام کا مطمحِ نظر مذہبی کشادہ تر ہو گیا۔ اور وہ خیالات جو عرصے سے تعلیم یافتہ طبقہ کے دماغوں میں جاگزین تھے۔ اب دور و نزدیک شائع ہونے لگے۔ گویا مغربی دماغوں میں اِک نئی قسم کی مذہبی بیداری پیدا ہو گئی۔ اور مذہبی خیالات میں ایک حیرت انگیز انقلاب رونما ہو گیا۔ اس انقلاب کی سرعت رفتار کی وجہ سے صدیوں کا کام چند سالوں میں نکل آیا۔ کلیسائی حالت کا طغرائے امتیاز یہ ہو گیا کہ گرجا جانا لوگوں کی طبائع پر ایک بار ہے" اور مغرب میں مذہبی زندگی کا نقشہ یہ ہو گیا۔ کہ "عبادت گاہیں خالی ہو گئیں گویا ان دو باتوں سے موجودہ مغربی ذہنیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ عوام الناس کا رجحان طبع آج کل یہ ہے۔ کہ مسیحیت کو ایسے عقاید سے پاک کیا جائے تو وہ مقصد پورا ہو سکتا ہے۔ جو موجودہ حالت میں نہیں ہو سکتا۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ یسوع کے سیدھے سادھے مذہب میں تجسّم الوہیت اور دوسرے خلاف عقل عقاید کو اس لئے داخل کیا گیا تھا۔ کہ بت پرستوں میں اس کو ہر دلعزیزی حاصل ہو جائے۔ یہ بیرونی عقاید اگرچہ صدیوں تک مسیحیت کے اجزائے لاینفک رہے۔ لیکن اب انہیں کوئی نہیں پوچھتا۔ جو چیز کل تک حُسن تھی۔ آج عیب ہو گئی کلیسیا اصلاح طلب تھا۔ اور نئی روشنی کے علماء نے اس کام کا بیڑا اٹھالیا ہے۔ لیکن عام طبائع میں ابھی تک کوئی تغیّر رونما نہیں ہوا۔ اگرچہ ان گزشتہ نو سالوں میں وہ عمارت گرا دی گئی۔ جو اٹھارہ صدیوں سے کھڑی ہوئی تھی۔ لیکن عام لوگ ابھی تک اس تغیّر سے متاثر نہیں ہوئے دوسری طرف صلیب بردار خدا اب لوگوں کا نصب العین نہیں رہا ہے۔ کیونکہ مصلوب خدا کی حیثیت اب ایک افسانہ سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ عقیدہ زیادہ سے زیادہ بچوں کو تسلی دے سکتا ہے۔ یا ان لوگوں

کو جو اپنا بوجھ دوسرے لوگوں پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ لیکن سمجھدار طبقہ کے نزدیک "ناراض خدا"[1] کا پولوسی افسانہ اور پھر قربانی سے راضی ہو جانا۔ یہ سب امور اباطیل پاستان سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

قدیم زمانہ میں خدا کے اوتاروں کی کمی نہیں رہی ہے۔ مصلوب اوتار ہی خدا اور انسان کے درمیان عموماً شفیع مانا گیا ہے۔ اگرچہ مختلف زمانوں اور اقوام میں اس کی حیثیت مختلف رہی ہے۔ اہل فارس میں اس کا نام مہتمرا تھا۔ اور اہل بابل میں اسی کو بعل کہتے تھے۔ ملک فرجیا میں اسے اٹس کہتے تھے اور شام میں اسی کو ایڈونس کے نام سے پکارتے تھے۔ یونان والے اسے بکس کہتے تھے۔ مصریوں کے یہاں اس کا نام ہورس تھا۔ قسطنطین[2] کے نزدیک اس کا نام اپولو تھا۔ قسطنطین کی بدولت ہی اپولو کی گدی

---

[1] کفارہ مسیح کی تعلیم دینے کے لیے پولوس نے یہ نظریہ قائم کیا کہ خدا تعالیٰ جناب آدم کے گناہ سے ناراض ہو گیا۔ ابنائے آدم میں گناہ بطور ورثہ آیا۔ اسلیے کل نسل انسانی مورد عتاب الٰہیہ ہوئی۔ مسیح نے اپنے خون سے کفارہ دیا۔ اور ان کی قربانی سے خدا راضی ہو گیا۔

---

[2] قسطنطین چوتھی مسیحی صدی میں قیصر روم تھا۔ سلطنتِ روم تو جمہوریت کی بناء پر ایک حد تک قائم تھی۔ لیکن وہ سخت استبداد پسند تھا۔ اس زمانہ میں عیسائی مذہب روم کے ادنیٰ سے ادنیٰ طبقہ میں رائج ہو چکا تھا۔ اس میں سے اکثر غلام تھے۔ اور باقی بھی غلامانہ ذہنیت رکھتے تھے۔ قسطنطین کے سیاسی اغراض کے آلۂ کار یہی لوگ ہو سکتے تھے۔ ان کی تعداد بھی قسطنطین کے ہم مذہبوں کے مقابل زیادہ تھی۔ جن کا اقتدار قسطنطین کے خلاف کام کرتا تھا۔ لہٰذا اس نے اپنے ملک میں مسیحیت کو رائج کیا۔ اس کے بعد بھی مغرب میں مسیحیت نے رواج پایا۔ لیکن قسطنطین سورج پرست تھا۔ جس کو اس کے زمانہ میں اپولو کے نام سے معبود قرار دیا گیا تھا۔ انقلاب مذہب جو دقتیں دنیا میں پیدا کرتا ہے۔ اس سے وہ ناواقف نہ تھا قسطنطین نے اس مشکل کو آسانی سے حل کر دیا۔ اپولو کی گدی پر تو جناب یسوع کو بٹھا دیا اور باقی جو کچھ روایات۔ رسمیات یا طریق عبادت مذہب اپولو میں رائج تھے۔ وہ سب کے سب ملت مسیحی سے وابستہ کر دیئے۔ کل قدیمی روایات کو تو مٹا دیا۔ اور صرف نام کی تبدیلی کے علاوہ اپنے مذہب کی کُل کی کُل

یسوع کو ملی۔ تاکہ اس وجہ سے اس کو اپنی تحریکات میں کامیابی ہو سکے۔

ان قدیمی فسانوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "خدا کے یہ سب محبوب فرزند" کنواری عورتوں سے ہی ۲۵ دسمبر یا اس کے قریب کسی تاریخ پیدا ہوئے تھے۔ اور ان سب نے اپنے خون سے دنیا والوں پر خدا کا فضل نازل کیا۔

ان سبھوں نے بنی نوع آدم کو گناہ سے نجات دلانے کے لیے موت قبول کی۔ اور ان کی موت عموماً ایسٹر سنڈے سے پہلے جمعہ کو واقع ہوئی۔ یہ سب مدفون ہوئے اور تیسرے روز جی اُٹھے ان سبھوں نے اپنے شاگردوں کی معرفت ہولی کمیونین کی رسم قائم کی ان سب کے

(بقیہ ص ۲۸) باتیں عیسائی مذہب میں داخل کر دیں۔ حتے کہ ہفتہ کی جگہ اتوار کو روز عبادت قرار دیا۔ کیونکہ سورج پرستی کا دن یہی تھا۔ جائے عبادت اور مذبح کی جگہ بھی وہی رکھی۔ بپتسمہ۔ عشاء ربانی وغیرہ یہ سب مذہب اپولو کی رسمیں قائم رکھی گئیں۔ گو بعد میں گرجے کی شکل بدل دی گئی۔ لیکن کیتھولک گرجے اسی اپولو کے پرانے مندر کی یادگار ہیں۔ قسطنطین سے پہلے عیسائی معبدوں میں مذبح کا رُخ کسی خاص سمت میں نہ ہوتا تھا۔ لیکن قسطنطین کے بعد ہر مذبح کا رُخ مشرق کی طرف رکھا گیا۔ کیونکہ سورج کے پرستار ہمیشہ عبادت میں اپنا رُخ مشرق کی طرف رکھتے ہیں۔

ے (یعنی شرکت مقدس) ۔ عیسائی گرجوں میں اتوار کے دن تو علی الخصوص اور بعض دوسرے دنوں میں بھی یہ رسم ادا کی جاتی ہے۔ روٹی اور شراب کو لے کر پادری مقررہ الفاظ میں دعا کرتا ہے۔ جس سے یہ دونوں چیزیں پاک ہو جاتی ہیں۔ یہ روٹی اور شراب حلق سے اُترتے ہی بعقیدۂ کلیسیا جناب یسوع کا گوشت اور خون ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اسی کا نام عشاء ربانی ہے۔ اس کے کھانے کی تاثیر یہ سمجھی گئی ہے کہ جناب مسیح کی فطرت جو معصوم تھی۔ وہ عشاء ربانی میں شرکت سے ایک پرستار مسیح میں آجاتی ہے۔ گویا کھانے کے وقت ایک انسان پچھلے گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ عشاء ربانی کی یہ رسم قبل از مسیح سورج پرست اور قدیمی بُت پرستوں میں رائج تھی۔ چونکہ اس رسم کی تاثیرات ایک قسم کا عقیدہ باطنی ہے کیونکہ اسکا ظاہری نتیجہ

مذاہب میں داخلہ کی شرط عموماً اصطباغ قرار پائی۔ ان سبھوں کی یادگار عموماً "عشاءِ ربانی" کے رنگ میں منائی گئی ہے۔ لیکن آج ہم جانتے ہیں کہ یہ سب باتیں فسانہ سے زیادہ وقیع نہیں ہیں۔ اور دراصل آفتاب پرستی کی رسوم ہیں جو رفتہ رفتہ یسوع کے مذہب میں داخل ہو گئیں۔

ان عقاید کو الہیات کہنا گویا لفظ الٰہیات کا غلط استعمال کرنا ہے۔ پادری طرطولین کی رائے میں یہ رسوم شیطانی باتیں ہیں جسٹن کا بھی یہی خیال ہے۔ نواہ شیطان نے کلیسا کی رسوم

بقیہ

تو کچھ نہیں ہوتا۔ اس لئے ان مذاہب کا نام آج کل کے ادبیات مغربیہ نے مذہب باطنیات (ریلیجن آف مسٹری) یا مذہب سحر رکھا ہے۔ چنانچہ ان اوراق میں بھی جہاں کہیں یہ لفظ آئیں یا لفظ سحر نظر آئے اس سے مراد وہ تبدیلئ سحر ہی ہے۔ جو عشاء ربانی کی شرکت پیدا کر دیتی ہے۔

لہ (پادری جسٹن ابتدائے ایام مسیحیت میں ہوا۔ یہ اپنے وقت کے کلیسا کا ایک ممتاز رکن تھا۔ خدمت کلیسا میں اس نے جان دی۔ اس لئے اسے جسٹن شہید کہتے ہیں۔ جن بدعات کو عیسائی مذہب نے ہر دلعزیز بنانے کیلئے مسیحی کلیسا نے اپنے اندر داخل کر لیا تھا۔ ان کا بہت سا حصہ جسٹن کے وقت سے پہلے ہی شامل مذہب ہو چکا تھا۔ یہ باتیں وہی تھیں جن کو اہل روما قدیم سے مانتے تھے۔ چنانچہ اس وقت کے قیصر روم نے جب جسٹن سے پوچھا کہ جس مذہب کی تبلیغ آپ ہمیں کرتے ہیں۔ اس کے کل کے کل معتقدات تو ہمارے مذہب کا ایک ممتاز حصہ ہیں۔ اور ہمارا مذہب جناب مسیح کی پیدائش سے بھی پہلے کا تھا۔ پھر آپ کس نئی بات کی تعلیم دیتے ہیں۔ پادری موصوف تو اس بات کا کیا جواب دیتے آخر ایک مدت کے بعد آپ نے کتاب موسوم بہ اپولوجی (استعذار) لکھی۔ یعنی اس تطابق کی اس کتاب میں تشریح کی۔ آپ نے لکھا۔ کہ جناب مسیح سے کئی صدی پہلے دشمنِ صداقت یعنی شیطان کو اس صداقت کا علم ہو گیا۔ جو جناب مسیح کی ذات سے وابستہ تھی۔ یعنی خداوند ایک کنواری کے پیٹ سے پیدا ہو کر کفارہ گناہ ادا کرے گا۔ اور اس صداقت کی یاد میں رسم عشاء ربانی۔ بپتسمہ وغیرہ ہو گی۔ شیطان نے طالبان صداقت کو مذبذب کرنے کے لئے مسیح سے صدیوں پہلے مختلف ممالک میں ایسے مذہب پھیلا دیئے۔ جن کی تعلیم عقاید اور رسمیات یہی تھے۔ جو آج مسیحی کلیسا کے ہیں۔ پادری طرطولین جو جسٹن کے بعد ہوئے۔ اور وہ بھی اپنے وقت کے ممتاز پادری تھے۔ انہوں نے بھی ان رسوم کو شیطان کے ساتھ وابستہ کیا۔ سطور بالا میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے)

کا خاکہ اُڑایا یا کلیسیا نے بُت پرستی کا رنگ اختیار کیا۔ یہ دونوں باتیں کچھ وزن دار نہیں ہیں۔ بات ساری یہ ہے۔ کہ یہ رسُوم یسُوعی مذہب سے کوئی علاقہ نہیں رکھتیں۔ اور محض القاء شیطانی ہیں۔ خواہ وہ شیطان کوئی انسان ہو یا بد خواہ عیسائیت کوئی ہستی ہو۔ آرتھر کانن ڈائل لکھتا ہے۔ "یہ خیال کہ انسان فطرتی گنہگار ہے۔ اس قدر مضحکہ انگیز ہے۔ کہ کسی بُت پرست قوم کے یہاں بھی اس کا پتہ نہیں چلتا۔ اسی عقیدہ نے یہ عقیدہ پیدا کیا۔ کہ اس گناہ کے دُور کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ خدا کی سمجھ میں آیا۔ کہ وہ اپنے بیگناہ بیٹے کو صلیب پر لٹکا دے۔ تاکہ لعنت کا عذاب انسان کے سر سے دُور ہو جائے۔"

اب لوگ از سرِ نو یسوع کو ایک انسان سمجھنے لگے ہیں۔ جو نہ خدا تھا نہ خدا کا بیٹا اور علمائے جدید[1] اس خیال کو تقویت دے رہے ہیں۔ ہم کہتے ہیں۔ کہ یسُوع خدا کا رسول تھا اور اگرچہ وہ افضل الرسل نہ تھا تو اس میں شک نہیں کہ ایک بلند مرتبہ شخصیت ضرور تھی۔ بلکہ رحم بے غرضی اور انکساری کا مجسمہ تھا۔ انسانی تکالیف سے اس کا دل بیچین تھا۔ اور اگرچہ اسے دشواریاں پیش آئیں۔ تاہم اس نے مردانہ وار ان کا مقابلہ کیا۔ اگرچہ وہ صاحب اقتدار نہ تھا لیکن جماعتی کمزوریوں کو علے الاعلان بیان کرنے میں کافی جرأت رکھتا تھا۔ اس کی توہین کی گئی۔ اُسے ستایا گیا۔ تاہم اس نے خاموشی اور استقلال کے ساتھ ان باتوں کو برداشت کیا۔ دوستوں کی خدمت کی۔ اور دشمنوں کا بھلا کیا۔ معجزے دکھائے۔ مگر ان پر فخر نہ کیا۔ بلکہ ہمیشہ ان کو خدا کی قدرت سے منسوب کیا۔ بلکہ یہ بھی کہا۔ کہ دوسرے لوگ بھی اسی قسم کے کام کر سکتے ہیں اپنی کمزوریوں کا خلوص قلب سے اعتراف کیا۔ وہ اپنے زمانہ کا سچا رسول تھا۔ جس نے اس کمزوری کا پتہ لگایا۔ جو اس کی قوم کی بربادی کا باعث تھی۔ اور اس کا علاج بتایا۔ سقراط اور دوسرے صداقت

---

[1] "علماء جدیدین"۔ چند سالوں سے یہ گروہ عیسائی مذہب میں پیدا ہو گیا ہے۔ جنہیں موڈرنسٹ کہتے ہیں۔ جنہوں نے کل ایسے عقاید کو جو کلیسیاء کے زیب و زینت ہیں۔ قبل از مسیح مذاہب کا مابقا قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک عشاءِ ربانی اور دیگر رسوم کلیسیاء انہیں مذاہب سے لی گئی ہیں۔ اس گروہ میں انگریزی کلیسیاء کے کثرت سے بشپ اور دیگر معزز رکن شامل ہیں۔

کے شہیدوں کی طرح وہ بھی سچائی کے لئے جیا اور اسی کے لئے مرا۔ اگرچہ اس کی ہمدردی ایک خاص طبقہ سے مخصوص تھی۔ لیکن جو آنسو اس نے بیت المقدس کی آنے والی تباہی پر بہائے۔ وہ اس کے دردمند دل کا زبردست ثبوت ہیں۔

وہ مختلف پہلوؤں سے ایک مُصلحِ قوم اور زبردست شخصیت والا تھا۔ لیکن اگر ہم اُسے خدا فرض کرلیں تو پھر یہ سب خاک میں مل جائے گا۔ اگر ہم اُسے رنگ الوہیت دیں تو پھر اُس کی ساری خوبیوں پر پانی پھر جائے گا۔ بھلا غور تو کیجئے یہ نقشہ جو اس کی زندگی پیش کرتی ہے۔ الوہیت سے کس قدر بعید ہے۔ خدا ہو کر شیطان کے اشاروں پر چل رہا ہے! بدمعاش اُسے ستارہے ہیں! ذلیل طبقہ اس کی توہین کر رہا ہے۔ دشمنوں کے سامنے بیچارہ اور درماندہ ہے! اگرچہ موت پر غالب آسکتا ہے۔ اور اس طرح اپنے دشمنوں کی تجاویز کو خاک میں ملا سکتا ہے۔ لیکن چُھپا چُھپا پھر رہا ہے۔ مرکر جی اُٹھنے کا سب سے بڑا معجزہ دکھاتا ہے۔ لیکن اس امر کو اُن سے چھپاتا ہے۔ جنہیں اُس کے معلوم کرنے کی سب سے بڑی ضرورت تھی! موت کا پیالہ پینے سے جان چراتا ہے۔ لیکن مجبوراً پینا پڑتا ہے۔ خود ہی انسان کی نجات کے لئے ایک تجویز سوچتا ہے۔ اور خود ہی اس تجویز پر عمل پیرا ہونے سے ہچکچاتا ہے۔ بھوک کی حالت میں ایک درخت کے پاس جاتا ہے۔ اور انجیر نہ پاکر انسانی کمزوری کا اظہار کرتا ہے۔ حالانکہ وہ وقت پھلوں کا نہ تھا۔ تو بھی درخت کو بددعا دیتا ہے۔ اور اس طرح اپنے عالم الغیب ہونے کی نفی کرتا ہے۔ بلکہ انسانی سمجھ بُوجھ سے بھی مُعرا معلوم ہوتا ہے! بحیثیت خدا خود ہی انسان کو کمزور پیدا کیا۔ لیکن اس کی کمزوریوں سے واقف ہونے کے باوجود "پہاڑی وعظ" میں ناقابلِ عمل تعلیم پیش کرتا ہے، جس پر انسان عمل پیرا ہو ہی نہیں سکتا!!!

حقیقت یہ ہے کہ یسوع کے الفاظ اور افعال سے مطلق یہ امر ثابت نہیں ہوتا کہ اس میں الوہیت کا کوئی شائبہ تھا۔ بلکہ تکوینِ عالم کے مقابلہ میں اس کی اعجاز نمائی پرکاہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ بالمقابل اس کے پیغمبرانہ رنگ کے معجزات سے کسی کو تعجب نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ دوسرے انبیاء یہود نے بھی بیماروں کو اچھا کیا، مردے زندہ کیا، سمندر، پہاڑ، آفتاب و ماہتاب کو ساکن کیا اور آسمانوں پر چلے گئے۔ اور یہود کی طرز کلام کے مطابق "ابن اللہ" کا لقب ایک ولی اور شہید کو بہ آسانی دیا جاسکتا ہے۔ قصہ مختصر اگر یسوع کو خدا مانا جائے تو الوہیت کا تصور کسی طرح بھی لائق ستائش نہیں ہوسکتا، یسوع سے

کہیں زیادہ خدا رالوہیت، ہنود کے دیوتا گزرے ہیں ۔مثلاً رام اور کرشن کیونکہ ان کی زندگیاں شاندار تر تھیں
اِن سب خدا کے اوتاروں نے ہماری توجہ خصوصیت کے ساتھ اپنی طرف کبھی جذب نہیں کی ۔ یہ بزرگ خدا
ہوں یا نہ ہوں ۔ لیکن ہمارے مقاصد کو پورا نہیں کر سکتے ۔ کیونکہ ہمارے مقاصد انسانی ہیں ۔ اور یہ لوگ خدا
پس ان کی زندگیوں میں اپنے لئے نمونہ تلاش کرنا بے سُود ہے ۔ ہم تو صرف ایک انسان کی پیروی کر سکتے
ہیں ۔ جو ہر طرح ہماری مثل ہو ۔ جس کی جسمانی اور دماغی استعدادیں ہم سے زیادہ نہ ہوں ۔ اس سے
زیادہ محرک اور کوئی بات تقلید کے لئے کارگر نہیں ہو سکتی ۔ کہ ہم اور ہمارا ہادی دونوں انسان ہیں ۔
ممکن ہے کہ شیر یا ہاتھی ہمارے اندر خوف حیرت یا ستائش کے جذبات برانگیختہ کر دے ۔ لیکن ہم لوگ
شیر یا ہاتھی کو کبھی اپنا نمونہ قرار نہیں دیں گے ۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں ۔ کہ خواہ ہم کتنی ہی خواہش کیوں نہ کریں ۔
ہم ہاتھی یا شیر نہیں ہو سکتے ۔ اسی طرح ہم خدا کو اپنا نمونہ قرار نہیں دے سکتے ۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ
ہمارے لئے خدا بن جانا محال عقلی بھی ہے اور عادی بھی ۔ اب سوال یہ ہے کہ جب صورت حال یہ
ہو تو پھر خدا کے ان اوتاروں کی ضرورت کیا ہے ؟ آخر ان سے کونسا مقصد پورا ہوا ؟ یہ تجویز سراسر غیر معقول
معلوم ہوتی ہے ۔ چنانچہ قرآن شریف فرماتا ہے ۔

إِذْ جَآءَهُمُ الْهُدَىٰٓ إِلَّآ أَن قَالُوٓا أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَّسُولًا ۝ قُل لَّوْ كَانَ فِى الْأَرْضِ مَلَٰٓئِكَةٌ يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِم مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُولًا ۝

(بنی اسرائیل) ۱۷ : ۹۴ - ۹۵

"اور جب ہدایت نازل ہوئی تو لوگوں کی راہ میں اس کے سوائے اور کوئی روک نہ تھی ۔ کہ انہوں نے کہا " کیا خدا نے ایک فانی انسان کو ہمارے لئے ہادی بنا کر بھیجا ہے ؟" اے محمدؐ کہہ دو اگر اس دنیا میں فرشتے بستے ہوتے تو ہم یقیناً آسمان سے ایک فرشتہ ہی نازل کرتے ۔"

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ صرف فرشتوں کی آبادی میں فرشتہ رسول آسکتا تھا ۔ اور چونکہ فرشتہ ہمارے قواء سے مختلف قوے کا حامل ہے ۔ اس لئے ہمارے لئے اس کا آنا بیکار ہے ۔ اگر فرشتہ ہمارے لئے بیکار ہے ۔ تو خدا کا مجسّم ہو کر آنا بدرجۂ اولےٰ بیکار اور فضول ہوگا ۔

اس میں شک نہیں کہ خدا نے ہمیں اپنی صورت پر بنایا ہے ۔ لیکن ہماری روح الوہیت کا

ایک حقیر ترین جزو ہے۔ جسے دراصل الوہیت سے کوئی نسبت نہیں۔ اور پھر وہ جسمانی قیود میں گرفتار ہے۔ بندۂ ہوا و ہوس ہے۔ ہاں اُن عیوب سے پاک ہونے کے لئے ہمیں ایک ایسے استاد کی ضرورت ہے۔ جو ہمارے مانند انسان ہی ہو، بلاشک اس کی رُوح پاکیزہ ہوگی۔ لیکن ہوگی اسی نوع کی، جیسی ہماری سب کی ارواح ہیں۔ اس میں ہمارے ہی جیسے رجحانات بھی ہونے ضرور ہیں۔ ہاں وہ ان پر قدرت رکھتا ہوگا۔ اگرچہ یسوع کے متعلق کوئی بات اناجیل میں ایسی نہیں جو دوسروں کے متعلق نہ کہی جاسکے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ سچ مچ ایک انسان تھا۔ اور وہ اس لائق ہے کہ اسے بنی نوع آدم کا ہادی قرار دیا جائے۔ ورنہ ہم مسلمان اس کو آنحضرت صلعم کے بعد دوسرا درجہ کس طرح دے دیتے؟ لیکن میں اس قول کا اعادہ کرتا ہوں کہ اگر یسُوع کو خدا فرض کیا جائے۔ تو پھر اس کا وجُود بنی آدم کے لئے مُطلق مفید نہیں ٹھیرتا۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ انسان کسی طرح خدا کا مثل نہیں ہوسکتا ہم انسان لاکھ ترقی کریں۔ مگر انسان ہی رہیں گے۔ اور ہمارے خواہشات اور جذبات بھی وہی انسانوں کے سے ہوں گے۔ ہاں بیشک ہم اس نبی اُمیؐ جیسے کسی انسان کی پیروی کے لئے ضرور آمادہ ہوسکتے ہیں جس نے یہ آواز بلند فرمایا۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ ”کہہ تحقیق میں تمہاری طرح ایک انسان ہوں“

(الکہف) ۱۸: ۱۱۰

یہ مختصر اعلان بنی نوع انسان کے حق میں ایک عظیم الشان بشارت ہے۔ کیونکہ اِس کو سن کر ہمارا نصب العین آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اور ہم پر دلفریب امیدوں اور روح افزا امکانات کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کا سب سے بڑا انسان جس نے انسانیت کو مدارج کمال پر پہنچا دیا۔ صاف الفاظ میں ہم سے کہتا ہے کہ میں بھی تمہاری طرح ایک انسان ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ ہم بلندی کے اُس نقطہ تک نہ پہنچیں جہاں وہ کھڑا ہے۔ لیکن اس کے قول سے شکوک کے بادل کائی کی طرح پھٹ جاتے ہیں۔ چنانچہ مجھے اُس کی پیروی کرنے میں جو لطف آتا ہے۔ وہ اسی بناء پر کہ مجھے یقین ہے کہ وہ بھی میری طرح انسان ہی تھا۔ کوئی خدا کا اوتار یا مظہر اللہ انسانوں سے یہ ارشاد نہیں کرسکتا کہ اے لوگو! میری پیروی کرو۔ کیونکہ وہ جانتا ہے۔ کہ لوگ اس کی پیروی کر ہی نہیں سکتے

اور اگر ہم اس کی پیروی کر سکتے ہیں۔ تو وہ ہر طرح ہماری مثل ہے۔ اور ہم سب خدا کے بیٹے ہیں اگرچہ یہ اصطلاح مجازی رنگ رکھتی ہے۔ لیکن ہم خوب جانتے ہیں کہ وہ شخص جو حاملِ الوہیت ہے۔ ہم سے اپنی اتباع کی اُمید نہیں رکھ سکتا۔ اور نہ ہم سے کہہ سکتا ہے کہ

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ

"کہہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو کہ اللہ تم سے محبت کرے اور تمہیں تمہارے گناہ بخش دے۔"

(آل عمران) ۳ : ۳۱

حقیقت یہ ہے کہ خدا کا اوتار انسانیت کی اصلاح کے لئے قطعاً غیر مفید ہے۔ اور نہ وہ ہمارے لئے نمونہ ہو سکتا ہے۔ اور ہو بھی کس طرح ؟ جبکہ ہم میں اور اس میں کوئی یگانگت اور مشابہت ہی نہیں۔ بقول شخصے ایک انسان اپنے نصب العین کو اس طرح حاصل کر سکتا ہے کہ مختلف انسانوں میں جو خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ ان کو ایک فردِ واحد میں مجتمع کر دے۔ اور عیوب اور نقائص سے احتراز کرے اوتار درحقیقت ہماری جنس سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ وہ تو غیر جنس ہے۔ اور کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

کُند ہم جنس باہم جنس پرواز

ہم انسان وہ خدا کا اوتار۔ پس ہم اس کے نقش قدم پر کس طرح چل سکتے ہیں۔ اور نہ وہ ہمارے لئے کمال یا نیکی یا جمال کا نمونہ ہو سکتا ہے۔

وعظ اور رسوم شرعی

گزشتہ دنوں میں مشہور جریدہ "ڈیلی ایکسپریس" میں جو ایک سلسلۂ مضامین "میرے مذہب" کے عنوان سے شائع ہوا۔ اُس سے لوگوں کو بہت فائدہ ہوا ہے ۔ عامۃ الناس کے عقائد کا اظہار بخوبی ہو گیا۔ ان مضامین کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اب خدا کے اوتاروں کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ "اور ہسٹری مذاہب" میں مسیحیت ایک آخری واقعہ ثابت ہو گیا ہے۔ دراصل مروجۂ مسیحیت بت پرستوں کے عقائد کا خلاصہ ہے لیکن اب یہ مذہب بھی اپنی آخری سانسیں پوری کر رہا ہے۔ یسوع سے پہلے بھی دنیا میں درجنوں "مسیح" ہو گزرے ہیں۔ چنانچہ میں اپنی کتاب ینابیع المسیحیت میں اس بات کو اچھی طرح واضح کر چکا ہوں۔ اور یسوع اس سلسلہ کی آخری کڑی ہے۔ جو کلیسیائی عقاید نے دنیا کے سامنے پیش کی۔ اگر وعظ و تلقین کا سلسلہ جو

خدا نے انبیاء کی معرفت اس دنیا میں قائم کیا۔ تاکہ لوگ ان کے فرمان پر عمل کریں۔ شروع سے دنیا کی ایک کثیر آبادی کی ہدایت کا موجب رہا ہے۔ تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہنا پڑتا ہے۔ کہ شرعی رسوم اور رسم اصطباغ بھی بہتوں کے لیے موجبِ کشش و توجہ ثابت ہوئے ہیں۔ اور قدیم زمانہ میں ہی "اصطباغ[1]" نے دنیا والوں پر اپنا سکّہ اچھی طرح جما لیا تھا۔ کیونکہ یہ باتیں وعظ و تلقین کے سادہ مذہب کے بجائے باطنیات سے تعلق رکھتی نظر آتی ہیں۔ اس لئے انسان کی طفلانہ طبیعت کو زیادہ مرغوب ہیں۔ اور واقعی بات بھی یہی ہے۔ کہ ان مذاہب میں اس امر کی کشش ہے کہ ہماری تمام دینی ضروریات بغیر کسی قسم کی محنت اور تکلیف کے پوری ہو جائے گی۔ مثلاً یہ خیال کہ "کیا یسوع نے اپنے خون سے میرے گناہوں کا کفارہ ادا نہیں کر دیا؟" ہم کو اپنا بوجھ دوسروں کے کندھے پر رکھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اور اس وجہ سے ایسے

---

[1] اصطباغ: بپتسمہ دینا۔ یہ رسم قدیمہ ہے۔ گو یہودی اور ان کی اتباع میں عیسائی بھی اس رسم کو ادا کرتے ہیں۔ لیکن کلیسیا نے جو اصطباغ کی طرز اختیار کی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مقدس حوض میں سے پانی لے کر انگلی کے ذریعہ نوزائیدہ بچہ کی پیشانی پر نشان صلیب کا دیا جاتا ہے۔ اس رسم کی ادائیگی سے یہ سمجھا جاتا ہے۔ کہ جو بچہ پیدائشی گناہ لے کر آیا تھا۔ اس کے برے اثرات سے وہ بچ گیا۔ پھر جب بچہ جوان ہوتا ہے۔ تو یہی رسم دوبارہ کی جاتی ہے۔ اس رسم کو رسم کنفرمیشن کہتے ہیں۔ جسکے لفظی معنے تائید کرنا ہے۔ اسی طرح مذہب کفریات قبل از مسیح میں رسم بپتسمہ اسی طریق پر ادا کی جاتی تھی۔ "حوضِ مقدس" گرجا میں ایک حوض ہوتا ہے جس میں پانی بھرا رہتا ہے۔ اور غالباً پانی بھرنے کے وقت بعض دعاؤں سے اسے مقدس کر دیا جاتا ہے۔ اسی پانی سے رسم بپتسمہ ادا ہوتی ہے۔ یہودیوں میں عموماً دریائے یردن کے پانی سے بپتسمہ دیا جاتا ہے۔ وہ اپنے بپتسمہ میں صلیب کا نشان نہیں بنایا کرتے تھے۔ لیکن بپتسمہ میں گناہ سے بچنے کی خاصیت تسلیم کی گئی تھی۔ جناب مسیح کو بھی حضرت یوحنّا نے اصطباغ دریائے یردن کے پانی سے ہی دیا۔ اسی واقعہ کی یاد میں دریائے یردن سے پانی لا کر حوض مقدس میں ڈالا جاتا تھا۔ کیتھولک گرجوں میں تو اب تک یہی حالت ہے۔ البتہ دوسرے عیسائی فرقوں میں یہ پابندی کم ہوتی جاتی ہے۔

مذاہب عوام الناس کی طبائع کے لئے رغبت کا سامان رکھتے ہیں۔ لیکن اب دنیا کے لوگ زیادہ سمجھدار ہو گئے ہیں۔ اور سحر کا دور دورہ ختم ہو چکا ہے۔ چنانچہ گرجوں کے اندر خالی نشستیں اور بے رونقی اس امر پر شاہد ہیں۔ اگر عوام کے دلوں میں کلیسائی رسوم کی کچھ وقعت باقی ہوتی تو کنٹربری کے اُسقفِ اعظم کو پادریوں کی غفلت شعاری کا رونا رونے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اگر مسیحی "مقدس رسوم"[۱] میں پہلے کی سی جاذبیت ہوتی تو انہیں زمانہ کی نبض شناسی اور مناسب حال وعظ طیار کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اب کلیسائی رسوم میں کوئی کشش باقی نہیں ہے۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں عیسائی ایسے ہیں۔ جو اتوار کے دن گرجوں میں جانے کے عوض سینما تھیٹر ناچ گھر کلب اور دوسرے مقامات پر جاتے ہیں۔ اور اپنا وقت موٹر گولف شکار اور سیر تفریح میں صرف کرتے ہیں۔ وہ لوگ بھی جو اتوار کے دن خلوص کے ساتھ عبادت کرنا چاہتے ہیں۔ ان گرجوں میں نہیں جاتے جہاں پیشہ ور تنخواہ دار پادری رٹے ہوئے وعظ بیان کرتے ہیں۔ بلکہ وہاں جاتے ہیں۔ جہاں عشاء ربانی کی رسم پسِ پشت ڈال دی گئی ہے۔ اور رسوم کی جگہ مواعیظ حسنہ نے لی ہے۔ کلیسائی عہدہ داران ان تبدیلیوں سے ناآشنا نہیں ہیں۔ اور ڈاکٹر بارنز بشپ آف برمنگھم نے گول مول لفظوں میں کلیسائی رسوم مروجہ کا ماخذ بُت پرستوں کی رسوم قرار دیا ہے۔ اس اعلان سے کلیسائی حلقوں میں کھلبلی ضرور مچی۔ اور اُسقفِ اعظم کی توجہ بھی اس بدعتِ سیئہ کی طرف مبذول کرائی گئی۔ لیکن عام رجحان طبائع ڈاکٹر موصوف کے اعلان پر صاد کرتا ہے۔ اور اسی وجہ سے انگلستان کے اسقفِ اعظم کو یہ جرات نہ ہو سکی کہ چرچ کانگرس[۲] میں ڈاکٹر موصوف کے اقوال پر تبصرہ کرتا صرف اس کہنے پر اکتفا کی۔ کہ پادری بہتر وعظ تیار

---

[۱] بپتسمہ کا دینا۔ عشائے ربانی کا منانا وغیرہ۔ کلیسیا نے رسمیات مذہب میں داخل کیا ہے عشائے ربانی میں۔ شراب اور روٹی کی جب تقدیس ہو جاتی ہے۔ تو اس روٹی اور شراب کا نام مقدس عناصر رکھا گیا ہے۔ اسی رسم کا نام سکرامنٹ رکھا گیا۔

[۲] گرجاؤں میں جو دن بدن بے رونقی ہو رہی ہے۔ وہ ایک مسلم امر ہے۔ انگلستان کے بشپ نے اس کے علاج میں تین کانگرس منعقد کیں۔ پہلی کانگرس میں تو انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ اس بے رونقی کا باعث عیسائی فرقہ جات کا اختلاف ہے۔ چنانچہ اسکا سدباب کرنے کیلئے انھوں نے اسی کانگرس میں تقریر فرمائی۔ لیکن یہ تقریر لازماً بے سود ہوئی تھی۔ کیونکہ عیسائی فرقوں میں اصولی اختلاف ہے۔ جو مٹ نہیں سکتا مسلمان بھائی اس سے عبرت پکڑیں۔ دوسری کانگرس برسٹل میں ہوئی جسکی طرف متن میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کانگرس میں اُسقفِ اعظم نے اس بات پر زور دیا۔ کہ چونکہ اتوار کے خطبات محنت سے تیار نہیں ہوتے اسلئے دن بدن کشش نہیں ہوتی اسلئے پادری صاحبان انکو محنت سے تیار کریں۔ تیسری کانگرس بھی ہوئی لیکن حاضرین کی تعداد گرجوں میں کم ہوتی گئی آخر مایوس ہو کر اس کو چھوڑ دیا۔

کرنا چاہیئے۔ لیکن اُسقف مذکور کو اس حقیقت کا خیال نہ رہا۔ کہ اگر واقعی رسوم مقدسہ مذہب عیسوی کی بنیاد ہیں تو مواعیظ کو اُن پر فوقیت نہیں ہو سکتی۔ بہر کیف مسیحی دنیا اب اس حقیقت سے واقف ہو چکی ہے اور اس لئے یہ قیاس بیجا نہیں کہ رسوم مقدسہ چند روز کی مہمان ہیں۔ اور ان کے رخصت ہوتے ہی خدا کے مجسم ہونے کا عقیدہ بھی مغرب سے رخصت ہو جائے گا۔ یسوع مسیح کے سادہ اور پاکیزہ مذہب پر جو گرد و غبار جم گیا ہے۔ اس کے دور ہونے کے دن قریب آن پہنچے ہیں۔ مروجہ رسوم مقدسہ دراصل بُت پرستوں کے مذاہب سے ماخوذ ہیں۔ اور بعض مصالح کی بناء پر کلیسیاء نے انہیں اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔ یسوع نے مروجہ رسوم مقدسہ کو نہ رائج کیا نہ جائز ٹھہرایا۔ ان رسوم مروجہ کی ہیئت کذائی بتاتی ہے کہ ان کا مبداء یسوع کا دماغ نہیں ہو سکتا۔ ہاں مواعیظ میں بیشک اس کا رنگ جھلکتا ہے۔ اور یقیناً ایک دن مواعیظ کا درجہ ان رسوم مروجہ سے بلند تر قرار دیا جائے گا۔ عشاء ربانی یسوع کی زندگی کے واقعہ کی یادگار ہے اور اس لئے اس کی عزت بجا ہے لیکن یقیناً وہ ساحرانہ[1] خیالات جو اس میں شرکت سے وابستہ کر دیئے گئے ہیں دور کر دینے کے قابل ہیں۔ لوگوں کے ذہن نشین کرنا چاہیئے۔ کہ اگر وہ یسوع کی مانند ہونا چاہتے ہیں۔ تو انہیں اُس کے نقش قدم پر چلنا چاہیئے۔ محض شراب اور روٹی اُن کے اندر کوئی اخلاقی تبدیلی نہیں کر سکتی۔ اور نہ ان کی نجات کا سبب ہو سکتی ہے۔ چنانچہ پولوس مسیحیت کا شاہد اوّل ان رسوم میں زیادہ اعتقاد نہیں رکھتا تھا۔ اور اُس کی تحریرات میں ان رسوم کا ذکر نہیں پایا جاتا بلکہ وہ تو ان کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے۔ "خدا کا شکر ہے کہ میں نے تم میں سے کسی کو اصطباغ نہیں دیا۔" اس فقرہ سے اس کی دماغی حالت کا پتہ چلتا ہے۔ یسوع سے اس کا جو کچھ تعلق پیدا ہوا وہ کسی رسم کی بناء پر نہیں ہوا بلکہ محض ایک تحریک باطنی کی بناء پر۔

آج کل مسیحی دنیا میں جو گرما گرم بحث اس امر کے متعلق چھڑی ہوئی ہے۔ کہ رسوم مقدسہ ضروری

---

[1] عشاء ربانی کے کھانے سے حسب عقیدۂ عیسائیت چونکہ فطرت پاک ہو جاتی ہے۔ اس تبدیلی کو سحری تبدیلی نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے مذہب کفریات کے متبع بھی اس تبدیلی کے قائل تھے۔ یہ رسم بھی اسی مذہب کی ہے۔

ہیں۔ یا غیر ضروری اس کا تفصیل کے ساتھ ذکر کرنے کی اس جگہ نہ ضرورت ہے نہ گنجائش۔ مختصر یہ کہ یہ رسوم قدیم توہمات کا ایک نشان ہیں اور بس۔ کوئی صاحب عقل ان کو پسند نہیں کر سکتا۔ عام طبائع رسوم کے عوض وعظ کو زیادہ پسند کر رہی ہیں۔ اور عمدہ نصائح کی بدولت تخیلات سحر کافور ہو رہے ہیں۔ چنانچہ دنیا کی دوسری سرگرمیوں میں بھی جنتر منتر کی جگہ اصول ہی کامیاب ہو رہا ہے۔ لوگ اپنی کامیابی کے لئے اصول اور ذرائع تلاش کرتے ہیں۔ نہ کہ جادو اور ٹوٹکے۔ جب دنیاوی معاملات اس رنگ میں چل رہے ہیں۔ تو دینی معاملات کیوں نہ چلیں؟ دنیا میں پہلا مذہب اسلام اور پہلا معلم عرب کا وہ نبیؐ امی ہے۔ جس نے اصولوں پر زور دیا۔ اُس زمانہ میں رسوم کی بھرمار تھی اور اصطباغ مقدس پانی اور مقدس روٹی کا ہر جگہ زور شور تھا۔ اپنے خون سے لوگوں کی نجات کا سامان کرنے کا سہرا اس زمانہ میں صرف یسوع ہی کے سر پر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اُس زمانہ میں ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جسٹن شہید دوسری صدی عیسوی میں "خدا کے بیٹوں کے انبار" کا ذکر کرتا ہے۔ جو سب مقدس کنواریوں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے۔ اور ان مذاہب کی موجودگی میں یسوعی مذہب کی کوئی خصوصیت باقی نہیں رہتی۔ جہاں بیشمار خدا کے بیٹے پوجے جاتے تھے۔ وہاں ایک یسوع بھی تھا۔ چنانچہ جسٹن نے اس مشکل کو محسوس کیا۔ اور جب قیصر روم نے اس سے اس مسئلہ کے متعلق دریافت کیا تو اسے یسوع کی برتری ثابت کرنے میں بڑی دشواری پیش آئی۔ اس کی مشہور تصنیف "اپولوجیا" اسی مشکل کو حل کرنے کی ایک ناکام سی کوشش ہے۔ شائقین مزید معلومات کے لئے اس کتاب کا مطالعہ کریں۔

بہر حال اس قسم کی روایات مشرقی ممالک میں اب ایک فسانہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں مشرق میں ان باتوں کو بت پرستی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور مغرب کو بھی مجبورًا انہیں ایسا ہی سمجھنا پڑیگا اگرچہ اب زیادہ دیر کا امکان نہیں ہے۔ جس قدر جلد اس بات کا اعلان ہو جائے۔ اسی قدر اچھا ہے۔ تاکہ مغرب اور مشرق میں رابطۂ اتحاد قائم ہو جائے۔ مشرق میں اس راز کے چہرہ سے بہت جلد نقاب اُٹھادی گئی۔ اور اس قسم کے مذاہب کو توہمات قرار دے دیا گیا۔ اب موقع ہے کہ مغرب

اس معاملہ میں مشرق کی تقلید کرے۔ اور مزدور کرے گا۔ کیونکہ مغرب ہمیشہ سے مشرق کا مقلد رہا ہے۔ ان الفاظ کے ساتھ ہم تجسم الوہیت کے عقیدہ کو بنی نوع آدم کی بہبودی کے لئے بیکار محض قرار دینے میں حق بجانب ہیں۔ یقیناً ان عقائد سے کوئی فائدہ مرتب نہیں ہو سکتا۔

بابُ دوم

انبیاء اللہ بشکلِ اُسوہ

ہم اسے ایک نیک شگون سمجھتے ہیں۔ کہ اس وقت مذہبی رسوم کی جگہ مغرب میں مواعیظ کی وقعت زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ تمام مذاہب ایک نقطۂ واحد پر متحد ہو جائیں گے۔ دنیا میں ایسا کونسا مذہب ہے۔ جو وعظ و نصائح سے خالی ہو۔ "اخلاق" سب اقوام کی مشترکہ دولت ہے۔ جناب مسیح کے پہاڑی وعظ کا بہت سا حصہ سابق تعلیمات کی صدائے بازگشت ہے۔ بدھ اور دوسروں نے یسوع سے پہلے اسی قسم کی تعلیمات دنیا کو دی تھیں۔ اور یسوع کی بہت سی تمثیلات کو ایک طرح بدھ کی تعلیم کا عبرانی ترجمہ سمجھنا چاہیئے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ یسوع نے یہ باتیں بدھ مذہب سے اخذ کیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ انہوں نے یہ تمام تعلیم خدا ہی سے حاصل کی تھی۔ مذہبی تخیلات میں یہ نئی لہر، یورپ کے لوگوں کے حق میں بہت مفید ہوگی اس کی بناء پر مذاہب میں اتحاد پیدا ہو جائے گا۔ اور گہرے مطالعہ سے یہ قرآنی صداقت لوگوں پر آشکارا ہو جائے گی۔ کہ ہر قوم کو ربانی ہدایت دی گئی تھی۔ اور دنیا کے تمام مذاہب خدا کی طرف سے آئے۔ وہ ایک ہی تعلیم لائے۔ اور یسوع خدا تعالیٰ کا برگزیدہ پیغمبر تھا۔ مذہبی جنون رکھنے والے لوگ اور تنگ نظر پادری، جن کی یورپ میں کمی نہیں مجبوراً اپنے لیے کوئی دوسری دنیا تلاش کریں گے۔ مبلّغین کی ایک نئی جماعت پیدا ہوگی۔ جن کی ذہنیت اس قدر بلند ہوگی۔ کہ وہ دوسرے مذاہب پر لعن طعن کو برا سمجھیں گے۔ وہ لوگ معلّم کی جگہ تعلیم پر غور کریں گے۔ اور تعلیم ہی کی بناء پر معلّم کی عزت کریں گے اور جس مذہب میں بھی وہ ایسی بات پائیں گے۔ جو ان کے مذہب میں موجود ہے۔ تو وہ اسے سرقہ تصور نہ کریں گے۔ بلکہ اُسے الٰہی وحی کا ثبوت سمجھیں گے۔ وہ دن خدا اور اسلام دونوں کے لیے جلال کا دن ہوگا۔ اسلام نے تو اپنے پیرووں کے اندر اس قسم کی ذہنیت پیدا کر دی ہے۔ کیونکہ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ ہر مذہب کی اصل خدا ہی کی طرف سے سمجھے۔ اور یہ ایمان رکھے کہ ہر قوم

میں ایک نہ ایک ہادی ضرور آیا۔ اور جملہ انبیاء یکساں طور پر لائقِ تعظیم ہیں۔ اور ان میں کسی قسم کی تفریق جائز نہیں۔ یہ بات عقلی طور پر بھی درست معلوم ہوتی ہے۔ انسان دو چیزوں یعنی جسم اور روح سے مرکّب ہے۔ پس لازم ہے کہ دونوں کی پرورش ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے اجسام کی پرورش میں کسی قسم کی تفریق جائز نہیں فرمائی۔ پس کیا وجہ ہے۔ کہ روحانی دنیا میں کوئی تفریق روا رکھے۔ اگر اس کا پیغام یسوع کی معرفت کل انسانوں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ جیسا اب بھی لاکھوں کروڑوں انسان ایسے ہیں۔ جن تک نہیں پہنچا تو کیا حرج ہے۔ یقیناً اس نے اپنی مرضی دوسرے انبیاء کی معرفت بھی لوگوں پر ظاہر فرمائی ہوگی۔ بیشک اس نے ایسا کیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ دنیا میں متعدد مذہب پائے جاتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے ان رسولوں نے دنیا میں الٰہی روشنی پھیلائی اور یہ لوگ دنیا والوں کے لیے معلّم بھی تھے۔ اور نمونہ بھی یعنی جن باتوں کی بحکم خدا انھوں نے تعلیم دی ان باتوں پر خود عمل کرکے بھی دکھایا۔ لیکن ان کے ہمعصروں نے ان کی تعلیمات اور سُنّت کو محفوظ نہ رکھا۔ جو کچھ ہم تک پہنچا ہے وہ محض روایات اور ان میں بھی تحریف کی گنجائش اس قدر ہوئی۔ کہ ہر مذہب کی تعلیمات ایک صدی سے پہلے ہی محرف ہو گئیں۔ اور آئندہ نسلوں کو وہ مذہب ملا جس کا تخیل بھی بانیٔ مذہب کے ذہن میں نہ تھا۔ خصوصاً مسیحیت کے متعلق تو یہ بات لفظاً صحیح ہے۔ مختلف انبیاء کے متعلق معاصرانہ شہادت کی عدم موجودگی سے ایک اور قباحت پیدا ہو گئی۔ سابقہ مذاہب میں سے کوئی بھی اپنے اندر یہ بات نہیں رکھتا کہ جملہ امکانی ضروریات انسانی کا علاج کر سکے۔ اس لیے مختلف مسائل میں مختلف اشخاص نے مختلف فیصلے کیے۔ اور وحدت خیال غائب ہو گئی۔ مسیحیت پر یہ حقیقت پورے طور سے لاحق ہو رہی ہے۔ اگر ہم اس مذہب کی مصرحہ باطنیات سے قطع نظر کر لیں۔ تو اس کے مواعیظ ہماری ضروریات زندگی کے لیے ناکافی ہیں۔ یسوع کی تعلیمات جیسی کہ انجیلوں میں ملتی ہیں، صرف محبت اور بردباری کے مذہب کا خاکہ ہیں جو عملی زندگی کے لیے مطلق مفید نہیں ہوں گی نہ ہوتیں۔ اس تعلیم کے نقائص بقول ارنالڈ بینیٹ ہیں ختم نہیں ہوتے۔ یسوع کی تعلیم کا رجحان دراصل ترک دنیا اور رہبانیت کی طرف ہے۔ وہ تمدنی یا قومی زندگی کے لیے موزوں نہیں۔ اور نہ بین الاقوامی تعلقات پر اس کا کچھ اثر ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں یسوع کی بیان کردہ تعلیمات اور اس کے افعال میں بھی ایک گونہ تناقض موجود ہے۔ بلکہ بعض اوقات اس کے افعال، اس کے اقوال کی تردید کرتے ہیں۔ ان خرابیوں کا باعث صرف یہی ہے کہ اس کے

حواریوں اور شاگردوں نے اس کی تعلیمات کو محفوظ رکھا۔ دیگر انبیاء کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا ہے۔ لیکن "دیگر انبیاء کے برعکس جن کی اصل صورتیں احترام کے سحاب میں پوشیدہ ہوگئی ہیں۔ آنحضرتؐ ایک روشن تاریخی شخصیت کے مالک ہیں۔ جن کی مقدس زندگی کے لاتعداد واقعات خود آپؐ کے ہمعصروں نے ہماری ہدایت کے لئے قلم بند کر دیئے ہیں"۔ (مارماڈیوک پکتھال)

آنحضرتؐ فی الحقیقت ایک تاریخی انسان ہیں جن کی شخصیت کے متعلق شک و شبہ کی مطلق گنجائش نہیں۔ اور آپ ہی صرف ایک ایسے رسول ہیں۔ جو صحیح معنوں میں تاریخی انسان کہے جا سکتے ہیں بچپن سے لے کر تا دم وفات، اور خصوصاً اس زمانہ کے حالات جو آپؐ کی نبوت و رسالت کا زمانہ ہے، سب کے سب تحریری طور پر محفوظ ہیں۔ میں آپؐ کے متعلق اپنے والدین کے حالات سے زیادہ معلومات رکھتا ہوں اور کیا یہ حیرت انگیز امر نہیں ہے۔ کہ باوجود ان معلومات کے پھر بھی آپ کی شخصیت تمام وکمال ہمارے احترام کی مستحق قرار پاتی ہے۔ اگر ہم دوسروں کے متعلق بھی اسی قدر جانتے تو نہ معلوم اُن کے متعلق ہمارے خیالات کس قسم کے ہوتے؟ دیگر انبیاء کی زندگیاں روایات اور پردوں میں چھپی ہوئی ہیں۔ ان کی روزمرّہ کی زندگی کے متعلق بہت ہی کم معلومات حاصل ہیں۔ ان کے اقوال بھی مبہم اور مجمل ہوتے ہیں۔ اگر انھیں کسی فسانہ کا فرد قرار دیدیا جائے تو اس صورت میں ان کے سوانح حیات لائق اعتنا ہو سکتے ہیں۔ ورنہ نہیں۔ لیکن آنحضرتؐ تمام تاریخی شخصیتوں سے زیادہ تاریخی وقعت رکھتے ہیں۔ اور شہادت کے اس انبار میں آپؐ کے دشمنوں کو کوئی بات مشکل ہی سے ایسی ملے گی جسے وہ آپؐ کے خلاف استعمال کر سکیں۔ اسی بات میں آنحضرتؐ کی برتری کا راز مضمر ہے۔ اور اسی وجہ سے ہم آپؐ کو سب انبیاء سے برتر اور بہتر اور افضل سمجھتے ہیں۔ آپ کے اقوال اور افعال سب جوں کے توں محفوظ ہیں۔ نیز آپ کی تعلیم اور عمل میں ایک عجیب مطابقت پائی جاتی ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپؐ نے جملہ انسانی ضروریات کو ذہن میں رکھ کر اور جملہ روحانی حوائج کو مدنظر فرما کر اپنے اقوال اور اعمال سے ان سب کا علاج مہیا فرما دیا تھا۔ بحیثیت ایک مسلمان ہوتے کے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ دوسرے انبیاء نے اپنے مقاصد کی تکمیل نہیں کی۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ ان کے سوانح حیات میں اس امر پر کافی روشنی نہیں ڈالی گئی۔ بیشک انہوں نے اپنے فرض کو ادا کیا ہوگا۔ لیکن ان کے سوانح نگاروں نے ایمانداری کے ساتھ ہر بات کو درج نہیں کیا۔ پس

میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اگر آنحضرت ؐ کے سوانح حیات ہمارے سامنے نہ ہوتے تو ہم خدا کی قائم کردہ نبوت کا مطلب اور مفہوم سمجھنے سے قاصر رہتے۔ اگر نبی یا رسول کی بعثت صرف اسی لئے ہوتی ہے کہ وہ چند مواعیظ یا خطبے پبلک کے سامنے دیدے یا مختلف موقعوں پر وہ باتیں بیان کردے، جو اس سے پہلے بہتوں نے بیان کر دی ہیں' تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس آسمانی منصب نبوت سے انسانوں کو کونسا معتدبہ فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ اتنی باتیں تو ہم ان لوگوں سے بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ جنہوں نے مامور من اللہ ہونے کا دعوے بھی نہیں کیا۔

سنسکرت علم ادب میں ایک کتاب ہے جس کا نام پنچ تنتر یعنی "پرندوں سے نصیحت" ہے۔ اس کتاب میں انتظام ملکی اور حسن مدنیت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ کسی زمانہ میں راجکماروں کے نصاب تعلیم میں یہ کتاب لازمی طور پر شامل تھی۔ اخلاق نکوکاری' طرز معاشرت وغیرہ کے متعلق جملہ باتوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ لیکن ہر نصیحت کی بات پرندوں یا جانوروں کے منہ سے کہلوائی گئی ہے۔ مثلاً ایک کبوتر ہمیں یہ نصیحت کرتا ہے۔

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست　　در پریشاں حالی و درماندگی

اور اس نصیحت کی تشریح اپنے ذاتی تجربہ سے کرتا ہے جو اُسے اپنے دوست چوہے کے ساتھ حاصل ہوا تھا۔ لڑائی اور جنگ و جدل کی ترکیبیں ایک اُلو کی معرفت سکھائی گئی ہیں۔ ایک کوّے سے یہ نصیحت ملتی ہے کہ دشمن کو حقیر نہ سمجھنا چاہیئے۔ اور اس کی تمثیل میں ایک شیر کی داستان بیان کی گئی ہے جس کو ایک لومڑی نے پھسلا کر جال میں پھنسا دیا تھا۔ یہ نصیحت کہ نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہوتا ہے ایک بندر کی حکایت سے سمجھائی گئی ہے۔ جو اپنے آقا کی اس کے سونے کے وقت نگرانی کیا کرتا تھا۔ ایک روز چند مکھیاں اس کے آقا کو پریشان کر رہی تھیں۔ کئی دفعہ ہٹاتا لیکن وہ پھر اس کے منہ پر آن بیٹھتی تھیں۔ بندر کو جو غصہ آیا تو تلوار نکال کر ایک وار کیا جس سے آقا کا کام تمام ہو گیا یہ کتاب نہایت دلچسپ اور حکمت آموز ہے۔ لیکن موجودہ زمانہ میں کوئی شخص اس کو اپنا راہبر بنانا پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ اس میں نہ اصلیت ہے نہ صداقت ایسا ہی جن نصائح پر ان کے ناصحین نے خود عمل کر کے نہیں دکھایا۔ ان سے کوئی شخص ہدایت نہیں پا سکتا۔ یہ وہ زرین اصول ہے جسکو ہادی اور ہدایت دونوں کے انتخاب کرنے میں مدنظر رکھنا چاہیے۔ ہادی کی

عزت اس کے الفاظ یعنی نصیحت کی بناء پر نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ افعال اور اعمال کی بناء پر۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے نصائح کو عملی جامہ نہ پہنا سکے تو ان سے دیوار پر لکھے ہوئے نصائح کسی صورت میں کمتر نہیں ہوتے :-

لیکن بہت کم لوگ اس اصول پر کاربند ہوتے ہیں۔ خصوصاً مذہب کے معاملہ میں مقدس کتابوں میں بہت سی نصائح اور کارآمد باتیں درج ہوتی ہیں۔ لیکن مؤثر نہیں ہوتیں۔ کیونکہ ناصحین نے ان کو عملی لباس تو پہنایا ہی نہیں ہوتا۔ اور اگر عمل یا نمونہ موجود نہ ہو تو بعض اوقات ان نصائح سے نفع کی جگہ نقصان بھی پہنچ جاتا ہے۔ اس موقعہ پر عموماً یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔ اور ایسے افعال کرتے ہیں۔ جو شاید ناصحین کے خیال میں نہ آئے تھے۔ مثلاً ہر انجیل کے مطالعہ کرنے والے پر یہ بات روشن ہے کہ تلوار چلانے کے متعلق یسوع کے احکام میں عجیب تناقض موجود ہے۔ اگر اس مسئلہ پر یسوع اپنے فعل سے کوئی روشنی ڈال دیتا تو مسیحیت کی تاریخ آج کچھ اور ہی ہوتی۔ مسیحی علماء ہمیشہ سے حکومت کے مفاد کی نگرانی کرتے چلے آئے ہیں۔ جب کبھی حکومت برسرپیکار ہوتی ہے۔ تو یہ لوگ جنگ کی خوبیوں پر وعظ بیان کرتے ہیں۔ جیسا کہ ۱۹۱۸ء میں بشپ آف لندن نے (ماربل آرچ) محراب مرمریں میں کیا تھا۔ اور جب جنگ ختم ہو جاتی ہے تو یسوع کا پہاڑی وعظ بیان کرنے لگتے ہیں عاجزی، رحمدلی۔ بردباری۔ حلم۔ عفو۔ عدم تشدد وغیرہ منجملہ ان خصائص کے ہیں۔ جن پر مسیحیت فخر کرتی ہے۔ لیکن اس کی تاریخ دیکھو تو اور ہی رنگ نظر آتا ہے۔ وہاں تو بے رحمی ستم رانی۔ دل آزاری اور خونخواری کی داستانیں زیب اوراق ہیں۔ اگر یسوع کی بیان کردہ تعلیمات کے ساتھ اس کے افعال بھی محفوظ ہوتے تو اس کے پیرو کم از کم از راہ الفت اس کے ان افعال ہی کی تقلید کرتے۔

واضح ہو کہ استعداد کسی فعل کا ثبوت نہیں ہو سکتی۔ اور معلمین اخلاق کے معاملہ میں منفی صفات کوئی قابلِ تعریف بات نہیں ہیں۔ کیونکہ نہ تو ان کے بیان کرنے میں کوئی دشواری ہوتی ہے۔ اور نہ ان سے طالبانِ اسوہ کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ہم خود دوسروں کے سامنے گھنٹوں رحمدلی اور محبت کے فوائد پر لیکچر دے سکتے ہیں۔ لیکن محض زبان سے کہہ دینے سے ہمارے الفاظ میں کوئی تاثیر نہیں پیدا ہو سکتی۔ علاوہ ازیں جو بات خود ہمارے تجربہ میں نہیں آئی۔ وہ ہم دوسروں کو کس طرح بتا سکتے ہیں۔

قبل اس کے کہ کوئی شخص دوسروں کو ضبط اور صبر کی تعلیم دے، اسے خود بھی تو مثل یسوع اور محمدؐ

کے اپنی زندگی میں انتہائی تکالیف برداشت کرنی ضرور ہیں۔ لیکن حضرت یسوع کو دیگر خصائص اخلاقی کی تکمیل اور ان کے اظہار کا موقعہ نہ ملا۔ جو آنحضرتؐ کو نصیب ہوا۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم کسی نبی کی تعلیم کے تخیلی حسن پر فریفتہ ہو جاتے ہیں۔ اور اس لئے اس کی تعریف کرنے لگتے ہیں۔ لیکن یہ بات قرینِ عقل و دانش نہیں ہے کہ ہم اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر اس تعلیم کو حقائقِ حیات یقین کر لیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں۔ کہ ازمنہ سابق کی مقدس یادگار کے طور پر اس کی عزت کریں۔ اس سلسلہ میں ایک اور غلطی کا بھی امکان ہے۔ ہم تلقین کردہ فضائل کو ان کے بیان کرنے والے کی ذاتی خوبیاں سمجھ لیتے ہیں۔ عملی طور پر ہر ملک اور قوم میں ایسا ذخیرہ علم ادب کا موجود ہے۔ جس میں بعض جگہ اخلاق کی اعلےٰ ترین تعلیم پائی جاتی ہے۔ جو در اصل کسی نبی کے شایانِ شان ہوتی ہے۔ لیکن اگر ان کتب کے مضامین عالیہ کو ان کے مصنفین کے اخلاق ذاتی کا آئینہ تسلیم کر لیا جائے۔ تو پھر لارڈ ڈیرولم کے اخلاق پر موجودہ فیصلہ سے اختلاف کرنا پڑے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص خود ان باتوں پر عمل کر کے نہ دکھائے جن کی تلقین وہ دوسروں کو کرتا ہے۔ اس وقت تک اس شخص کو کوئی بڑی عزت نہیں دی جا سکتی۔ خواہ اس کے دعادی کتنے ہی بلند بانگ کیوں نہ ہوں۔ انبیاء کے متعلق مسلمانوں کا نظریہ یہ ہے کہ اگر وہ کسی شخص کو نبی یقین کرتے ہیں۔ تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ جو کچھ اس نے مخلوق کو سکھایا ہوگا۔ اس پر خود بھی عمل کیا ہوگا۔ نیز یہ کہ جملہ انبیاء ایک ہی مقصد عالیہ کی تکمیل کے واسطے مبعوث ہوئے تھے۔ اور تمام لوگ امت واحد ہیں۔ پس اللہ تعالےٰ نے انبیاء کو بشیر و نذیر بنا کر بھیجا اور ان پر سچائی سے لبریز کتابیں بھی نازل فرمائی (قرآن مجید ۲ : ۲۱۳) ہم نے جس لفظ کا ترجمہ سچائی کیا ہے۔ وہ عربی میں "حق" ہے۔ اور اس کے معنی یہ ہیں کہ ایسی ہدایت جو خدا کی طرف سے بندوں کے لئے آئے۔ اور اس میں غلطی کا شائبہ نہ ہو۔ اور نہ وہ محض خیالی اور دل خوش کن باتوں پر مبنی ہو۔ بلکہ عملی جامہ پہن سکے۔ اگر کوئی خیالی یا وہمی بات کسی نبی کی تعلیم میں پائی جائے تو سمجھ لو کہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہے۔ بعد میں کسی نے ملا دی ہے لیکن تقریباً تمام انبیاء کو دو ناموافق حالات سے سابقہ پڑتا رہا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ زندگی کے مختلف منازل میں سے ہو کر نہیں گزرے۔ جس طرح کہ آنحضرتؐ اور اس لئے انہیں انسانیت کے مختلف منازل میں سے مخلوق کے سامنے لانے کا موقع نہ مل سکا۔ اگر ملتا تو وہ لوگ وہی کرتے جس کی ایک خدا کے نبی سے توقع ہو سکتی ہے۔

مثلاً ہماری خوشیوں کا انحصار زیادہ تر خانگی تعلقات کی خوشگواری پر مبنی ہے۔ یسوع صاحب اگر شادی کرتے تو یقیناً اعلیٰ درجہ کے شوہر ثابت ہوتے۔ لیکن انہوں نے شادی نہ کی اس لیئے متاہل زندگی میں وہ کسی کے لیئے نمونہ قرار نہیں دیئے جاسکتے۔ بعض انبیاء نے شادی کی۔ مگران کی زندگی کے حالات یا تو تاریکی میں ہیں۔ یا اس قدر مختصر اور محدود کہ ان سے کوئی فائدہ مترتب نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ان کے لکھنے والوں نے اصلی حالات کو بے کم وکاست بیان نہیں کیا۔ بلکہ جو بات انہیں پسند آگئی وہ لکھ دی۔ پس جب کوئی شخص انبیاء کی زندگیوں سے اپنے لیئے کوئی کام کی بات نکالنا چاہیئے تو ان دو باتوں سے ضرور دوچار ہونا پڑتا ہے :۔

کسی نبی کا منصب نبوّت صرف چند معجزات یا چند مواعیظ چند دعاؤں یا چند بد دعاؤں پر منحصر نہیں ہوتا۔ نبی تو اس وقت آتا ہے۔ جب مخلوق پر اخلاقی، ذہنی اور روحانی موت طاری ہوجاتی ہے۔ اور اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ اس مخلوق کو از سر نو زندہ کرے۔ پس وہ اپنے ساتھ اعلےٰ اصول لاتا ہے۔ ان پر خود عمل پیرا ہوتا ہے۔ اور دوسروں کو عمل کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے ماحول اور حلقہ اثر میں زندگی کی لہر دوڑا دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ نبی کا کام انسانیّت کو ارتقائی منازل طے کرانا ہوتا ہے۔ اور یہ مسئلہ کافی دشوار اور پیچیدہ ہوتا ہے۔ انسانیّت کے پہلو ایک دو نہیں بلکہ صدہا ہوتے ہیں۔ مثلاً طبعی، جذباتی وجدانی، تمدّنی، اخلاقی، اقتصادی ذہنی اور روحانی وغیرہ۔ اور یہ سب آپس میں مربوط ہوتے ہیں۔ اور اپنی نشوونما اور بقا کے لیئے باہم دگر محتاج۔ جس وقت وہ اپنے مقررہ دوائر میں عمل کرتے ہیں۔ تو ایک دوسرے کو تقویّت بھی پہنچاتے ہیں۔ اسی لیئے ان میں سے کوئی پہلو بھی لائق فراموشی نہیں ہے مثال کے طور پر جذبات شہوانی کو لے لیجیئے جن کے خلاف بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ اور بعضوں نے ان کا قلع قمع کرنے کی نصیحت بھی دی ہے۔ لیکن ایسا کرنا خلافِ فطرت ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہ جذبات بھی ارتقائی منازل طے کرکے اعلےٰ اخلاق کی بنیاد اور روحانیت کا مبداء ہوجاتے ہیں۔ ایک نبی کا فرض ہے۔ کہ وہ تمام جذبات کا لحاظ رکھتے اور ایسا نظام قائم کرے جس کی مدد سے انسانوں کے تمام جذبات یکساں طور پر نشوونما حاصل کریں۔ اور ہر وقت اس طرح قابو میں رہیں کہ ان کے جوہر ذاتی ترقی حاصل کریں۔ اور وہ خود صفات واخلاق الٰہیّہ سے متصف ہوجائیں۔

کسی دوسری جگہ میں نے آنحضرت ؐ کی خاص اور ممتاز کامیابیوں کو یکجائی طور پر بیان کر دیا ہے۔ اور ان احسانات کا ذکر بھی کر دیا ہے۔ جو آپؐ نے بنی نوع آدم پر فرمائے ہیں۔ آپؐ کی کامیابیاں اس نوعیت کی ہیں۔ جن کی نظیر کسی دوسرے نبی کی زندگی میں نہیں مل سکتی۔ اس کی دونوں وجوہ اُوپر بیان ہو چکی ہیں۔ لیکن ہم مسلمان آپ کو اس وجہ سے بھی افضل الرسل تسلیم کرتے ہیں۔ کہ آپؐ کی ذات جامعِ کمالات جمیع انبیاء ہے۔ ہر نبی قوم کے لیے بمنزلہ ایک نصب العین کے تھا۔ اور اسوۂ حسنہ بنا کر بھیجا گیا تھا۔ تاکہ افراد قوم اس کو اپنے سامنے رکھیں۔ اور اگر ہمارے پاس اس کے سوانح حیات موجود ہوتے اور اُسے وہ مواقع حاصل ہوتے جن کی بدولت اسے اپنی ذاتی قابلیت کے اظہار کا موقعہ ملتا تو وہ آج بھی ہمارے سب کے لیے نمونہ ہو سکتا تھا۔ لیکن موجودہ حالات میں صرف حضرت محمدؐ ہی ایسے رسول ہیں۔ جن کو ہم اپنی زندگی کی اصلاح کے لیے اسوۂ حسنہ بنا سکتے ہیں۔ جمیع صفات نبوت آپؐ کی ذات میں جمع ہیں۔ اور ہر کمال جو کسی نبی کی ذات میں تھا۔ آپؐ کی ذات میں بدرجۂ اتم موجود ہے یعنی (آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری) جو خوبیاں نبی کی ذات میں امکانی طور پر مجتمع ہو سکتی تھیں وہ سب آپؐ میں موجود ہیں۔ صلوٰت اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ۔

موجودہ صورت حالات میں آپؐ کو نبوت کا ایک نمونۂ اکمل ثابت کرنا کوئی کار دشوار نہیں ہے ہم تو حتے الوسع ایک نبی کو دوسرے کے مقابل پر لانے میں احتراز کرتے ہیں۔ لیکن اگر دو نبیوں میں سے ایک کے حالات تمام و کمال معلوم ہوں اور دوسرے کے برائے نام تو ایسی صورت میں مقابلہ کی ضرورت ہی نہیں ہو سکتی۔ ہم مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ سارے نبی بنی نوعِ آدم کی بہبودی کے لئے بہترین مقاصد لے کر مبعوث ہوئے تھے۔ اور حتے الوسع انہوں نے اپنے مقاصد کی تکمیل بھی کی۔ ان کا کیریکٹر دیگر افراد کے لیے نصب العین تھا۔ اور چونکہ وہ خدا کے فرزند اور اطاعت گزار تھے اس لیے لامحالہ معصوم بھی تھے۔ یعنی گناہوں سے پاک۔ کیا خدا نے انہیں لوگوں پر اپنی مرضی ظاہر کرنے کے لیے منتخب نہیں کیا تھا؟ اگر یہ لوگ لائق انتخاب نہ تھے۔ تو پھر نعوذ باللہ خود اس کے علم پر حرف آتا ہے۔ پس علی الرغم عقاید کلیسیا ہم اس بات کی تردید کرتے ہیں۔ چونکہ ان کے حالات ہمارے سامنے نہیں ہیں۔ لہٰذا مجبوراً ہمیں عرب کے مایہ ناز فرزند محمدؐ کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ کہ

اس عدیم المثال شخصیت نے خدا تعالےٰ کے انتخاب کو اپنی لیاقت سے کس حد تک لائق تحسین ثابت کیا۔ اس مقصد کیلئے ہمیں اس کو کسی انفرادی حیثیت دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ بحیثیت انسان وہ خود ایک ارفع و اعلےٰ شخصیت کا مالک ہے۔ میں نے بحیثیت انسان اس لئے کہا کہ آپ خود انسانیت کے ہی مدعی ہیں۔ آپؐ نے الوہیت کا دعویٰ نہیں کیا۔ مگر یسوع صاحب دعوئے الوہیت میں منفرد نہیں ہیں۔ ان سے پہلے بھی خدا کے بہت سے ایسے بیٹے بزعم متبعین دُنیا میں پیدا ہو چکے ہیں۔ جو اپنے خون سے لوگوں کے گناہوں کو دھونے کے لئے آئے تھے۔

بیشک حضرت یسوع پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا تھا۔ لیکن ان کے علاوہ خدا کے بہت سے بندے ایسے گزرے ہیں۔ جن پر اس قسم کا یا کسی اور نوعیت کا مقدمہ چل چکا ہے۔ اور موت کا پیالہ پی چکے ہیں۔

ڈاکٹر زویمر جس قدر چاہیں اس بات پر فخر کریں کہ مسیحیت خدا کی محبت کا بے نظیر نشان پیش کرتی ہے۔ کوئی سمجھدار آدمی اس فخر کو پرکاہ سے زیادہ وقعت نہیں دے سکتا۔ کیونکہ ڈاکٹر موصوف اس اظہار سے محض اپنی ناواقفیت کا ثبوت بہم پہنچا رہے ہیں۔ اور دیدہ و دانستہ صداقت پوشی کر رہے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے طرز عمل کی غلطی اور کمزوری سے ناواقف نہیں ہیں۔ کیا انہیں یہ بات معلوم نہیں کہ یسوع سے پہلے اس دنیائے فانی میں بُت پرست اور مشرک اقوام کی تاریخ مذہب میں کنواریوں کے پیٹ سے خدا کے بہت سے ایسے بیٹے پیدا ہو چکے ہیں۔ جن کو آسمانی باپ نے اس دنیا میں محض اسی لئے بھیجا تھا کہ وہ اپنی جانیں بنی نوع آدم کی بہبودی کیلئے قربان کر دیں۔ بکس خدا کا پہلا بیٹا ہے۔ جس نے اعلان کیا کہ میں الفا اور اومیگا ہوں (انجیل نویسوں نے یہی الفاظ "میں الفا اومیگا ہوں" مسیح کے منہ میں ڈالے ہیں۔ باقی کہانی بھی اساطیر الاولین میں سے ہے۔) یعنی اوّل اور آخر ہوں۔ اور دنیا کا نجات دینے والا ہوں۔ وہ ۲۵ دسمبر کو ایک کنواری کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ اور جمعہ کے دن ایسٹر سنڈے سے پیشتر مصلوب ہوا۔ اور تیسرے دن جی اٹھا۔ پولوس اور اس کے ہمخیالوں نے یہ سارا ڈراما اسی کی روایتی زندگی سے نقل کر لیا۔ اور کیسی عجیب بات ہے۔ کہ قرآن مجید نے عین اسی موقعہ پر یہ راز فاش کیا جبکہ مسیحیت میں یہ ڈرامہ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔

آمدم برسر مطلب، کسی نبی کو نمونہ کامل ثابت کرنے کیلئے چند باتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ پہلے تو اُس فرض منصبی کی اہمیت کا اندازہ لگانا چاہیئے۔ جو اس کے سپرد کیا گیا ہو۔ اس کے بعد اس کی شخصیت کیونکہ کسی شخص کی فضیلت کے اثبات میں اس کی شخصیت بڑی حد تک معاون ہوتی ہے۔ اور تیسری بات اس کا کیریکٹر یعنی خصائص،

طبعی جو گلدستۂ صفات حسنہ ہونا چاہیئے۔ تاکہ دوسرے لوگوں کے لئے کافی نمونہ ہو سکے۔ ان کے علاوہ اس میں اس قدر استقلال اور ارادہ کی پختگی ہونی چاہیئے کہ شدید ترین مصائب دُنیوی اس کو متزلزل نہ کر سکیں۔ نیز ایک افضل ترین نبی کے لئے بہترین مزکّی ہونا بھی ضروری ہے۔ تاکہ وہ ان اصولوں کی عملاً تلقین کرے۔ جن کی مدد سے بنی نوع آدم ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکیں۔ نیز اس کے لئے اعلیٰ ترین مفسر اور شارح ہونا بھی ضروری ہے تاکہ وہ ہر بات کھولکر سمجھا سکے اور اس کی تعلیم میں ایسی وضاحت ہو کہ ہر درجہ کے تمدن کیلئے کارآمد ہو سکے۔ نیز اس کیلئے اسوۂ حسنہ ہونا بھی لازمی ہے۔ تاکہ وہ اپنی تعلیمات کو عملی جامہ پہناکر پبلک کے سامنے پیش کر سکے۔ کیونکہ عمل بہرحال قول سے بہتر ہے۔ اور اعمال، الفاظ سے زیادہ زوردار ہوتے ہیں۔ اور یہی وہ تمام خصائص ہیں جن کی بناء پر ہیں آنحضرتؐ کو خاتم النبین تسلیم کرنے پر مجبور ہوں۔

اب ہم اس بات پر غور کریں گے کہ برگزیدہ اشخاص پر نبوت کی چادر کس مقصد کیلئے ڈالی جاتی ہے سو اس کے متعلق جاننا چاہیئے کہ انبیاء ذاتی اغراض کی تکمیل کیلئے نہیں آتے۔ اور نہ اس لئے کہ لوگ انہیں اپنا معبود قرار دے لیں۔ اور نہ اس لئے کہ الوہیت کا دعوے کریں۔ بلکہ وہ تو خدا تعالیٰ کی طرف سے کچھ پیغام لاتے ہیں۔ اور اپنے طرز عمل سے اس کی وضاحت کر دیتے ہیں۔ جو احکام ان پر القاء کیے جاتے ہیں ان پر وہ سب سے پہلے خود عمل کرتے ہیں۔ اور دوسرے آدمیوں کو ان پر کاربند ہونے کی ترغیب دیتے ہیں گویا قولِ خدا اور فعل رسول دونوں مل کر انسان کی ہدایت کا موجب ہوتے ہیں۔ اور اگر ان دونوں باتوں کی اصلیت قائم رہے۔ اور سچائی کے ساتھ، اس رسول کے متبعین اوّل ان کو ہم تک پہنچا دیں تو نہ کسی نئے الہام کی ضرورت ہے اور نہ کسی نئے نبی کی۔ لیکن آنحضرتؐ سے پہلے جو کچھ بھی نازل ہوا۔ انسانی غفلت کی وجہ سے ملوث و محرف ہو گیا۔ خود اسلام سے پہلے انبیاء کے سوانح حیات ہی پر تاریکی کا پردہ پڑ گیا۔ اور جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں ان کے متعلق ہماری معلومات بہت ہی محدود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نزولِ قرآن مجید اور بعثت رسول کریمؐ دونوں امور عین انسانی ضرورت کے موافق ہیں۔ اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ قرآن مجید آج بھی وہی ہے۔ جو آنحضرتؐ کے وقت میں تھا تو پھر آیندہ نہ کسی کتاب کی ضرورت ہے نہ کسی نئے نبی کی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ہم قرآن مجید کو خدا تعالیٰ کی آخری کتاب کہتے ہیں۔ اور آنحضرتؐ کو خدا تعالیٰ کا آخری نبی اور رسول۔ آپ کی صفت ختمیت کا اصلی سبب آپ کی شخصیت نہیں بلکہ وحی الٰہی کی ختمیت ہے۔

جبکہ قرآن مجید میں ہماری ہدایت کے لئے کافی و دافی سامان موجود ہے، اور وہ سامان کامل بھی ہے۔ اور الٰہی مرضی کے عین مطابق اس صورت میں نئی نبوت تو محض بلیو دتکرار اور ہیچ ثابت ہوگی۔ فی الجملہ مذہب کا مقصد انسان کو خدا سے واصل کرتا اور انسان کو بہیمیت سے بلند کر کے الوہیت کی سرحد تک پہنچا دینا ہوتا ہے۔ اس نظریہ کے ماتحت ختمیت وحی بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے ممکن ہے کہ دو نقطوں کے درمیان کئی راہیں قائم ہوں۔ کوئی سیدھی کوئی ترچھی لیکن یہ بھی تو ہے کہ ایک خط سب سے چھوٹا یعنی بالکل مستقیم ہوگا۔ قرآن مجید نے اس مذہب کا نام جس کی وہ تعلیم دیتا ہے، صراطِ مستقیم رکھا ہے۔ صراطِ مستقیم کے لغوی معنی ہیں "سیدھا راستہ" اور اگر یہ بات قرینِ عقل ہے کہ انسانی ہدایت کے لئے جو صراط یعنی راستہ وحی الٰہی کی معرفت دکھایا جائے گا۔ وہ سب سے چھوٹا ہوگا۔ اور اس سے زیادہ چھوٹا ہو نہیں سکتا۔ تو یہ بات بھی قرینِ عقل ہے کہ کسی نبی پر وہ "صراطِ مستقیم" وحی کی جاسکتی ہے۔ پس اِس طرح ختمیت الہام بھی ثابت ہوگئی۔ استدلال کا سارا زور اس بات پر منحصر ہے۔ کہ فلاں نبی نے جو راستہ دکھایا۔ وہ مستقیم ہے یا نہیں۔ اور اسی میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اگر وہ راستہ مستقیم ہے تو پھر اس نبی کا قول بھی قولِ فیصل ہے۔ اور اس معنی کے لحاظ سے میں کہہ سکتا ہوں کہ آنحضرت صلعم آخری نبی تھے۔ آپؐ اپنے زمانہ سے صدیوں آگے تھے۔ آپؐ تمام زمانہ کے لئے نبی ہیں۔ اور ہر درجہ کے تمدن اور تہذیب کیلئے ہادی۔ جو حقائق آپؐ نے اپنے زمانہ میں تعلیم فرمائے تھے۔ لوگ آج انھیں قبول کرتے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر اینی بیسنٹ لاکھ پکارا کریں۔ کہ "ستارۂ مشرق" کے طلوع کا وقت آن پہنچا ہے۔ مگر اس سے ہوتا کیا ہے؟ قطع نظر اس امر سے کہ مشرقی انبیاء مذہبی امور میں کبھی دوسرے کے مقلد نہیں ہوئے۔ اور نہ اس معاملہ میں کسی کی شاگردی کی۔ جیسے ستارۂ مشرق کے متعلق خیال کیا گیا ہے۔ اگر ممکن ہو تو ڈاکٹر صاحبہ کسی ایسی حقیقت کا اعلان کریں۔ جو قرآن مجید میں مذکور نہ ہو۔ علاوہ بریں میں اپنے ناظرین کی توجہ اس کتاب کے ایک خاص باب موسومہ "بہترین معلم دینی" کی طرف مبذول کرانی چاہتا ہوں تاکہ وہ ان امور پر غور کریں جن پر کافی شرح و بسط کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ اور خود فیصلہ کریں۔ آیا وہ حقائق ثابتہ تہذیب و تمدن کو ترقی دینے کی صلاحیت کافی رکھتے ہیں یا نہیں؟ یا ان میں کسی اصلاح کی گنجائش ہے؟ صاف ظاہر ہے کہ جب ہم حقائق سے بحث کرتے ہیں تو امکانات سے قطع نظر کرنا پڑتا ہے۔

بابِ سوم

آنحضرت صلعم سے پہلے دنیا کی حالت

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (الروم) ۳۰ : ۴۱

"زمین اور سمندروں میں فساد ظاہر ہو گیا۔ لوگوں کے اعمال کی وجہ سے"

اِعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (الحدید) ۵۷ : ۱۷

"جانو کہ اللہ تعالیٰ زمین کو اس کی موت کے بعد دوبارہ زندگی دیتا ہے"

مندرجہ بالا آیات میں قرآن مجید نے اُس خرابی کا ذکر کیا ہے جو آنحضرت صلعم کی بعثت سے قبل تمام روئے زمین پر ظاہر ہو گئی تھی۔ بنی نوع آدم پر ذہنی اخلاقی اور روحانی موت وارد ہو چکی تھی۔ ہر جگہ تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے عقاید صحیحہ کو پوشیدہ کر دیا۔ اور اعمال خراب ہو گئے۔ یہودیت مسیحیت بُدھمت اور جملہ مذاہب عالم کا کوئی خوشگوار اثر اپنے معتقدین پر باقی نہیں رہا تھا۔ بقول سر ولیم میور "وہ مسیحیت جو ساتویں صدی میں مروج تھی۔ خود اخلاقاً پست و کمزور ہو چکی تھی" وہ فرقہ بندی اور بدعات کی وجہ سے پارہ پارہ تھی۔ یسوع کا مذہب بُت پرستی کی شکل میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اور عوام الناس کا تخیل مذہبی محض شرک اور بُت پرستی کی ایک خوبصورت صورت تھی۔ علاوہ ازیں اس زمانہ کے مسیحی مُردوں کی ارواح ان کے آثار اور مجسموں کی پرستش بھی کرتے تھے۔ گبن اپنی کتاب "ڈکلائن اینڈ فال آف دی رومن ایمپائر" میں فرماتے ہیں۔

"ساتویں صدی کے عیسائی لوگ غیر شعوری طور پر مشرکانہ عقاید کی طرف لوٹ چکے تھے۔ ان کی تمام نجی اور اجتماعی مرادیں اور منتیں ایسے مذہبی آثار اور اصنام کی خدمت میں پیش کی جاتی تھیں جو کہ مشرقی عبادت خانوں میں ناپسندیدہ تھے۔ خدا کے وجود کو بے شمار شہیدوں، ولیوں اور فرشتوں کے غیر ضروری وسیلوں نے مشتبہ کر دیا تھا۔ سرزمین عرب میں بسنے والے کلوریڈی فرقہ کے لوگوں نے (جو کہ عیسائیوں کے نزدیک کافر تھے) کنواری مریم کو دیوی کے نام اور اعزاز سے نواز دیا تھا۔ تثلیث اور اوتار پرستی کے بے بنیاد عقاید نے خدا

کی وحدانیت کے اصول کو پاش پاش کر دیا تھا۔ اپنی خام خیالی میں انہوں نے تین ہم پلہ معبود ایجاد کر لئے تھے۔ او رمسیح جو محض ایک انسان تھا۔ اسے ابن اللہ بنا دیا تھا۔ راسخ العقیدہ عیسائی مبلغوں کی تشریح محض با عقیدہ ذہن کو مطمئن کر سکتی ہے ۔۔۔۔۔ لیکن محمدؐ کا عقیدہ اس قسم کے غیر واضح خیالات اور توہمات سے بالکل پاک ہے۔ اور قرآن دراصل خدا کی وحدانیت کا عظیم الشان ثبوت ہے۔"

دوسری دنیا کی اخلاقی اور تمدنی حالت بھی اسی طرح ابتر ہو گئی تھی۔ پیروانِ مذاہبِ مذکورہ نہ صرف نکوکاری سے دُور رہتے تھے۔ بلکہ بدکاری کو نیکی سمجھتے تھے۔ اور لوگ بدترین گناہوں کے اس لئے مرتکب ہوتے تھے۔ کہ خداوند کی نگاہوں میں عزت حاصل کریں۔ ہر قوم اخلاقی ذلت کے انتہائی گہرے گڑھے میں گر چکی تھی۔ اور براعظموں اور جزائر غرضیکہ تمام عالم میں خرابی رونما ہو چکی تھی۔ ممکن ہے کہ یہ بیان بعضوں کو حیران کر دے۔ لیکن یہ حقیقت ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جبکہ یورپ جہالت کے تاریک ترین پردوں میں پوشیدہ تھا۔ اور ایران میں مزدکی اور ہندوستان میں پرانوں کے عقاید کا دور دورہ تھا۔ فعلِ زنا جو اپنے خوفناک نتائج کے لحاظ سے قتل سے دوسرے درجہ پر ہے۔ اکثر مقدس رسوم کا ایک لازمی جز قرار پایا تھا۔ اور اس ناپاک فعل کا ارتکاب مذہب کی اجازت سے کیا جاتا تھا۔ جب مسیحی مرد عورتیں اتوار کے دن کیتھولک پادری کے پاس کنفیشن تخلیہ میں جا کر اپنے گناہوں کا اقرار کرتی تھیں تو جس قدر گناہ معاف ہوتے تھے۔ اُن سے کہیں زیادہ لاحق ہو جاتے تھے۔ سیّد امیر علی مرحوم اسپرٹ آف اسلامؔ میں لکھتے ہیں۔

"مسیحی دنیا کی مذموم اخلاقی اور دینی حالت کا نقشہ صرف ایک مسیحی شہر یعنی قسطنطنیہ کی اس حالت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ جو جسٹینین جیسے شان و شوکت والے مسیحی تاجدار اور قانون ساز کے دوران حکومت میں تھی۔ لوگوں کے معیار میں خانگی یا شہری نکوکاری کی کوئی قدر و منزلت باقی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ ایک زنِ فاحشہ قیصر روم کے ساتھ تختِ سلطنت پر جلوہ گر تھی اور کوئی معترض نہ ہوتا تھا۔ تھیوڈورا وہ عورت تھی جس نے شہر قسطنطنیہ میں علانیہ طور پر زانیہ کا لقب حاصل کیا تھا۔ اور اُس کی عیاشی اور بدکاری کے افسانے زبان زد خلائق تھے۔ لیکن جب وہ ملکہ بن گئی تو بڑے بڑے قاضیوں دیندار اُسقفوں، فاتح سپہ سالاروں اور مفتوح بادشاہوں غرضیکہ تمام مسیحی دنیا نے اسے اپنا حاکم اور آقا

تسلیم کرلیا۔ اُس کا ظالمانہ طرزِ عمل سلطنت کے دامن پر ایک بدنما داغ تھا۔ اور اس کی نظر میں نہ اخلاق کی کوئی وقعت تھی نہ مذہب کی۔ چنانچہ بغاوتوں، بلوؤں، خونریز ہنگاموں اور طوفان بدتمیزیوں کا بازار گرم ہو گیا اور پادری لوگ ان امور میں دل کھول کر حصہ لیتے تھے۔ ان موقعوں پر ہر ایک قانون، انسانی یا خدائی بالائے طاق رکھ دیا جاتا تھا۔ گرجوں کی قربان گاہیں بیگناہوں کے خون سے آلودہ ہوا کرتی تھیں۔ اور تمام سلطنت میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی جسے مقامِ امن کہا جا سکتا۔" ایران میں صدیوں بیشتر سے آرٹا زرکسیز مینن نے جو سایرس کا بھائی تھا فیلک[1] عقاید کی نشر و اشاعت کر دی تھی۔ اور اس زمانہ میں مزدک نے ان کی خوب خوب ترویج و حمایت کی۔ چنانچہ اس شرمناک عقاید خصوصی میں یہ عقیدہ بھی شامل تھا۔ کہ ایک عورت کسی مردوں کی زوجہ بن سکتی ہے۔ اُس نے مجملہ شرمناک مناظر اور عیاشانہ طرزِ عمل شرابخوری بدمستی اور بیحیائیوں کی اجازت دے دی تھی۔ ہندوستان میں بھی یہ ناپاک رسم اشتراک فی النساء جاری تھی۔ کیونکہ شکتک مت نے اس فعل کی اجازت دیدی تھی۔ حتےٰ کہ شکتک مذہب کا پروہت اپنی ذاتی دلچسپی کے لئے دوسروں کی ازواج میں شریک ہو سکتا تھا۔ اس خواہش کو ہر شخص جائز سمجھتا تھا۔ اور نئی دلہن عموماً شادی کے بعد پہلا ہفتہ اپنے مذہبی پیشواؤں کی خلوتگاہوں میں بسر کرتی تھی۔ اس کا خاوند اس بیحیائی کو مستحسن یقین کرتا تھا۔ بدیں خیال کہ اس طرح آسمانی برکات ان کے شاملِ حال ہو جائیں گی۔ جس کی وجہ سے ان کی متاہل زندگی عیش و عشرت سے گزرے گی۔ اس زمانہ کی بعض راتیں بدترین بیحیائی کا نظارہ پیش کرتی تھی۔ جبکہ شراب سے مست ہو کر عورت مرد دونوں بدترین گناہوں کے مرتکب ہوتے تھے۔ کیونکہ ان کے عقیدہ میں شکتک بھجن جو اس موقعہ پر گائے جاتے تھے۔ خود ان بیحیائیوں کو شرافت میں متبدل کر دیتے تھے۔ اگر کسی قوم یا ملت کا معیار نکوکاری۔ اس کے تخیل الوہیت سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ہر قوم اپنے خدا یا معبود سے بہترین صفات منسوب کرتی ہے۔ تو اس زمانہ کے ہندو دیوتا بدترین صفاتِ رذیلہ کے مظہر تھے۔ کیونکہ ان دیوی دیوتاؤں کے سوانح حیات گوناگوں بدکاریوں کا مرقع تھے۔

لیکن عرب کا خِطہ ان تمام ممالک سے بڑھا ہوا تھا۔ دنیا کی تاریخ ایسی تاریک زندگی کی نظیر پیش کرنے سے عاری ہے۔ شرابخوری زناکاری قماربازی وہاں کے لوگوں کا شغل ہمیشگی تھا۔ قتل و غارت اطفال کشی اور قزاقی وغیرہ ان کا طغرائے امتیاز تھے۔" ان میں کسی قسم کی اخلاقی یا مذہبی قیود کا پتہ نہ تھا۔ نکاح کی کوئی حد مقرر نہ تھی۔

[1] اعضائے تناسل کی پرستش

طلاق پر کوئی پابندی نہ تھی"، قطع نظر عیاشی اور بدکاری سے، وہ لوگ عموماً فسق و فجور کے عادی تھے۔ بیٹے اپنی بیوہ ماؤں کو اپنی ازواج خیال کرتے تھے۔ شادی شدہ عورتیں غیر مردوں سے ناجائز تعلقات رکھنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتی تھیں۔ بلکہ بسا اوقات ان کا تذکرہ ازراہِ فخر و مباہات کیا کرتی تھیں۔ اور ایک عورت کے جس قدر زیادہ مردوں سے ناجائز تعلقات ہوتے اُسی قدر وہ دوسری عورتوں سے ممتاز خیال کی جاتی تھی۔ انسانی قربانی کا عام رواج تھا۔ بیٹی کو بروقتِ ولادت زندہ دفن کرنا معمولی بات تھی۔ رات دن خانہ جنگی اور خونریز لڑائیوں کا چرچا تھا۔ بات بات پر ایک دوسرے کو قتل کر دیتا تھا۔ لوٹ مار، قتل و غارت اور انتقام کے جذبات اس درجہ ترقی کر گئے تھے۔ کہ جب تک عورتیں اپنے دشمنوں کے خون سے اپنے کپڑوں کو نہ رنگیں چین نہیں آتا تھا۔ مختصر یہ کہ کوئی برائی جو متصور ہو سکتی ہے۔ ایسی نہ تھی جو اُن لوگوں میں موجود نہ تھی۔ اس مذموم حالت میں یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ عرب کے باشندے صورت کے لحاظ سے انسان تھے۔ لیکن عادات کے لحاظ سے حیوانات سے بھی بدتر" یہ وہ تصویر ہے۔ جو گبن نے اس زمانہ کے عربوں کی بیان کی ہے۔ یہ سچ ہے کہ تاریخ عالم کے ہر دور میں بدکاری اور بداخلاقی کا وجود رہا ہے۔ لیکن اُس زمانہ کو بدترین زمانہ کہہ سکتے ہیں۔ جبکہ لوگوں کی اخلاقی حسیات عمیق ترین قعر میں جا پڑی تھیں۔ یعنی جبکہ برائی کو بھلائی سمجھ لیا گیا ہو۔ اگر دنیا میں کسی نبی کی ضرورت تھی تو اس وقت۔ جس طرح تاریکی کے بعد اُجالا اور خشکی کے بعد بارش کا ہونا عین مقتضائے فطرت ہے۔ اسی طرح انسانی بداخلاقیوں کا خاتمہ کرنے کیلئے نبی کا مبعوث ہونا۔ لیکن یہ زمانہ وہ تھا جبکہ تمام دنیا پر بدکاری کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ اور بت پرستی جہالت، توہم اور بیحیائی کا دَور دَورہ تھا۔ نیکی اس دنیا سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی تھی۔ اور بدی کا نام نیکی پڑ گیا تھا۔

اس سے پہلے بھی دنیا میں انبیاء مبعوث ہوئے ہیں۔ لیکن ان کی بعثت کا زمانہ اس قدر تاریک نہ تھا۔ جس قدر آنحضرت صلعم کا۔ اور نہ انبیائے ماسبق کا فرضِ منصبی اس قدر دشوار تھا۔ جس قدر آپؐ کا۔ حضرت موسیٰؑ صرف بنی اسرائیل کی اصلاح کے لئے آئے۔ تاکہ انھیں ارضِ موعود کی طرف لیجا کر آباد کر دیں لیکن اُن کے زمانہ کے مصری تہذیب و شائستگی سے عاری نہ تھے۔ مختلف علوم اور فنون کا چرچا ان میں موجود تھا۔ اِک نظامِ اخلاقیات بھی رائج تھا۔ اور ایک خاص جماعت ساحرین کی اسرار کائنات کے حل

کرنے میں مصروف رہتی تھی۔ مسمریزم بھی انکے ہاں مستعمل تھا۔

اسی طرح یسوع بھی رومی تمدن کے درمیان مبعوث ہوئے تھے۔ اور ان کے زمانہ کا تمدن موجودہ زمانہ کے تمدن سے زیادہ برا نہ تھا۔ اگرچہ وہ لوگ مشرک تھے۔ لیکن ان کے ہم قوم موحد تھے۔ رسم پرستی، لفظ پرستی، ریاکاری، خودبینی وغیرہ یہ عیوب ان کے زمانہ میں بیشک موجود تھے۔ لیکن خدا کی عطا کردہ شریعت سے یہ لوگ ناواقف نہ تھے۔ یسوع صرف اس لیئے آیا۔ کہ انبیاء کے ارشادات اور شریعت کے احکامات کی تعمیل کرائے۔ اور اگر اس زمانہ کی ضروریات اس امر کی متقاضی تھیں کہ موسیٰ اور عیسیٰ جیسے نبی مبعوث ہوں۔ تو چھٹی صدی عیسوی میں اس امر کی ضرورت تھی۔ کہ مختلف ممالک میں مختلف انبیاء مبعوث ہوں۔ اور یا ایسا ہو کہ ایک کامل رسول آئے جو تمام دنیا کو الٰہی پیغام دے۔ کیونکہ احکام خداوندی کی توہین ہر جگہ ہو رہی تھی اور ہر شخص اس کے فرامین کی خلاف ورزی کر رہا تھا گویا اس سے زیادہ تاریک زمانہ دُنیا پر کبھی نہیں آیا تھا لیکن اخلاقی لحاظ سے عرب کے لوگ سب لوگوں سے بدتر تھے لوگ بدترین جرائم کا ارتکاب علانیہ طور پر کرتے تھے۔ اور پھر اُس پر فخر بھی کرتے تھے۔ تمام دنیا کے لوگوں سے زیادہ جاہل تھے۔ با ایں ہمہ قدرت کی طرف سے ان کو اعلیٰ درجہ کا مذاق شاعری عطا ہوا تھا۔ لیکن وہ لوگ اس فن کو صرف اپنے حیاسوز کارناموں کے بیان کرنے میں صرف کرتے تھے۔

اگر اس وقت دُنیا کی اخلاقی حالت اس درجہ پست تھی تو ساتھ ساتھ روحانی اور مذہبی حالت بھی کچھ کم ذلیل نہ تھی۔ ایک مسیحیت ہی کو لے لیجئے۔ اگرچہ بقول ڈین انجی "یسوع نے نہ کسی کلیسیا کی بنیاد رکھی اور نہ کوئی نیا مذہب قائم کیا محض موسیٰ کے مذہب کی اصلاح اس کے مدِنظر تھی" لیکن اس کی وفات کے ایک یا دو صدی بعد وہ خود ایک ایسے مذہب کا مرکز بن گیا۔ جس کے خط و خال، کفریاتِ سابقہ سے مستعار لئے گئے تھے۔ اس سے ہزاروں سال پہلے ہند، روم، یونان، ایران وغیرہ میں جو کچھ مشرکانہ عقاید مروّج تھے وہ سب کے سب مسیح کی سادہ تعلیمات میں شامل کر لیئے گئے۔ اور ایسے ایسے عقاید اس کی ذات سے منسوب کر دیئے گئے۔ جن کا خیال تو خواب میں بھی ان کے دل میں نہ آیا ہوگا۔ خدا کے ایک سچے رسول کو مشرکین کا دیوتا بنا دیا گیا۔ اور اُس کے نام لینے والوں نے اُسے "سورج کا دیوتا" قرار دے کر دل کھول کر اس کی توہین کر دی۔ اور جو رسوم مشرکین عالم کے یہاں مروّج تھے۔ وہ سب کے سب اس کے مذہب کا جزو قرار دیئے گئے۔ حالانکہ اس کا مذہب سوائے اسلام کے اور کچھ نہ تھا مسیحیت اس لیئے نازل ہوئی

تھی کہ بُت پرستی کا ازالہ ہو جائے۔ لیکن وہ خود اس کی غلام ہو گئی۔ پروفیسر لین لکھتا ہے۔
"جسے فلسفہ کہتے ہیں۔ اس نے صرف مسیحی ممالک ہی میں ابتری نہیں پھیلائی تھی۔ بلکہ تمام مشرقی خطے میں الہامی مذاہب کو مغلوب کر لیا۔ وسطی اور مشرقی ایشیا کی سامی اقوام اسی فلسفہ کی بدولت بت پرستی میں مبتلا ہو گئیں۔ گویا محمد (صلعم) کے زمانہ میں تمام ایشیائی اور یورپی اقوام ایک ہی رنگ اصنام پرستی میں رنگین تھیں۔ اور غیر معلوم حصص ارض بھی جیسا کہ اب معلوم ہوا ہے، اسی بُت پرستی میں گرفتار تھے حتے کہ یہودی بھی اس مرض متعدی سے محفوظ نہ رہ سکے۔ مشرکین عرب کے ساتھ انہوں نے کعبہ میں بُت قائم کر لئے۔ اور مشرکانہ رسوم اختیار کر لیں"۔

اس وقت ان تمام کتابوں کی صحت جو خدا کی طرف سے مختلف اقوام کی ہدایت کے لئے نازل ہوئی تھیں، زائل ہو چکی تھی۔ اور انسانی خیالات نے الہٰی تعلیمات کو ملوث کر دیا تھا۔ یہودیوں، فارسیوں ہندوؤں جینیوں اور بودھوں غرض سب لوگوں کی مذہبی کتب مشکوک ہو گئی تھیں۔ بائیبل کا بھی یہی حال تھا۔ اور آج بہت تھوڑے لوگ ایسے ہیں جو ایمانداری کے ساتھ بائیبل کی صحت پر اعتقاد رکھتے ہوں۔ یقیناً اس میں روایات غیر معتبر شامل ہو گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کلیسائے انگلستان کے بہت سے پادری بائیبل پر تمام و کمال ایمان نہیں رکھتے۔ اور نہ اس کے متن کی صحت پر حلف اٹھا سکتے ہیں۔ کیونکہ بائیبل میں بہت سے افسانے ایسے ہیں جن پر ایمان نہیں لا سکتے۔

چنانچہ ۵ جولائی ۱۹۱۷ء کو ایک عظیم الشان مذہبی مجلس میں بعض پادریوں نے یہ تجویز پیش کی کہ جب کسی شخص کو پادری کے عہدہ پر فائز کیا جائے تو اس سے یہ سوال نہ کیا جائے "آیا تم بائیبل کے جملہ نوشتوں پر کامل اعتقاد رکھتے ہو"؟ بالآخر یہ تجویز منظور ہو گئی۔

بہر کیف اگر چھٹی صدی عیسوی میں الہامی کتابوں کی صحت اس درجہ مشتبہ ہو چکی تھی۔ اور خدا کا کلام انسانی افترا پردازیوں کے باعث اس قدر ملوث ہو چکا تھا تو یہ یقین کرنا ناممکن ہے۔ کہ خدا تعالےٰ نے تمام دنیا کو اسی طرح تاریکی میں چھوڑ دینا گوارا کیا ہو۔ بیشک اس نے حسب عادت اپنی مرضی بندوں پر ظاہر فرمائی ہوگی اور اپنی وحی کو دوبارہ پاک کیا ہوگا۔ ضرورت الہام پر روشنی ڈالتے ہوئے قرآن نے اس مسئلہ کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

(البقرۃ ۲ : ۲۱۳)

"سب لوگ ایک ہی جماعت ہیں۔ پس اللہ نے نبیوں کو بھیجا خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے اور ان کے ساتھ حق کے ساتھ کتاب اتاری تاکہ لوگوں میں ان باتوں کا فیصلہ کرے جن میں وہ باہم اختلاف کرتے ہیں اور جنہیں وہ (کتاب) دی گئی تھی۔ انہی نے آپس کی ضد کی وجہ سے اس میں اختلاف کیا۔ اس کے بعد کہ ان کے پاس کھلی دلیلیں آچکی تھیں پس اللہ نے اپنے حکم سے ان کو جو ایمان لائے اس حق کی طرف ہدایت دی جس میں لوگ اختلاف کرتے تھے اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدھے رستہ کی طرف ہدایت کرتا ہے"

اِس آیت کا مطلب بالکل ظاہر ہے۔ اسمیں اس وحی کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو الٰہی مرضی کو دنیا پر ظاہر کرتی ہے۔ مختلف اقوام کو ہدایت دی گئی تھی۔ لیکن انہوں نے اس کی خلاف ورزی کی۔ اور آنحضرت صلعم سے پیشتر انبیاء بھی مبعوث ہوئے۔ لیکن ہر قوم نے انحراف کیا۔ اور ان کی تعلیمات کے متعلق نزاعات پیدا ہو گئے۔ اور سب سے بدتر حالت مسیحیت کی تھی۔ اب یا تو ہر قوم میں ایک ایک نبی آتا جو ان کے اختلافات رفع کرتا یا ایک ہی کامل نبی ایسا ہوتا جو تمام دنیا کو پیغام امن سناتا اور اس صداقت کا دوبارہ اعلان کرتا جو انبیاء سابقین لائے تھے۔ اللہ تعالےٰ کی آخری کتاب نے ان الفاظ میں ساری بحث کا خلاصہ پیش کر دیا ہے

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَمَآ اَنْزَلْنَا

"قسم اللہ کی ہم نے رسول بھیجے کتنے فرقوں میں تجھ سے پہلے پھر سنوارے شیطان نے اُن کے کام سو وہی رفیق ان کا ہے۔ آج اُن کو دُکھ کی مار ہے۔ اور ہم نے اتاری تجھ پر کتاب

عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿

(النّحل) ۱۶: ۶۳-۶۴

اسی واسطے کہ کھول کر سنا دے ان کو جس میں جھگڑ رہے ہیں اور سوجھانے کو اور رحمت ان لوگوں کو جو مانتے ہیں۔"

مذکورہ بالا الفاظ اس قدر صاف ہیں کہ وضاحت کی ضرورت نہیں انمیں دو باتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ شیطان نے ان لوگوں کے افعال ان کی نظر میں سنوار دیئے۔ دوسرے یہ کہ ہر نبی کا مذہب اس کے بعد مختلف فرقوں میں منقسم ہو گیا تھا۔ بیشک شیطان نے ان کے افعال ان کی نظروں میں خوبصورت کر دیئے ہوں گے۔ کیونکہ اس زمانے میں بداعمالیوں کا نام افعال حسنہ ہو گیا تھا۔ اور جملہ مسیحی ممالک میں یہ بات ضرب المثل تھی۔ " آؤ بدی کریں۔ تاکہ خدا کا فضل نازل ہو۔" اور سوائے اسلام کے آج بھی مختلف مذاہب میں ایسے فرقے موجود ہیں۔ جو محض متکبرین فی المذاہب کے خیالات کا عکس خارجی ہیں۔

مسیحیّت میں کم و بیش چار سو فرقے اُس زمانہ میں موجود تھے۔ اور اب بھی ہیں۔ اور مصیبت یہ ہے کہ ان فرقوں میں اصولی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اسلام میں بھی مختلف جماعتیں ہیں لیکن فرقہ کوئی نہیں۔ یعنی ان مختلف الخیال طبقات میں باہم دِگر اصولی اختلافات نہیں ہیں۔ دیگر مذاہب کے فرقے جدید نہیں وہ تو نزول قرآن کے وقت میں بھی موجود تھے۔ دوسرے مذاہب نے اپنی ابتدا سے صدیوں بعد تک اپنی صحت کو قائم رکھا۔ لیکن عیسائیت یسوعؑ کی وفات کے ڈیڑھ سو سال بعد ہی سے نزاعات متعدّدہ کی آماجگاہ بن گئی تھی۔ سچائی ایک ہی ہے۔ اور اس کا رخ بھی ایک ہی ہے۔ لیکن عیسائیت میں تو اس کے سینکڑوں پہلو پیدا ہو گئے تھے۔ کیا ایسی صورت میں خدا تعالےٰ کے لئے خاموش رہنا مناسب یا قرین انصاف تھا؟ اس عالم طبعی میں تو وہ ہر لحہ فساد کو کون دامن ہیں میدل کرتا رہتا ہے تو عالم مذہبی میں ایسا ہونا یقیناً قرین عقل ہے۔ چرچ مین یونین کی آکسفورڈ شاخ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے ڈین انجی نے یہ کہا تھا:۔

"بہت سے پادری شاید دل میں یہ خیال کرتے ہوں گے۔ کہ روشن خیالی کی تحریک کلیسیا میں

فروغ نہیں پا سکتی۔ لیکن وہ لوگ برائے خدا اس بات پر تو غور کریں کہ اگر کلیسیا کی حدود میں آزاد خیالی کا گلا بالکل ہی گھونٹ دیا جائے تو نتیجہ کیا ہو گا؟ یہی ناکہ ارکانِ کلیسیا کو یہ ماننا پڑے گا۔ کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے۔ اور بہشت ایک جگہ ہے جہاں راستہ معلوم ہونے پر ہوائی جہاز کے ذریعہ سے جا سکتے ہیں۔ اور دوزخ زمین کے نیچے واقع ہے۔ زمانۂ وسطیٰ کے علماء الٰہیات کی طرح یہ بھی ماننا پڑے گا۔ کہ جب سکانِ جہنم میں کثرتِ نفوس کی وجہ سے تلاطم برپا ہوتا ہے۔ تو پہاڑوں سے آتش فشانی ظہور میں آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی سمجھدار انسان ان لغویات کو مدارِ یقین نہیں بنا سکتا۔ اور اگر ان باتوں کا تسلیم کرنا ضروری قرار دیا جائے تو پھر سوائے جاہل بیوقوفوں اور احمق جھوٹوں کے اور کوئی شخص عیسائی نہیں رہ سکتا۔ کوئی پادری جو "تحریک جدید" سے واقف ہے۔ یہ نہیں مانتا کہ اوائل مسیحیت میں جو باتیں عقاید میں داخل کی گئی تھیں۔ وہ اب بھی لائق قبول ہیں۔ بلکہ ان باتوں کو مانتے وقت فلسفۂ جدیدہ اور انکشافاتِ علمیہ اور اختراعاتِ عقلیہ علوم طبیعہ اور تنقید و تاریخ غرضکہ بہت سی باتوں کو مدِّنظر رکھنا ضروری ہے قدیم مذاہب کے متعلق جو تحقیقات ہوئی ہے۔ اس کی بنا پر اب سوائے اس کے چارہ کار نہیں رہا کہ بہت سی پرانی باتوں کو خیرباد کہہ دیا جائے۔ اور اکثر پرانے عقاید کو مذہب سے خارج کر دیا جائے۔"

لیکن "قدیم عقاید" تو چھٹی صدی عیسوی ہی میں موجود تھے۔ اور بہشت و دوزخ کے متعلق بھی وہی خیالات مروج تھے۔ جن کا اوپر ذکر ہوا۔ تو کیا یہ بات قرینِ عقل ہے۔ کہ اگر یسوع فی الواقعہ خدا کے پاس سے پیغام لایا تھا تو خدا نے اس کی کلیسیا میں اٹھارہ سو سال تک سوائے بیوقوفوں اور جھوٹوں کے اور کسی سمجھدار آدمی کی جگہ نہ رکھی ہو۔ اور اتنے عرصہ تک پادری مذکور کا انتظار کیا ہو کہ وہ تحریک تجدید ملت عیسوی کے ضمن میں اس کلیسیا کی اصلاح کرے۔ اس سلسلہ میں تحریک مذکور کی تجاویز کا ذکر خلافِ محل نہ ہو گا۔ ۱۹۱۵ء سے عمایدین کلیسیا ہر سال ایک جلسہ منعقد کرتے چلے آئے ہیں۔ تاکہ عقاید عیسوی کی اصلاح کی جائے ان لوگوں کے عقاید حسب ذیل ہیں:۔

(۱) یسوع صرف ایک انسان تھا۔ کسی پہلو سے بھی خدا نہ تھا۔ ملاحظہ ہو قرآن مجید ۱۹۔ ۹۰ تا ۹۳

(۲) اس کی ابنیت سے اس کی قربت الی اللہ مراد ہے۔ اور یہ مرتبہ ہر شخص کے لئے ممکن الحصول ہے۔ بیگناہ حمل اور پیدائش بلا پدر یہ دو عقیدے محض اس کی الوہیت کے اثبات کی خاطر وضع

کئے گئے تھے۔

(۳) ہبوط آدم کا عقیدہ غلط ہے ہر شخص یعنی مولود پاک اور بیگناہ پیدا ہوتا۔ اس جگہ ہمارے رسول پاک نے فرمایا۔ کُلّ مولودٍ یولد علی الفطرت الخ

(۴) مسیحیت کے بہت سے رسوم بت پرستوں سے لئے گئے ہیں۔ گناہ ایک امر اکتسابی ہے اور کوئی شخص کسی دوسرے کے گناہ کا بدلہ نہیں ہو سکتا۔ ملاحظہ ہو (قرآن مجید) ۶: ۱۶۴

(۵) یسوع اپنے ہمعصروں کی اغلاط میں شریک تھا۔

(۶) جو کلیسیا آج اس سے منسوب ہے اس کی بنیاد اس نے نہیں رکھی۔

(۷) بائبل تمام وکمال وحی الٰہی نہیں ہے۔ اس میں انسانی خیالات بھی شامل ہو گئے ہیں۔ اور بہت سی ناقابلِ اعتبار روایات بھی اس میں مندرج ہیں۔ اور اگر یسوع نے ان کی طرف اشارہ کیا ہے مثلاً واقعہ یونس تو اس میں یسوع نے بھی غلطی کی جو اس زمانہ کی روایات مُروجہ کو قبول کیا۔

(۸) یسوع صلیب پر نہیں مرا بلکہ بیہوش ہو گیا تھا۔ اور اس کی قیامت روحانی تھی نہ کہ جسمانی قیامت سے مراد "رفع" ہے۔ ملاحظہ ہو قرآن مجید ۳: ۵۴

ازمنۂ وسطیٰ کے عجیب و غریب الٰہیات کے مسائل کو ہم ایک طرف رہنے دیتے ہیں اور کلیسیائے روم کی طرف چند معتقدات کو اسبات کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے۔ کہ وہ شرک و بُت پرستی کا بقیہ ہیں۔ لیکن اگر تحریک جدیدہ کے لئے اس قدر کام ابھی تک باقی تھا تو معلوم ہوتا ہے کہ ریفارمیشن یعنی اصلاح مُعاملات کلیسیا کو سُلجھانے کا موجب نہیں ہوئی بلکہ وہ ایک تحریک سیاسی ثابت ہوئی۔ جس کا منشا حکومت کو کلیسیا کے اقتدار سے آزاد کرنا تھا۔ غالباً اس کا منشاء نائسین کاؤنسل کے فیصلہ کو باطل کرنا تھا۔ جس نے حکومت کو کلیسیا کے ماتحت کر دیا تھا۔ پراٹسٹنٹ مذہب اور بالخصوص کلیسیائے انگلستان زیادہ تر انہی معتقدات کا قائل ہے۔ جو کلیسیائے روم سے تعلق رکھتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ وہ پوپ کی معصومیت اور چند دیگر اُمور کا قائل نہیں۔ لیکن "تحریک جدیدہ" اس تمام عمارت کو گرانے والی ہے جس کے اُوپر موجودہ مسیحیت کی بنیاد قائم ہے اور کلیسیائے مسیح کو اس کی اصلی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جدید خیالات کے حامیوں کے ان کاموں کے متعلق آنحضرت صلعم نے پیشگوئی بھی کی ہے۔

میں ان خیالات میں ایک بات بھی ایسی نتیجہ خیز نہیں دیکھتا۔ جو قرآن کریم میں نہایت صفائی کے ساتھ اور زیادہ معقولیت اور سچائی کے ساتھ بیان نہیں ہوئی ہے۔ میں اس معاملہ میں مسیحی نفسیات کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔ اگر مذہب ایک خدائی نظام ہے جو اس کی طرف سے براہ راست آتا ہے۔ تو "تحریک جدیدہ" کی تمام کوششیں الہام الٰہی کی توہین کا موجب ہیں جو آج تک خاموش رہا۔ تاہم ایک کلیسائی جدید اصلاحات اور اپنے معتقدات میں ترمیم کو نہایت آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔ غالباً وہ ایسی ترمیم کا عادی ہو چکا ہے مغربی کلیسا شروع سے تجدید پر فخر کرتی چلی آئی ہے۔ اگر پولوس کلیسا میں ایسی ترمیمات کر سکتا تھا۔ کہ وہ اس وقت مشرکانہ رسوم اور خیالات کے مطابق ہو جائے۔ اور اس فعل سے اس کی قیادت مذہبی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ تو دورِ حاضرہ کے مذہبی دل و دماغ کے لیے یہ امر زیادہ تکلیف کا موجب نہیں ہو سکتا کہ عیسائی مذہب کو کھینچ تان کر عقلیت پر منطبق کر دیا جائے۔ جیسا کہ تحریک جدید کے حامیوں نے بھی آکسفورڈ کی ایک مجلس میں کنایۃً ظاہر کیا تھا۔

لیکن ہم یہ پوچھتے ہیں۔ کہ اگر اللہ تعالیٰ انسان کی ہدایت کے لیے وقتاً فوقتاً اس سے ہمکلام ہوتا رہتا ہے۔ تاکہ اپنی مرضی اس پر ظاہر کرے۔ اور اس الٰہی قانون کا کوئی عیسائی انکار بھی نہیں کر سکتا۔ ورنہ مسیحیت کا تار و پود بکھر کر رہ جائے گا تو اس معمولہ الٰہی کام کے سرانجام دینے کا حق انسانی کانفرنسوں اور ناقص العمل کونسلوں کو کیونکر حاصل ہو گیا؟ اللہ تعالیٰ اور اس کے کام دونوں غیر قابلِ تبدیل ہیں اس کے تمام قوانین اٹل ہیں۔ دنیا کے تمام مذاہب قدیمہ کا مطالعہ جن میں مذہب یہود بھی شامل ہے اس الٰہی دستور العمل پر شاہد ہے۔ اللہ تعالیٰ کا پیغام ہمیشہ ایک وقت میں ایک مخصوص انسانی واسطہ سے دنیا کو دیا گیا ہے۔ اور جب وہ پیغام انسانی دستبرد کی وجہ سے ساقط عن الاعتبار ہو گیا تو ایک اور پیغامبر، دینِ الٰہی کو اصلی شکل میں پیش کرنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ جناب مسیح بھی اس کام کے لیے آئے اور انھوں نے یہ پیشگوئی بھی کی۔ کہ میرے بعد ایک شخص اور آئے گا جو کامل صداقت کو اہلِ عالم پر ظاہر کر دے گا۔ مگر افسوس کہ کسی نے ان کے پاک الفاظ کی طرف دھیان نہ دیا۔ مشرکانہ مذاہب کے خیالات سے متاثر ہو کر خون سے فضل کے عقیدہ نے اس پرانے اور حقیقی طریق نجات کی جگہ لے لی۔ جس میں مذہبی احکام اور شریعت کی پیروی ضروری تھی الہام الٰہی کا طریق بھی غالباً اسی اثر کی وجہ سے بدل گیا۔ ایک

شخص کو اپنا رسول اور نبی تجویز کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ نے بزعم عیسائیاں پادریوں اور کلیسائیوں کی مجالس کے ذریعہ اپنی مرضی ظاہر کرنی شروع کی۔ لیکن انسانی ساخت کی چیزیں انسانوں کے لیے موجب اطمینان نہیں ہوا کرتیں۔ بشرطیکہ انسان کا دماغ ترقی کرنے سے معطل نہ ہو جائے۔ موجودہ ذہنی انتشار جو مروجہ عقاید کے متعلق مغرب میں پایا جاتا ہے۔ اپنی نوعیت کے لحاظ سے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ کلیسیا کے وجود کے بعد ہر تین چار صدیاں گزرنے پر ایسی ہی بے اطمینانی رونما ہوتی رہی۔ اور ہر ایسے وقت پر مسیحی معتقدات نے شکلِ جدید اختیار کی۔ مسیحی مذہب کو جدید لباس میں پیش کرنے کی یہ تمام کوشش کیا اس امر کا بیّن ثبوت نہیں کہ یہ سب کچھ انسانی کارستانی ہے۔ اور الٰہی سرچشمہ کے ساتھ اسے کوئی تعلق نہیں۔ اگر یہ نظام منجانب اللہ ہوتا تو چاہیئے تھا کہ انسانی دل و دماغ کے منازلِ ارتقائے طے کرنے کے باوجود یہ سب کا سب ویسا ہی مفید اور کارآمد ہوتا جیسا کہ پہلے دن تھا۔ اور ہر نئی ضرورت کو جو آئے دن پیدا ہوتی ہے۔ بوجوہِ احسن پورا کر سکتا۔ کیا صحیفۂ فطرت کا تمام نظام اس امر کی صداقت پر شاہدِ عادل نہیں؟ دنیا کی ہر چیز اتنی ہی پرانی ہے۔ جتنی کہ دنیا تاہم وہ نئی اور تر و تازہ ہے۔ اور انسانی دل و دماغ کے لیے ہر طرح سے اطمینان بخشنے کی قابلیت رکھتی ہے۔ حالانکہ انسانی دماغ روز بروز ارتقائی منازل طے کرتا جاتا ہے۔ لیکن جملہ اشیائے فطرت اپنے اندر افادہ کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن میں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت الرحمٰن بیان ہوئی ہے۔ یعنی ایسا رحمان جس نے انسانی ضرورتوں کے پورا کرنے کے سامان انسان کی پیدائش سے برسوں پہلے تیار کر رکھے تھے۔ عالم الغیب خدا کی شانِ خلاقیت کا تقاضا بھی یہی ہونا چاہیے۔ اسی طرح مذہب اگر خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ تو اسے ایسا جامع ہونا چاہیئے۔ کہ وہ ہر وقت ترقی کرنے والا ہو۔ اور دل و دماغ سے مطابقت کر سکے۔ مسیحیت اس معیار پر ہرگز پوری نہیں اتر سکتی۔ اس لیے اسلامی نقطۂ خیال سے مذہب کہلائے جانے کی مستحق بھی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ مرورِ ایام کی تاب نہیں لا سکتی۔ ہمارا دعویٰ ہے۔ کہ جس مذہب کو قرآن کریم پیش کرتا ہے۔ اس میں مضبوط اور ناقابل شکست خاصیت پائی جاتی ہے۔ اس بات سے قطع نظر کر کے کہ اس میں کہاں تک خوبیاں یا عیوب پائے جاتے ہیں۔ قابل غور بات یہ ہے کہ اس کے متبعین نے اصولی معتقدات میں کبھی کسی ترمیم یا تنسیخ کی خواہش ظاہر نہیں کی۔ خواہ تہذیب و شائستگی علم و عقل کے لحاظ سے

اُن کا پایہ کیسا ہی بلند کیوں نہ ہوگیا ہو۔ اسلام مسیحیت سے بدرجہا زیادہ تہذیب و تمدن اور علمی انکشافات پر فخر کرسکتا ہے۔ اس نے ہمیشہ آزاد تعلیم کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اور مسلمانوں میں جو لوگ علم و فضل و حکمت میں بڑھے ہوئے ہیں۔ وہی اس کی خوبیوں کے زیادہ معترف نظر آتے ہیں۔ ہندوستان کے ایک انگریزی روزنامے نے نہایت تعجب آمیز لہجہ میں یہ حقیقت پیرد قلم کی تھی۔ کہ مغرب کی آزاد تعلیم اگرچہ دیگر مذاہب کی تخریب تنقیص کا موجب ہوتی ہے۔ لیکن وہی تعلیم ایک مسلمان کے ایمان کو مضبوط تر بنا دیتی ہے۔

اس کے علاوہ ایک بات اور ہے جو تحریک جدیدہ کے حامیوں کے لیئے قابل غور ہے۔ موجودہ علمی کاوش اور جدوجہد سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی ہے۔ کہ وہ مذہب جس کی تبلیغ مسیح نے کی تھی۔ اصلی اور مکمل حالت میں ہم تک نہیں پہنچا۔ نیز مسیحیت کے خدا کا اپنا تجویز کردہ علاج انسانی اصلاح میں ناکام ثابت ہوا ہے۔ یہ تو ایک امر مسلمہ ہے کہ جناب مسیح کی تعلیمات ابتداء ہی میں غلط ملط ہوگئی تھیں۔ ہر کوشش جو بعد ازاں اس غرض سے عمل میں آئی کہ مسیحیت دوبارہ اپنی اصلی حالت میں جلوہ گر ہو اگرچہ برائے چندے کامیاب ہوگئی۔ لیکن آیندہ نسلوں نے اپنے عمل سے اس کے ناکارہ ہونے پر مہر ثبت کر دی۔ ایک تباہ شدہ مکان کو اس کے برباد شدہ مسالہ سے دوبارہ تعمیر نہیں کیا جاسکتا۔ ٹوٹی پھوٹی اینٹوں اور گلی سڑی لکڑیوں سے جو باقی رہ گئی ہوں۔ کوئی شخص اس مکان کو دوبارہ اسی شکل میں تعمیر نہیں کرسکتا۔ جو اس کی سابقہ شکل کا مثیل ہو سکے۔ زیادہ سے زیادہ ایک مضحکہ انگیز نقل تیار ہوسکتی ہے۔ جو دیکھنے والوں کو قطعاً متاثر نہیں کرسکتی۔ یا عجیب و غریب تخیلات سے ایک معجون مرکب تیار ہوسکتی ہے۔ جس کی طرف کوئی صاحب عقل سلیم التفات نہیں کرسکتا۔ اور نہ ایسے خیالی مکان میں رہائش اختیار کی جاسکتی ہے۔ پس اگر اُن چیزوں کا جو خود انسانی ہاتھوں سے بنی ہیں۔ یہ حال ہے کہ خود انسان دوبارہ اُن سے کام نہیں لے سکتا۔ تو ان چیزوں کا کیا حال ہوگا۔ جو اللہ تعالےٰ کی بنائی ہوئی ہیں۔ لیکن انسان نے انھیں خراب کر دیا ہو؟ وہ پھل جو ہر گرمی کے موسم میں زمین کے اندر پکتے اور پھولتے ہیں۔ اور پھر گل سڑ کر برباد ہو جاتے ہیں۔ اور اپنے پیچھے سوائے بربادی کے نشان کے اور کچھ نہیں چھوڑتے۔ کیا انسان ان پھلوں کو دوبارہ وہی لطافت اور خوبی عطا کرسکتا ہے؟ وہ عناصر اور ذرات، جن کی مدد سے وہ پھل تیار ہوتے ہیں، خدا تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں۔ اور ہمیشہ باقی رہنے والے ہیں۔ اور کبھی کامل فنا ان پر طاری نہیں ہوتی۔ وہ تمام دنیا کے اندر ایک وسیع اور مختلف الاجزا مجموعہ میں موجود رہتے ہیں۔ اور ہمیشہ سے موجود چلے آتے ہیں۔ ان کی ترکیب کا راز صرف اللہ تعالےٰ ہی کو معلوم

ہے۔ اور جب سال کے ختم ہونے پر ثمرات ارضی برباد ہو جاتے ہیں۔ تو ان کے ذرات ترکیبی اُسی مجموعہ میں واپس چلے جاتے ہیں۔ جہاں سے آئے تھے۔ تاکہ دوبارہ اس میں جذب ہو جائیں۔ اور پھر اللہ تعالےٰ وقت مقررہ پر انھیں بھیجدے۔ تاکہ موسم بہار کے شگوفوں اور گرما کے پھلوں میں اپنی جگہ حاصل کریں۔ یہ اسی خدا کا کام ہے۔ کہ ضرورت کے پیش آنے پر وہ ان کو دوبارہ ترو تازہ کردے۔ اور پھر ان کو اصلی حالت پر لے آئے۔ انسان کی کیا مجال کہ اس الٰہی انتظام میں دخل دے سکے ؟ اب اگر اللہ تعالیٰ کے افعال کی صورت یہ ہے تو کیا اس کا کلام اس صُورت سے باہر ہوگا ؟ اور کیا وہ پیغام جو ہر زمانہ میں وہ اپنے برگزیدہ انبیاء کی معرفت بھیجتا رہا ہے۔ اس کے افعال کے خلاف ہو سکتا ہے ؟ خدا کی آخری وحی میں قرآن کریم کے نزول کے بیان میں اس مظہر فطرت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور اس سے میرے قول کی تائید ہوتی ہے۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ؕ	"قسم اللہ کی ہم نے رسول بھیجے کتنے فرقوں میں تجھ سے پہلے پھر سنوارے ان کے آگے شیطان نے ان کے کام۔ سو وہی رفیق ان کا ہے آج۔ اور ان کو دکھ کی مار ہے۔ اور ہم نے اتاری تجھ پر کتاب اسی واسطے کہ کھولکر سناوے ان کو جس میں جھگڑ رہے ہیں۔ اور سوجھانے کو اور رحمت کے طور پر ان لوگوں کے لئے جو مانتے ہیں"۔

(النحل) ۱۶: ۶۳-۶۴

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝	"اور میووں سے کھجور کے اور انگور کے بناتے ہو اس سے نشہ اور روزی خاصی۔ اس میں نشان ہے ان لوگوں کے لئے جو دیکھتے ہیں"۔

(النحل) ۱۶: ۶۷

اگر مکان شکستہ ہو جائے تو شکستہ سامان سے دوبارہ نیا مکان نہیں بن سکتا۔ اور اگر پھل سڑ جائے تو اس سڑے ہوئے مادہ سے دوبارہ نیا پھل نہیں بن سکتا۔ اور اگر خدا کا کلام خراب خستہ ہو جائے یا انسانوں

کی اغلاط مثلاً طغیان، کفر انکار، تحریف، الحاق، حذف، وغیرہ سے اس کی صحت میں فرق پڑ جائے۔ اس کی طاقت زائل ہو جائے یا اس کا فائدہ مفقود ہو جائے۔ تو کوئی انسان اس محرّف کتاب کو دوبارہ بنی نوع آدم کے لئے فائدہ مند نہیں بنا سکتا۔ جس طرح پھول برباد ہو کر انسانی ہاتھ سے دوبارہ تازہ نہیں ہو سکتے۔ اُسی طرح الٰہی کلام ایک دفعہ برباد ہو کر دوبارہ نفع بخش نہیں ہو سکتا۔ اس کلام کو دوبارہ زندہ کرنا خدا ہی کا کام ہے۔

یسُوع کی تعلیم کا بھی یہی حال ہے۔ کیا ہم انسانوں سے یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ اپنی متحد کوششوں سے اس کو از سرِ نو دریافت کر کے، دوبارہ قابلِ استعمال بنا سکیں گے۔ خصوصاً جبکہ ہر صدی میں علمی ترقیات اس درجہ ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ کہ وہ کوششیں سب بیکار ہو جاتی ہیں۔ یا خدا سے متوقع ہوں کہ وہ اپنی مرضی جس طرح یسُوع سے پہلے انبیاء کی معرفت ظاہر کرتا رہا ہے، یسُوع کے بعد بھی ظاہر کرے؟ اگر آخر الذکر صُورت قابلِ اعتماد ہے تو نئے الہام کی ضرورت تو یسوع کی وفات کے چند صدیوں بعد ہی پیدا ہو گئی تھی۔ اور قرآن اور آنحضرتؐ کا نزول چھٹی صدی عیسوی میں اسی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے ہوا۔

اگر مغرب میں مذکورہ بالا ضرورت آج محسوس کی جا رہی ہے۔ تو اس سے صورت حال بدل نہیں سکتی۔ کیونکہ جو عقیدہ آج غلط ثابت ہو رہا ہے۔ وہ تو بعثتِ رسُول کے وقت میں بھی غلط موجود تھا۔ اور اس کی اصلاح کا مناسب وقت بھی وہی تھا۔ اور اگر ہم یہ بات دیکھیں کہ جو نقائص آج جدید خیالات کے حامیوں کی نظر میں لائقِ اصلاح ہیں۔ قرآن پاک میں اب سے تیرہ سو برس پہلے ان نقائص کا ذکر اور ان کی اصلاح موجود ہے۔ تو کیا ہمارے دل میں قرآن اور اسلام دونوں کے الٰہی کتاب اور مذہب ہونے کا یقین نہیں ہو جائے گا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس باب کو ختم کرنے سے پہلے اس احسانِ عظیم کا بھی تھوڑا سا ذکر کروں جو آنحضرتؐ نے تمام دنیا پر کیا ہے۔ کیونکہ آپؐ نے دنیا میں از سرِ نو توحید کا عقیدہ قائم کیا۔ اور اس وقت جبکہ تمام دنیا اس امر کو فراموش کر چکی تھی۔ اور بدترین قسم کے شرک نے تمام مخلوقات کا احاطہ کر رکھا تھا۔ انڈے کے چھلکے سے لے کر خدا تک ہر شے پتھر، درخت، ہوا، پانی، دریا، بادل، آسمان، زمین، ستارے، چاند، سُورج غرضیکہ کل کائنات خدائے مجسّم تھی۔ اور لائقِ عبادت بلکہ لوگ یہاں تک گر گئے تھے۔ کہ اپنے جذبات اور

شہوات کی بھی عبادت کرتے تھے ۔ اگر ہندوستان میں ہزاروں مورتیاں نفسانی خواہشات کی تکمیل کی خاطر پوجی جاتی تھیں۔ تو عیسائیت میں بھی بہت سے اولیاء اور پیران مزورتوں کے پورا کرنے کے لئے موجود تھے۔ لنگ پوجا عقیدہ[1] کے لوگ اس زمانہ میں بکثرت پائے جاتے تھے ان کے بعض قدیم مندر اب بھی ہندوستان کے بعض حصّوں میں پائے جاتے ہیں ۔ ان مندروں کی دیواروں پر مثلاً بنارس میں نہایت فحش تصاویر بنی ہوئی ہیں جن کو دیکھنے کی کوئی شریف آدمی تاب نہیں لاسکتا۔ شاید دنیا کے پردہ پر اس سے زیادہ بیحیا مناظر دیکھنے میں نہیں آسکتے ۔ اور جو حیا سوز افعال اس زمانہ میں ان مندروں کے اندر کئے جاتے ہونگے ان کا تصوّر کرنا ہمارے لئے کوئی مشکل نہیں ہے ۔ جبکہ یہ سب ناپاک افعال مذہب کے نام سے جائز قرار دیئے جاتے تھے ۔ پس ناظرین غور کریں کہ جس وقت نبی کریمؐ نے توحید کا اعلان کیا اس وقت کی مذہبی زندگی سے کوئی اور تاریک تر زندگی تصوّر میں آسکتی ہے ؟ سویڈن برگ جیسا فاضل اعتراف کرتا ہے کہ واقعی آنحضرت صلعم کی بعثت کے وقت دینداری اور مذہبیت دونوں کا نام دنیا سے اُٹھ چکا تھا ۔

آنحضرتؐ سے پہلے عرب میں تمام مذاہب مثلاً یہودیت مسیحیت صابیت ۔ ستارہ پرستی ۔ بُت پرستی وغیرہ وغیرہ پائے جاتے تھے ۔ لیکن خاص عرب کے لوگ اپنی مخصوص توہم پرستی میں گرفتار تھے ۔ نہ صرف چاند سُورج ہی ان کے معبود تھے ۔ بلکہ کائنات کا ہر ذرّہ ۔ کعبہ جو حضرت ابراہیم کے وقت میں بھی اللہ کی عبادتگاہ تھا۔ اس وقت بُتوں اور مورتیوں کا مخزن بنا ہوا تھا ۔ جس میں ایک نہ دو پورے تین سو ساٹھ بُت رکھے ہوئے تھے یعنی ہر روز نیا معبود ۔ تین بُت 'لات' 'عزّے' اور 'ہُبل' ان تمام بُتوں کے سردار مانے جاتے تھے۔ ان بُتوں کی مختلف شکلیں تھیں بعض انسانوں کی صورت پر تھے ۔ بعض حیوانات کی اور بعض پرندوں کی ۔ علاوہ حیوانات کی قربانی کے بعض والدین ایسے بھی تھے کہ اپنی اولاد کو ان بُتوں کی بھینٹ چڑھا دیتے تھے ۔ تو جب یہودیت اور عیسائیت دونوں جوہر توحید باری سے معرّا ہو چکے تھے ۔ اور عرب سرتاپا تاریکی کے سمندر میں غرق ہو چکا تھا ۔ کیا اللہ تعالےٰ کی رحمت اس ملک کو ایسی خوفناک حالت میں چھوڑ سکتی تھی ؟

اب اس جگہ میں ان مسیحی عقائد کے متعلّق چند باتیں کہنی چاہتا ہوں جو بعثت رسول کریمؐ کے وقت عیسائی دنیا میں مروّج تھے ۔ ابتداءً روم میں عیسائی لوگ بہت قلیل تعداد میں تھے ۔ اور اُن کے خلاف حسدوہ

[1] اعضائے تناسل کی پرستش

مشرکانہ مذاہب صف آرا ہو رہے تھے۔ ان میں بقول پروفیسر پارکنسن ان سب میں متھرا پرستی اشد ترین مخالف ثابت ہوئی۔ چنانچہ دونوں میں جنگ برپا ہوئی۔ مگر یہ جنگ ایسی نہ تھی جیسی اسلام اور بُت پرستی کے مابین ہوئی تھی۔ عیسائیت نے یہ کیا کہ بہت سے نہ تھوڑے ایک دم تمام مشرکانہ عقاید اپنے اندر جذب کر لیئے۔ اسلام کی طرح شرک کا استیصال نہیں کیا۔ ایک شخص بُت پرستوں کے مذہب سے نکل کر عیسائیت میں داخل ہوتا تو اپنے ساتھ تمام سابقہ عقاید بھی لیجاتا اور کوئی معترض نہ ہوتا۔ رفتہ رفتہ تمام مشرکانہ رسوم بھی جزو مذہب ہو گئیں۔ جن میں سیکرامنٹ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اور عیسائیت کے اس طرح مخلوط ہونے کا علم تو اب جا کر عیسائیت کے خیال میں آیا ہے۔" لیکن یہ حقیقت "جسٹن شہید" ہی کے زمانہ میں برافگندہ نقاب ہو چکی تھی۔ چنانچہ اس کی مشہور کتاب "اپولوجیا" کے پڑھنے سے یہ بات عیاں ہو جائے گی۔ تیسری صدی کے وسط میں جبکہ یوحنا کی انجیل جو دوسری صدی کے آغاز میں لکھی گئی۔ عیسائیوں کے دل و دماغ پر حاوی ہو گئی تھی۔ بُت پرستوں نے یہ اعتراض کیا کہ اگر یسوع محض انسان تھا تو پھر اس کی پرستش کیوں کرتے ہو؟ اور اگر وہ خدا تھا تو پھر اس کے مصائب پر آنسو کیوں بہاتے ہو؟

اس اعتراض نے عیسائیوں کے تثلیثی خدا کی ماہیت و نوعیت کے متعلق مختلف عقاید کی بنیاد ڈال دی۔ بعضوں نے کہا کہ "اب" و "ابن" و "روح قدس" تین مختلف اقانیم یا اشخاص نہیں ہیں۔ بلکہ ایک خدا کی شیؤن مختلفہ یعنی قدرت، حکمت اور نیکی ہیں بعضوں نے ان اقانیم ثلاثہ کو افعال سے تعبیر کیا۔ اور قدیم ہندو اور یونانی لوگ بھی اسی قبیل کی تثلیث مانتے تھے۔ بعض یسوع کو فوق البشر خیال کرتے تھے۔ بہرحال یہ معمہ جو تا قیامت لاینحل رہے گا۔ مختلف الخیال عیسائیوں کے لئے اُستخوانِ مخاصمت بن گیا۔ اور ایک فرقہ دوسرے کے گلے پر کند چھری پھیرنے لگا۔ اور تو اور خود گرجوں کے اندر خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ اگر حکومت اس وقت مذہب کی امداد نہ کرتی تو اسی زمانہ میں عیسائیت کا خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ قسطنطین کی فتحیابی، عیسائی مذہب کے لئے زندگی کا خوش آیند پیغام لے آئی۔ اور تھیوڈوسیا نے اس کو پائداری اور استقامت عطا فرمائی۔ لیکن بایں ہمہ مناقشات مذہبی کا خاتمہ نہ ہوا۔ بلکہ دن دوگنی رات چوگنی آگ بھڑکتی گئی۔ ایریئس کا مذہب یہ تھا کہ "ابن" بلحاظ ماہیت ذاتی "اب" سے متغائر الوجود ہے۔ اس پر بشپ

الگزینڈر نے ایریئس کو کلیسیا سے خارج کرا دیا۔ اس کے بعد فرقہ پر فرقہ پیدا ہونے لگا۔ جن میں سے ہر ایک معمائے مذکورہ کا حل پیش کرنے کا مدعی تھا علاوہ ازیں یسوع کی ذات میں الٰہی اور انسانی طبائع کی ترکیب کی نوعیت پر جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا۔ یہ فرد نہ ہوا تھا۔ کہ دوسری بحث یہ چھڑ گئی کہ "روح قدس" کی شخصیت اور مرتبۂ اضافی کیا ہے۔ حتےٰ کہ مینیکی فرقہ نے یسوع اور مسیح دونوں کو ایک کر دکھایا یعنی یہ دعویٰ کیا کہ یسوع کا جسم محض خیالی تھا۔ اس لئے احساسِ جسمانی سے بالاتر تھا۔ مختلف مجالس مذہبی کے فیصلے مختصراً درج ذیل ہیں :-

(۱) کاؤنسل آف نائس منعقدہ ۳۲۵ء نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ ایریئس کا مذہب غلط ہے۔ یسوع فی الواقع خدا ہے۔ اور "باپ" کی طرح ازلی ہے۔ اس کا مدمقابل ہے۔ اس سے جدا بھی ہے۔ متحد بھی۔

(ب) کاؤنسل آف قسطنطنیہ منعقدہ ۳۸۱ء نے اپالونیرلیس کے مذہب کو باطل کیا۔ یعنی یسوع فی الواقع انسان تھا۔

(ج) کاؤنسل آف افیسس منعقدہ ۴۳۱ء نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ یسوع حامل شخصیتین تھا۔ جو منفصل نہیں ہیں۔

(د) کاؤنسل آف چالسڈن منعقدہ ۴۵۱ء نے یہ فیصلہ کیا کہ تاہم وہ دونوں طبائع ایک دوسرے سے متمیز ہیں۔

نسطوریت نے مشرقی سلطنت کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ ہرقل نے ۶۳۱ء میں اس امر کو پیش کر کے دونوں جماعتوں میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی۔ کہ اگرچہ یسوع میں طبائع دو تھیں۔ لیکن "ارادہ" یا "مُرضی" ایک ہی تھی لیکن یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ کیتھولک کلیسیا نے اس امر پر اجماع کیا۔ کہ اگرچہ "ارادہ" ایک نہ تھا۔ دو تھے۔ یعنی تقاضائے الوہیت اور تقاضائے بشریت جدا جدا تھے۔ تاہم ہر معاملہ میں دو تقاضے متحد ہو جاتے تھے۔ قسطنطین دوم نے ۶۸۱ء میں باضابطہ تسلیم کر لیا۔ کہ یسوع کی ذات میں دو تقاضے باہم یک رنگ تھے۔ لیکن اس سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوا۔ بلکہ جہاں دس طرح کی پیچیدگیاں پہلے سے ہی موجود تھیں وہاں گیارھویں کا اور اضافہ ہو گیا۔ مسیحیت اور بت پرستی کے باہمی اتصال اور

قرب کی وجہ سے اور بھی زیادہ ترمیمات ہوئیں۔ رفتہ رفتہ مشرکانہ رسوم اور عقاید مسیحیت میں راہ پاتے گئے۔ اور چھٹی صدی کے آخر میں مسیحیت ویسی ہی مشرک تھی، جیسے اور مذاہب۔ مریم کو خدا کا درجہ دیا گیا۔ ابتداءمیں تثلیث کا عقیدہ ۲۰ دیوتاؤں یعنی باپ اور بیٹا اور ایک دیوی یعنی مریم سے مرکب تھا۔ گرجوں میں مجسمے نصب کئے گئے۔ اولیاء سے استمداد باقاعدہ شروع ہوگئی۔ مقدس پانی کا استعمال جو دراصل ایک مشرکانہ رسم ہے کلیسیا کی رسوم میں مستقل درجہ پاگیا مختصر یہ کہ جب آنحضرت ؐ کا ظہور ہوا تو مسیحیت سرتاپا بُت پرستی اور مشرکانہ عقاید کا مجموعہ بن چکی تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ایسی حالت میں کسی رسول کا آنا خلاف قیاس یا خلافِ عقل ہوسکتا ہے؟ خصوصاً جبکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ موجودہ مسیحی ذہنیت زیادہ تر اسلام سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے آنحضرت ؐ نے خدا کی توحید نہایت استوار طریقہ سے دنیا میں قائم کی۔ اگر مذہب کے نزول کی غایت یہ ہوتی ہے۔ کہ بندوں کو عرفان الٰہی حاصل ہو اور بندے اپنے معبود کی صفات سے آگاہ ہوں تو کیا دنیا کی کوئی تاریخ آنحضرت ؐ سے بہتر کسی شخصیت کا پتہ دے سکتی ہے۔ جس نے مذہب کی خدمت آپ سے احسن اور اعلےٰ طریق پر کی ہو؟

آج "شرک" روبہ تنزل ہے۔ اور توحید مائل بہ عروج۔ حتےٰ کہ تثلیثی عیسائی بھی اور ہندوستان کے بُت پرست دونوں اپنے اپنے خیالات مذہبی کی تاویلات پیش کرتے ہیں۔ اور اعلان کرتے ہیں کہ ہمارے عقاید توحید باری کے منافی نہیں ہیں۔ بہرحال ان تمام باتوں کا سہرا محمد ؐ کے سر ہے۔ کیا میرے یونی ٹیرین عیسائی دوست اس سوال پر غور کریں گے؟ کیا بغیر وساطت آنحضرت ؐ ان کا مذہب محفوظ رہ سکتا یا ان تک پہنچ سکتا تھا؟ بیشک وہ کسی انسان کو خدا نہیں مانتے اور واحد لاشریک خدا کی پرستش کرتے ہیں۔ یسوع بھی یہی پیغام لایا تھا۔ لیکن مدت تبلیغ کی قلت کی وجہ سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا۔ پس اگر وہ یسوع کی عزت محض اس کے مبلغ توحید ہونے کی وجہ سے کرتے ہیں۔ تو کیا وہ آنحضرت ؐ کی عزت میں بُخل روا رکھیں گے۔ یسوع بہرکیف ایک انسان تھا۔ اس سے پہلے بھی بہت سے انبیاء کو انہوں نے تسلیم کیا ہے۔ لیکن اگر محمد ؐ بھی وہی مقصد عالیہ لیکر آئے۔ اور سب انبیاء سے بڑھ کر مقاصد میں کامیابی حاصل کی تو کون شخص ایمان اور صداقت پر قائم رہتے ہوئے آپ ؐ کی نبوت کا انکار کرسکتا ہے؟ بلکہ میں تو ساری دنیائے مذہب سے یہ کہونگا اگر تم لوگ وحی والہام کتب الہامی اور انبیاء پر جو منجانب اللہ بنی نوع آدم کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے ایمان

رکھتے ہو تو تمہیں لازمی طور پر محمدؐ اور قرآن پاک پر ایمان لانا چاہیئے۔

خدا نے اپنی مرضی ظاہر کرنے کے لیئے مختلف لوگوں سے کلام کیا۔ اور اگر مرورِ ایام سے اس کی مرضی مبہم ہو کر رہ گئی۔ تو وہ خدا پھر کلام کر سکتا ہے۔ اور جس طرح ازمنہ سابق میں اس نے مختلف اشخاص کو اپنا پیغامبر بنایا تھا۔ اسی طرح دوبارہ بھی بنا سکتا ہے۔ محمدؐ کی بعثت پر دنیا کی جملہ الہامی کتب محرف ہو چکی تھیں۔ اور وہ کتب اب بھی اسی محرف حالت میں موجود ہیں۔ اور آنحضرتؐ کے علاوہ ابھی تک کوئی شخص ان کی صحت کے لیئے نہیں آیا۔ اگر یہ بات سچ ہے۔ تو غیر مسلم دنیا کے لیے صرف دو ہی راستے کھلے ہوئے ہیں۔ یا تو محمدؐ کو خدا کا نبی اور رسول تسلیم کرے جن کو خدا تعالیٰ نے اپنے فرستادہ مذہب کی اصلاح کے لیئے مبعوث کیا یا جملہ کتب مقدسہ کا نزول خدا کی طرف سے نہ مانے۔ کیونکہ اگر یہ محرف کتب الہامی خدا کی طرف سے ہوتیں۔ تو وہ ان کے محرف ہونے کے بعد ان کی درستی ضرور کرتا۔ چنانچہ قرآن اس معاملہ میں قانون "فطرت" کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور ان الفاظ میں لوگوں کو دعوت الحق دیتا ہے۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ	"اگر ہم کسی چیز کو مٹا دیتے ہیں۔ یا ان کے فواید زائل کر دیتے ہیں۔ تو اس سے بہتر اور اس جیسی چیز نازل کر دیتے ہیں"
(البقرہ ۲ : ۱۰۶)	

خدا کی مخلوقات میں سے اگر کوئی مخلوق زائل یا خراب ہو جاتی ہے تو فوراً اس کی جگہ دوسری نئی چیز آجاتی ہے۔ "ضرورت و فراہمی" کا یہ اٹل قانون تمام دنیا میں جاری و ساری ہے۔ پس روحانی دنیا میں بھی یہی قانون جاری ہونا چاہیئے۔ الہٰی کلام روح کی پرورش کرنے کے لیئے نازل ہوتا ہے۔ اگر سابقہ الہٰی کلام محرف یا ناکارہ ہو جاتا ہے تو اسے دوبارہ اصلی پاکیزگی میں نازل ہونا چاہیئے۔ اور خدا تعالےٰ نے قرآن کے نزول سے اسی مقصد عظیمہ کو پورا کیا ہے۔

باب چہارم

بعثت عظمیٰ | غارِ حرا میں نبوت کی چادر آنحضرتؐ کے دوش مبارک پر ڈالی گئی۔ اور آپؐ کی نبوت کے بعد پہلی وحی ان الفاظ میں نازل ہوئی۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ	"اپنے ربّ کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا اُس نے
خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَاْ وَ	انسان کو خون کی پھٹکی سے پیدا کیا۔ پڑھ تیرا رب
رَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ	بہت عزت والا ہے۔ جس نے لکھنا سکھایا
بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ	قلم سے: اور سکھایا انسان کو جو وہ نہیں جانتا
كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى	تھا۔ نہیں واقعی انسان بہت سرکش ہے۔"

(العلق ۹۶: ۱-۶)

یہ وحی ذاتی یا قومی میلانِ طبع سے قطعاً مبرّا ہے۔ اور بایں ہمہ عظیم الشان اور پُر جلال ہے۔ گویا انسانی بہبود کے لئے بشارت عظیمہ ہے۔ خدا تعالےٰ نے موسےٰؑ سے کوہ سینا پر کلام فرمایا تھا۔ جبکہ انھیں بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دینے کے لئے معین کیا گیا تھا۔ اور موسیٰؑ کی نبوت کی غایت بھی یہی امر تھا۔ اس کے علاوہ ان کا فرض یہ تھا۔ کہ بنی اسرائیل کو حکمران اور فاتح قوم بنا دیں۔ لیکن اس مقصد میں وہ کامیاب نہ ہوسکے۔ فی الجملہ آپؑ کی نبوت مختص بالقوم تھی۔ ان کے بعد حضرت عیسیٰؑ کا زمانۂ نبوت آیا اور رُوح قدس آسمان سے فاختہ کی شکل میں ان پر نازل ہوئی۔ ان کا پیغام یہ تھا کہ ابن آدم ابن اللہ ہے۔ جس سے اس کا باپ بالکل راضی ہے۔ ابتدائے نبوت میں جو پیغامات موسےٰؑ اور عیسیٰؑ کو خدا تعالےٰ کی طرف سے موصول ہوئے۔ ان پر میں سر دست کوئی تفصیلی بحث نہیں کرنا چاہتا۔ اس قدر کہنا کافی ہوگا۔ کہ اول الذکر کی تبلیغ رسالت صدہا اقوام میں سے ایک برگزیدہ قوم سے مختص تھی۔ اور ثانی الذکر نے ایک خاص شخصیت کی ذاتی رفعت کا تذکرہ کیا۔ اور اس کا مقصد واحد جیسا کہ جناب مسیحؑ نے خود بیان کیا۔ گم شدہ اسرائیلی اقوام کو راہ راست پر لانا تھا۔

لیکن آنحضرتؐ کی رسالت بالکل جداگانہ نوعیت رکھتی ہے۔ وہ انفرادی یا قومی مفاد سے قطعاً بالاتر ہے۔ اس میں انسان کا ذکر بلحاظ نوع کیا گیا ہے۔ اس میں وہ ارفع ترین مقصد جو انسان کے لیے ممکن الحصول ہے بیان کیا گیا ہے۔ اور اس مقصد کے حصول کے طریقے بھی بتائے گئے ہیں۔ اس وحی میں فن نوشت و خواند کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو بذریعہ قلم حاصل ہوتا ہے۔ اور ان علوم کی تحصیل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جو آنحضرتؐ کے زمانۂ مبارک میں غیر معلوم تھے۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے۔ "سکھایا انسان کو جو وہ نہیں جانتا تھا"۔ پس یہ پیغام ایک عالمگیر شان رکھتا ہے۔ اور کل بنی نوع آدم پر حاوی ہے۔

نبی کریمؐ کی بعثت کے وقت دنیا کے حالات ایک عالمگیر پیغام کے متقاضی تھے۔ حضرت عیسیٰؑ و حضرت موسیٰؑ وغیرہم کی ایام بعثت میں اس قسم کے حالات موجود ہی نہ تھے۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے بشپ آف لنڈن کے اس قول کا مطلب ہماری سمجھ سے یقیناً باہر ہے۔ کہ خدائے قدیر عین وقت ضرورت پر یسوع کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اگر بشپ مذکور اب سے دو ہزار سال پہلے کے حالات سے صحیح طور پر باخبر ہوتا تو شاید اُسے خود بھی اپنا یہ قول مہمل ہی معلوم ہوتا۔ اگر یسوع انسانوں کو گناہ اور اس کے عواقب سے نجات دینے کے لیے آیا تھا۔ تو سوال یہ ہے کہ اس وقت کی بجائے وہ چھ صدی بعد کیوں نہ آیا۔ جبکہ بدکاری اور گناہ دونوں اپنے انتہائی عروج کو پہنچے ہوئے تھے۔ کیونکہ نبی کریمؐ کی بعثت کے وقت جیسا کہ ہم دکھا چکے ہیں۔ عین یہی حالت تھی۔ تو دنیا کے نجات دہندہ کی آمد کے لیے اگر کوئی مناسب وقت تھا تو وہ تھا۔ لیکن اگر یسوع کی آمد کا مقصد وہی قرار دیا جائے جو عام طور پر مشہور ہے تو پھر تو مذاہب باطنیات اس سے بہت پہلے اس مقصد کے حامل موجود تھے۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ مسیح نے آکر اُسی داستان پارینہ کو دہرا دیا۔ اس کی آمد کے وقت ایران، چین اور ہندوستان بانیانِ مذاہب کے زیر اثر تھے۔ یعنی زرتشت، کنفوشس اور بدھ۔ آخرالذکر کا زمانہ یسوع سے پانچ صدی قبل تھا۔ ہاں اگر کسی مصلح کی ضرورت تھی تو ملک شام میں اور کسی ملک میں مطلق نہ تھی۔

قطع نظر اُمور دیگرہ کے خود یہ تین پیغام قابل غور ہیں۔ جو ان تینوں انبیاء کو دیئے گئے اس کے بعد انسان خود ہی آنحضرت صلعم کی علوم مرتبت کا معترف ہو جاتا ہے۔ جہاں تک دنیائے کون و فساد کا تعلق ہے۔ اس میں فطرت کا بہترین کارنامہ حضرت انسان کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ نشو و نماء طبعی جسم

انسانی میں آکر اپنے منتہائے کمال کو پہنچتی ہے اور جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے ۔ یہ سب کچھ ایک خون کی پھٹکی سے بنتا ہے ۔ وہ خدا جس نے انسان کو ایک خون کی پھٹکی سے بنایا ہے ۔ اب اس کو روحانی اخلاقی اور ذہنی بلندی پر پہنچانا چاہتا ہے ۔ نسل انسان کو محمدؐ کی معرفت اپنے اس ارادہ سے مطلع کرتا ہے اور پہلی ہی وحی میں اس بلندی کے حصول کا طریقہ سمجھا دیتا ہے ۔ یہ پیغام رب کی طرف سے آیا ہے ۔ جس کا ترجمہ انگریزی میں غلط طور پر لفظ لارڈ سے کیا جاتا ہے ۔ وحی کی اصلی عبارت یوں ہے " پڑھ اپنے رب کے نام سے " الخ اس میں لفظ " رب خصوصیت کے ساتھ قابل غور ہے ۔ اس لفظ کی تشریح کرتے ہوئے تقدس مآب مولانا محمد علی صاحب ایدہ بنصرہ مفسر و مترجم قرآن مجید نے یہ عبارت سپرد قلم فرمائی ہے ۔

[عربی لفظ " رب " میں نہ صرف پالنے پوسنے پرورش کرنے اور پروان چڑھانے کے معانی پائے جاتے ہیں ۔ بلکہ تدبیر انتظام اور تکمیل کے معانی بھی موجود ہیں ۔ یعنی " رب " اس ہستی کا نام ہے ۔ جو کسی شے کو ابتدائی مدارج طے کراتی ہوئی بصورت ارتقا تکمیل کو پہنچائے اور امام راغب کا قول یہ ہے کہ رب کے معنی ہیں پرورش کرنا کسی چیز کو اس طور سے کہ وہ تدریجی طور پر منازل مختلفہ طے کرتی ہوئی نقطۂ کمال تک پہنچ جائے ۔ پس ربّ تمام کائنات کا بانی اور صانع ہے ۔ جس نے نہ صرف ہر شے کو ذرائع پرورش عطا کئے ہیں ۔ بلکہ ہر شے کے لئے قبل از وقت ایک میدان عمل تجویز کر دیا ہے ۔ اور اس میدان میں ترقی کر کے تکمیل حاصل کرنے کے ذرائع بھی مہیا کر دیئے ہیں ۔ پس لفظ " رب " انگریزی لفظ لارڈ سے کہیں زیادہ وسیع المعانی ہے ۔ لیکن افسوس کہ انگریزی میں عربی رب کا کوئی صحیح مترادف نہیں مل سکتا اور یہ لفظ " رب " لفظ " اب " سے بھی بہتر ہے جو محدود المعنی ہے ۔]

اس توضیح سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ " رب " کے معانی دراصل " ارتقاء " کے مفہوم کو پوری جامعیت کے ساتھ اپنے اندر لئے ہوئے ہیں ۔ اس جگہ کوئی یہ نہ خیال کرے کہ میں قرآن کے الفاظ کو جدید خیالات کا جامہ پہنا رہا ہوں ۔ میں تو مذہبی معاملات میں لفظی بحث کو بیحد ناپسند کرتا ہوں ۔ علاوہ ازیں امام راغب نے لفظ " رب " کا یہ مطلب آج سے صدیوں پہلے بیان کیا ہے ۔ اور اس ضمن میں انہوں نے عرب ادباء قبل الاسلام سے استشہاد بھی کیا ہے ۔ اور وہ اس زمانہ میں رہتے تھے ۔ جبکہ " ارتقاء " کے لفظ سے کوئی شخص آشنا بھی نہ تھا ۔ اس کے علاوہ اس لفظ کے معانی بھی جو لین کی عربی لغت سے لئے گئے ہیں " ارتقا ہی

کے مفہوم کو ظاہر کرتے ہیں۔

پس خدا کے پاس سے یہ پیغام بندوں کے نام آتا ہے۔ کہ وہ رب جس نے انسان کی روحانی ترقیات کے لئے مختلف ارتقائی منازل مقرر کر رکھے ہیں۔ اب اپنے بندوں کو ان منازل کے طے کرنے کا طریقہ بتاتا ہے کہاں یہ پیغام جو کُل نسل انسانی کو کمال حقیقی پر پہنچانے کا اشارہ کر رہا ہے۔ اور کہاں وہ پیغام جس میں ایک تو مخصوص القوم اور جس کی غرض بھی دنیوی تعزز اور دوسرے کی انفرادی تعزز۔

قرآن مجید کی ابتدائی آیات میں "اللہ" کی صفت "رب العالمین" بیان کی گئی ہے۔ یعنی مختلف جہانوں یا عالموں کا پیدا کرنے والا پالنے والا اور انھیں ارتقائی منازل طے کرانے والا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیا میں "ارتقا" کا عمل ہر لحظہ جاری ہے۔ اور قرآن مجید اسی خالق ارتقاء کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ تاکہ انسان کو منازل ارتقائی طے کرنے میں مدد دے۔ یہ مسئلہ ان لوگوں کو شاید عجیب معلوم ہو جو کلیسائی عقاید میں گرفتار ہیں۔ لیکن اہل قرآن کے لئے عجب نہیں وہ حیات بخش صداقت جس کا بقول پروفیسر بیکر ایک نامکمل اظہار لفظ "ارتقا" ہے تیرہ صدی پہلے دنیا میں قائم ہو چکی تھی۔ جبکہ قرآن نے لفظ "رب" کو اللہ کی صفت قرار دیا تھا۔ پس اصلی بشارت جس کی تاریخ اخلاقیات اور جس کی فلاسفی کی حقیقت ارتقا کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے قرآن کی شکل میں آئی۔

آج فنڈ مینٹلسٹ ارتقا پسندوں سے برسرپیکار ہیں۔ لیکن ڈارون کے عقاید سے قطع نظر کرتے ہوئے، ارتقاء کا یہ اصول کہ جمیع اشیاء میں موافق حالات کے ماتحت ترقی کی قابلیت موجود ہے۔ تمام کائنات میں جاری و ساری ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ لفظ ارتقاء سے اس حقیقت کا اصلی مفہوم ظاہر نہیں ہوتا۔ قرآن اس کے لئے لفظ "فلاح" کا استعمال کرتا ہے۔ جس کے معنی ہیں کرید کر پوشیدہ چیز کو نکالنا یا ظاہر کرنا۔ یعنی مخفی قوتوں کو بروئے کار لانا۔ بفحوائے قرآن جیسا کہ ابتدائی آیات میں بیان ہوا ہے۔ وحی الٰہی اس لئے نازل ہوئی کہ انسان "فلاح" پائے یعنی خدا کے مقرر کردہ راستہ پر قدمزن ہو۔ اور اس کی مخفی طاقتیں کامل نشو و نما پاکر تکمیل حاصل کریں۔

میں نے یہ باتیں جدید خیالات سے متاثر ہو کر نہیں لکھیں۔ برعکس اس کے قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اسی قسم کی تعلیم دی گئی ہے۔ چنانچہ ذیل میں درج کرتا ہوں۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ۝ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِى الْاَرْضِ ۖ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ۝ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ ۘ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ

(المؤمنون) ۲۳ : ۱۷-۲۰

"اور ہم نے تمہارے اوپر سات رستے بنائے اور ہم مخلوق سے بے خبر نہیں۔ اور ہم نے بادل سے اندازہ سے پانی اتارا۔ پھر اسے زمین میں ٹھیرایا اور ہم اسے اٹھالے جانے پر بھی قادر ہیں۔ پھر ہم نے اس کے ساتھ تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں کے باغ اگائے۔ ان میں تمہارے لئے بہت پھل ہیں۔ اور ان سے تم کھاتے ہو۔ اور ایک درخت جو سینا پہاڑ سے نکلتا ہے۔ وہ روغن اور کھانیوالوں کے لئے سالن لئے ہوئے نکلتا ہے۔"

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِىْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۗ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۝

(المؤمنون) ۲۳ : ۱۲-۱۶

"اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے اسے ایک مضبوط ٹھیرنے کی جگہ میں نطفہ بنا کر بھیجا۔ پھر ہم نے نطفہ کو لوتھڑا بنایا۔ اور لوتھڑے کو گوشت کا ٹکڑا بنایا۔ اور گوشت کے ٹکڑے میں ہڈیاں بنائیں اور ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر ہم نے اسے ایک اور پیدائش دے کر اٹھا کھڑا کیا۔ پس اللہ بابرکت ہے (جو) سب بنانے والوں سے بہتر (ہے) پھر تم اس کے بعد یقیناً مرنے والے ہو۔ پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔"

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ
فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ
عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ
لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ
لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓى
اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ
فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى
وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ
وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ
رٰعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ
يُحَافِظُوْنَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ
الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ
فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (المؤمنون) ۲۳: ۱-۱۱

"مومن یقیناً کامیاب ہیں۔ جو اپنی نمازوں میں
عاجزی کرنے والے ہیں۔ اور جو لغو سے منہ
پھیرنے والے ہیں۔ اور جو پاکیزگی کے لئے کام
کرنے والے ہیں۔ اور جو اپنی شرمگاہوں کی
حفاظت کرنے والے ہیں۔ مگر اپنی بیویوں
سے یا ان سے جن کے ان کے داہنے ہاتھ مالک
ہوئے تو وہ ملامت کئے گئے نہیں۔ لیکن
جو اس سے آگے نکلنا چاہیں۔ وہ حد سے
بڑھنے والے ہیں۔ اور جو اپنی امانتوں اور
اپنے عہد کا پاس رکھنے والے ہیں۔ اور جو اپنی
نمازوں کی محافظت کرتے ہیں۔ یہی وارث ہیں
جو فردوس کو ورثہ میں لیتے ہیں، وہ اسی
میں رہیں گے۔"

یہ آیات جو قرآن مجید کی تئیسویں سورت کے پہلے رکوع میں وارد ہوئی ہیں۔ انسان کی پیدائش کی ابتدائی حالت، اور اس کی حیات ارضی اور حیات بعد الموت کا ذکر کرتی ہیں۔ قرآن میں کئی جگہ پر سات منازل نشو و نما کا مذکور ہے۔ آیات بالا کا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی چیز اُوپر سے آتی ہے۔ اور زمین میں قرار پاتی ہے۔ پھر یہ مختلف نباتاتی حالات سے گزرتی ہوئی ارتقائی کیفیت کے ماتحت جوہر حیات کی شکل اختیار کرتی ہے۔ اس لحاظ سے آیاتِ مذکورہ بالا ان اشیاء (یعنی کھجور انگور زیتون اور دیگر ثمرات) کا خاص طور سے ذکر کرتی ہیں جن سے جوہر حیات پیدا ہوتا ہے۔ ان سے ہی نطفہ بنتا ہے۔ جس کے لیے رحم مادر میں سات ارتقائی منازل ہیں۔ ان کے طے ہونے پر ایک مختلف ذی حیات مخلوق ظہور میں آتی ہے۔ یعنی نفس ناطقہ۔ آگے چل کر یہی نفسِ ناطقہ اور سات ارتقائی منازل سے گزرتا ہے۔ تاکہ سات عقلی اور اخلاقی صفات کی تکمیل حاصل ہو جائے۔ پھر جب ہم اس نصاب ارضی کی

تکمیل کرلیں گے۔ تو بہشت کے اصلی وارث قرار پاجائیں گے۔

بازآمدم بر سرِ مطلب انسان نے وہ تمام خوبیاں جو آج موجود ہیں۔ علم اور سائنس کے ذریعہ حاصل کیں۔ یہ سائنس ازمنہ قدیم میں کسی کو معلوم نہ تھا۔ اسی لئے اسکو سائنس جدید کہتے ہیں۔ قرآن مجید بھی یہی کہتا ہے۔ وہ اس علم کا تذکرہ کرتا ہے۔ جو آنحضرتؐ سے پہلے انسان کو معلوم نہ تھا۔ اور یہ بات کہ سائنس جدید کی بنیاد مسلمانوں نے رکھی۔ جس میں بعدازاں ترقی ہوتی رہی، اس پیشگوئی کی نہایت زبردست مؤید ہے۔ جو بواسطہ آنحضرتؐ پہلی وحی کی صورت میں دنیا سے کی گئی تھی۔ بلاشک اسلام سے پہلے بھی دنیا میں نوشت وخواند کا سلسلہ جاری تھا۔ لیکن اس زمانہ میں یہ فن خانقاہوں اور معابد تک ہی محدود تھا۔ عوام الناس اس فن سے خبردار نہ تھے۔ اور خبردار بھی کس طرح ہوتے۔ جبکہ اسلام سے پہلے کاغذ کا استعمال ہی کسی کو معلوم نہ تھا۔ قدیم زمانہ میں تو جانوروں کے چمڑے پتھر کی تختیاں چوڑی ہڈیاں درختوں کی پتیاں لکھنے میں استعمال ہوتی تھیں۔ اور ظاہر ہے کہ محض ان چیزوں کی بدولت نوشت وخواند میں ترقی نہیں ہوسکتی کاغذ کا استعمال مسلمانوں نے شروع کیا۔ اور اس طرح علم وفن کی تحریک عام ہوئی۔ دراصل تحصیلِ علوم استعمال قلم اور کسبِ فنون جو پہلے معلوم نہ تھے یعنی سائنس جدیدہ یہی تین امور ایسے ہیں جن کی بدولت انسان کو وہ عظمت اور عزت حاصل ہوئی جس کی وجہ سے وہ آج تمام دنیا میں ممتاز ہے۔ میں اس جگہ اس پیغام کا اعادہ کرتا ہوں جو نبی کریمؐ کی معرفت پہلے پہل دنیا کو دیا گیا۔ تاکہ ناظرین فیصلہ کریں کہ جو امور میں نے اُوپر بیان کئے ہیں۔ ان کا تذکرہ ان آیات میں کیا گیا ہے یا نہیں۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ	"اپنے رب کے نام سے پڑھ جس نے
خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ	پیدا کیا۔ اس نے انسان کو خون کی
اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ	پھٹکی سے پیدا کیا۔ پڑھ تیرا رب بہت
الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ	عزت والا ہے۔ جس نے قلم سے لکھنا
عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ	سکھایا۔ اور انسان کو وہ علوم سکھلائے
كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰٓی	جو بیشتر اُسے معلوم نہ تھے۔ بیشک انسان
(العلق) ۹۶: ۱-۶	بہت سرکش واقع ہوا ہے"

ممکن ہے کہ ایک شخص اپنے ہادی یا نبی کی تعریف میں دفتر کے دفتر سیاہ کر ڈالے لیکن واقعات بہرحال واقعات ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آنحضرتؐ کے پیغام کی وسعتِ عمل اور عظمت ذاتی کے سامنے موسیٰؑ اور مسیحؑ کے پیغاموں کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔ اور واقعات آیندہ نے ان دعاوی کی صداقت آشکارا کر دی۔ موسےؑ نے واقعی نبی اسرائیل کو مصریوں کی غلامی سے نجات دلائی۔ اور مسیحؑ نے سچ مچ "ہمارے آسمانی باپ" کا گیت گایا۔ لیکن "ہمارے" کے مصداق اور موسیٰ الیہم صرف بنی اسرائیل تھے۔ انہیں صرف اسی قوم سے تعلق تھا۔ وہ بیت المقدس کے لئے روئے اور اس کی بقاء کے لئے اتنے ہی مشتاق تھے۔ جتنی ایک مرغی اپنے بچوں کی بقا کی۔ آیندہ مبلّغین مسیحیت نے اس کے پیغام کا دائرہ اس قدر وسیع کر دیا۔ جس کا خیال بھی اُس کے دل میں نہ آیا ہوگا۔ لیکن اپنی زندگی میں اس نے "موتیوں کو خنازیر کے آگے" کبھی نہ پھینکا اور نہ "بچوں کی روٹی کتوں کے آگے" ڈالی۔ مختصر یہ کہ موسیٰؑ اور مسیحؑ دونوں کا دائرہ عمل محدود تھا لیکن آنحضرتؐ کا پیغام کُل دنیا کے لئے تھا۔[1] اور آپؐ نے اپنی تبلیغ کسی قوم سے مختص نہ کی۔ بلکہ ہمیشہ بنی آدم کو خطاب فرمایا۔ علاوہ بریں آپؐ کی بعثت کا مقصد بھی بنی آدم ہی سے مخصوص تھا۔ اگر موسیٰؑ کا کام اپنی قوم کو آزادی دلانا اور مسیحؑ کا کام اسرائیلیوں کو محبت اور حلم کی تلقین کرنا تھا تو آنحضرتؐ کا کام ایسا تھا۔ جس کے بغیر نہ آزادی مفید ہو سکتی ہے۔ اور نہ محبت و حلم کام دے سکتا ہے۔ انسانیت میں ایک چیز ایسی بھی تو ہے۔ کہ اگر اس کی نشو و نما پورے طور پر نہ ہو تو انسان دائرہ حیوانیت میں داخل ہو جائیگا اس سے میری مراد عقل و حکمت اور قوت استدلال ہے۔ آزادی کا احساس جانوروں میں بھی ہے۔ اور وہ اس کے مشتاق بھی ہوتے ہیں۔ ان میں محبت و حلم کا مادہ بھی موجود ہے۔ لیکن علاوہ ان خصوصیات کے انسان کو وہ چیز بھی عطا کی گئی ہے۔ جو جانوروں میں نہیں پائی جاتی۔ یعنی وہ ایک مخصوص ذہنیت اور شعور ذاتی کا مالک ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے "عقل" کہہ سکتے ہیں۔ نبی کریمؐ کی بعثت کا مقصد عالیہ اس حاسہ عقلی کو ترقی دینا تھا۔ کیونکہ انسانی نسل کی عظمت اسی حاسہ پر منحصر ہے۔ اور اس کام کی تکمیل بغیر نوشت و خواند اور تحصیل علوم نہیں ہو سکتی تھی۔ مقام غور ہے۔ کہ نبی کریمؐ کی پہلی وحی انھیں اُمور کی طرف کیسے بیّن الفاظ میں اشارہ کرتی ہے۔

لیکن جب تک انسان کو اپنی لیاقت و استعداد اور ایسا ہی کم مائگی نقائص کا علم نہ ہو تو ترقی اور

[1] (سبا ۳۴: ۲۸

کامیابی کس طرح حاصل کر سکتا ہے؟ اُسے اپنی ترقی کی حدود اور اُس کے وسائل کا صحیح علم پہلے سے ہونا چاہیئے۔ اُسے اپنے عیوب پر بھی اطلاع اور اُن کو دفع کرنے کے ذرائع سے واقفیت ہونی چاہیئے۔ کیا انسان کو ان دونوں باتوں کے متعلق صحیح معلومات بہم پہنچانے سے کوئی اور بہتر مقصدِ نبوّت سمجھ میں آسکتا ہے؟ لیکن اس معاملہ میں کُل کے کُل قدیمی فلسفے یا تعلیمات مللِ سابقہ، غرضکہ کوئی بات مفید و معاون نہ تھی۔ کیونکہ ان سب نے صرف انسان کی کمزوریوں پر ہی زور دیا کسی نے اس کی استعدادات ترقی اور اس کے حصُول کی طرف انسان کو متوجہ نہ کیا۔ چنانچہ یورپ میں کلیسیاء نے گناہ و بدی کو فطرت انسانی کا جزو لاینفک قرار دیا۔ اور زرتشت نے تو انسان کو رُوحِ بدی کے ہاتھ میں ایک آلۂ تفریح بنا دیا۔ اسی طرح بُدّھ کو بھی چاروں طرف برائی اور تکلیف ہی نظر آئی۔ اور جو اُن کے نزدیک انسان کی سرشت بد کا نتیجہ تھی۔ پس ان کے نزدیک انسانی نجات انسان کے نیست ہو جانے سے وابستہ تھی۔ قدیم برہمنوں کو بھی ایشور کی بنائی ہوئی دنیا میں کوئی خوبی نظر نہیں آئی۔ انھوں نے دنیا سے قطع تعلق کرنے ہی میں بھلائی سمجھی مختصر یہ کہ قدیم حکماء اور فلاسفہ نے انسان کے اندر کوئی خیر خوبی نہ پائی۔ لیکن آنحضرتؐ نے دنیا کو ایک نئی بات بتائی۔ آپؐ نے انسانی فطرت کا صحیح نقشہ ہمارے سامنے رکھ دیا۔ اس کے حسن و قبح دونوں سے بھی اطلاع دی۔ قرآن مجید فرماتا ہے۔

لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ؗ ثُمَّ رَدَدۡنٰهُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ ۙ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمۡ اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ (التین ۹۵: ۴-۶)

"یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت پر پیدا کیا ہے۔ پھر ہم اسے ذلیل سے ذلیل حالت کی طرف بھی لوٹا دیتے ہیں۔ مگر جو ایمان لائے اور اچھے کام کرتے ہیں تو ان کے لئے ایسا اجر ہے جو ختم نہیں ہوتا۔"

اِنسان دراصل عالم صغیر ہے۔ اس میں وہ تمام خواص موجود ہیں۔ جو کائنات میں مختلف صورتوں اور مخلوقات میں پائے جاتے ہیں۔ وہ بہترین تقویم پر پیدا کیا گیا۔ لیکن اس میں بدی کی طرف رجحان بھی ہے۔ اس کی استعداد غیر محدود ہے۔ اور اس کی ترقی کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ انتہائی بلندی پر جا سکتا ہے۔ تو انتہائی پستی میں بھی گر سکتا ہے۔ یہ سب حقائق اس کی نظروں سے پوشیدہ

تھے۔ اور نہ اُسے اپنی استعداد کو بروئے کار لانے کا علم تھا۔ نہ وہ جانتا تھا۔ کہ اس کا قدم کس طرح پھسل جانے سے بچ جائے۔ پس ایک نبی کی ضرورت تھی جو خدا کی طرف سے آئے۔ اور انسان کو نیک و بد سمجھائے اور میں پھر یہی کہتا ہوں۔ کہ کوئی شخص کسی نبی کی بعثت کا مقصد اس سے بہتر قرار نہیں دے سکتا کہ وہ بنی نوع آدم کو ان امور کے متعلق صحیح واقفیت بہم پہنچائے۔ نبی کریمؐ کی بعثت کا مقصد بس یہی تھا۔ اگر موسیٰؑ۔ عیسیٰؑ اور دیگر انبیاء کے پیروان مقدس لوگوں کو خدا تعالےٰ کے بھیجے ہوئے نبی تسلیم کر سکتے ہیں تو میری رائے میں آنحضرتؐ بدرجۂ اولےٰ اس بات کے مستحق ہیں۔ کہ دنیا آپؐ کو خدا کا رسول تسلیم کرے۔

باب پنجم

شخصیّت کامل کسی انسان کی عظمت کا دار و مدار معجزات دکھانے پر نہیں ہوتا، اور نہ خیال آرائیوں اور مواعیظ حسنہ سے اُس کی شہرت میں چار چاند لگ سکتے ہیں۔ یہ تو اُمور رفتنی و گزشتنی ہیں اصلی عظمت زبردست اور کامل شخصیت ہی سے کُلّیتہً وابستہ ہوتی ہے۔ ”شخصیت ہی دنیا کے زبردست عجائبات میں سے ہے۔ اور محیّرالعقول امور اسی کی بدولت سرزد ہوتے ہیں“ اس کا لازوال اثر نہ صرف ان لوگوں پر پڑتا ہے۔ جو اس کے قرین ہوتے ہیں۔ بلکہ ان پر بھی جو مدّتوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔

اُسی کی بدولت مخالفت کافور ہو جاتی ہے۔ اور اسی سے اغیار کے دلوں میں عزّت اور پیروی کے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ جن کی وجہ سے رفتہ رفتہ وہ لوگ مطیع ہو جاتے ہیں۔ زبردست شخصیت کا یہ خاصہ بھی ہے۔ کہ وہ اپنی روح دوسروں میں بھی پھونک دیتی ہے۔ اور اپنے رنگ میں رنگین کر کے ان کے خیالات میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیتی ہے۔ یہ شخصیّت عادات اور رسُوم کو بھی بدل دیتی ہے۔ اور آیندہ نسلوں کے عقاید کے لئے نئی بنیادیں قائم کر جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ اس کی بدولت اِک نئی زمین اور نیا آسمان پیدا ہو جاتا ہے۔ آنحضرتؐ کی شخصیت ان جُملہ صفات کی حامل تھی اور اسی لیے یکتائے زمانہ کہی جا سکتی ہے۔ دنیا میں اور بھی کئی بڑی شخصیتیں گزری ہیں۔ یہ تو ہمیں اختیار ہے۔ کہ ہم ان کی طرف وہ صفات بھی منسوب کر دیں۔ جو ان میں موجود نہ تھیں۔ یا یہ کہ انھیں اُن اخلاقِ حسنہ سے مُتّصف کر دیں۔ جن کی نہ انہوں نے تلقین فرمائی۔ نہ انھیں ان پر عامل ہونے کا موقعہ ملا“ ہمیں یہ بھی اختیار ہے کہ ہم ایسے بزرگوں کو جنھیں ہم نجات دہندہ تصوّر کرتے ہیں صلیبوں پر چڑھائیں یا انھیں کوہ ہائے جلال پر بٹھا کر انسان سے خدا بنا دیں۔ لیکن یہ بعد کی باتیں ہیں۔ اور یہ اُن کے منہ سے نکلتی ہیں۔ جو انسانوں کو خدا بنایا کرتے ہیں۔ اس کے برعکس شخصیت کی روشنی تو سُورج ہو کر چمکتی ہے۔ جس کے ناقابل مغلوبیت اور آتشیں جوش کے سامنے مخالفت کی آگ بالکل سرد ہو جاتی ہے۔ لہٰذا کسی فرد کی شخصیت کا اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ اس کے ہمعصروں

کی رائے اس کے متعلق کیا تھی۔ ۱۔ نومبر ۱۹۲۵ء کے "ڈیلی ایکسپریس" کے مقالۂ افتتاحیہ میں کیا خوب لکھا ہے۔ کہ "اگر کسی شخص کی بڑائی کا اندازہ اس عزت سے ہو سکتا ہے۔ جو اُس کے منہ کے الفاظ ان لوگوں میں پیدا کرتے ہیں۔ جو اُن کو الہامی مانتے ہیں۔ تو اس لحاظ سے محمدؐ (صلعم) دنیا کے سب سے بڑے انسان گزرے ہیں"۔ اگر یہ معیار صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے تو آنحضرتؐ نہ صرف دنیا کے سب سے بڑے انسان ہیں۔ بلکہ بے نظیر شخصیت کے مالک بھی ہیں۔ کیونکہ کسی ریفارمر نبی رسولؑ بلکہ اوتاروں کو بھی ان کے متبعین نے نہ اس قدر محبوب رکھا نہ ان کی اس قدر فرمانبرداری کی۔ نہ وہ اطاعت و جاں نثاری دکھائی جس قدر آپ کے خادموں نے آپؐ کے متبعین اور شاگرد ادنےٰ طبقہ کے لوگ نہ تھے۔ نہ ذات اور نسل کے لحاظ سے اور نہ ذہنی قوے[1] کے لحاظ سے وہ کسی سے کم تھے۔ بلکہ زیادہ تر آپؐ کے جاں نثار معزز و محترم اشخاص تھے۔ صاحبانِ دولت و ثروت تھے۔ ذی حیثیت تھے۔ ان میں ہی آپؐ کے دوست اور آپؐ کے اہل کنبہ بھی تھے اور اس طرح آپ کی اندرونی و بیرونی زندگی سے بھی بخوبی واقف تھے۔" ابتدائی زمانہ کے مسلمانوں نے بارہ سال تک شدید تکالیف اٹھائیں۔ اور بُت پرستوں نے انہیں حد درجہ کی ایذا پہنچائی لیکن باایں ہمہ ان کی تعداد بڑھتی رہی۔ گو جماعت منتشر ہو گئی۔ اور بہت سے افراد جلاوطن بھی ہوئے۔ لیکن مسلمانوں کی تعداد روز افزوں ترقی پاتی رہی اگرچہ شدید ترین مصائب کا سامنا تھا۔ لیکن شاید ہی کوئی مرتد ہوا ہو۔ اور دائرہ میں وسعت[2] روز بروز ہوتی گئی۔ تو کیا آنحضرتؐ کی بے نظیر شخصیت کو جس کی نظیر دنیا میں نہیں

---

[1] مسٹر مارماڈیوک پکھتال جن کی تحریر سے مندرجہ بالا اقتباس ہدیۂ ناظرین کیا گیا ہے۔ اسی ضمن میں کیا خوب لکھتے ہیں "ذرا دہ جواب تو سنیئے جو آپؐ کے ایک مرید نے اپنے ایذا دینے والوں کے سوال پر دیا تھا۔ ان موذیوں نے کہا۔ کیا تم چاہتے ہو۔ کہ تمہاری جگہ اس وقت محمدؐ ہوتے؟ مگر اس اذیت رسیدہ نے بجواب کہا۔ کہ اگر کوئی شخص مجھے میرے خاندان۔ دولت اور عیال سے جدا کر دے تو گوارا ہے مگر میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ کہ حضورؐ کے پاؤں میں ذرا سا کانٹا بھی چبھ جائے۔" کیا یہ بات ذاتی طور پر الفت و مودّت کا نتیجہ نہیں؟ محض اُس محبّت کی بناء پر جو کسی کو کسی ہادی سے ہوتی ہے۔ یہ بات کسی کے منہ سے نکلتی ہے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں۔ میں نے آنحضرتؐ کی دس سال تک خدمت کی لیکن اس طویل عرصہ میں کبھی آپؐ نے مجھ کو جھڑکا تک نہیں"۔ اسی طرح

ہے ان نومسلموں کے قبول اسلام میں کوئی دخل نہ تھا؟"

بہرکیف آپؐ کی شخصیت فی الواقع عدیم النظیر ہے۔ کیونکہ آپؐ نے اپنی زندگی ہی میں ہزاروں اشخاص کی زندگیوں میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اُن کے خیالات میں تبدیلی کر دی۔ اور ان کے سامنے نئے نئے نصب العین رکھ دیئے۔ انہیں مخالفت کے باوجود بھی ترقی کی شاہراہ پر ڈال دیا۔ تاکہ اعلٰے اور پاک زندگیاں بسر کر سکیں۔

آپؐ کے چاروں طرف بُت پرستی، شرک، شراب خوری عصیان وطغیان، جور و تعدی الحاد اور قتل وزنا کا بازار گرم تھا۔ مذہب حقہ فنا ہو چکا تھا۔ اس کے بجائے بُت پرستی، عناصر پرستی، حیوان پرستی، اور انسان پرستی کا مجموعہ مذہب کے نام سے رائج تھا۔ یہود و نصاریٰ تک اس مجموعہ پر عامل تھے۔ پھر اس پر آپؐ کو ان لوگوں سے سابقہ پڑا۔ جو حد درجہ قدامت پسند تھے۔ اور اپنے مروجہ رسوم میں کسی قسم کی مداخلت گوارا نہ کر سکتے تھے۔ اور اپنی پرانی رسوم پر آنکھ میچ کر کاربند تھے۔ گویا پرانی لکیر کے فقیر تھے۔ جو کسی ناصح کی بات سننی پسند نہ کرتے تھے۔ ایسے لوگوں کی اصلاح گویا "جوئے شیر آوردن" کا مصداق تھی لیکن آپؐ کی بعثت کا مقصد ہی یہ تھا" اور باعتبار جانفشانی آپؐ کی بعثت، جملہ انبیاء کی بعثتوں سے زیادہ اہم اور دشوار گزار تھی۔ سوال یہ ہے۔ کہ کیا آپؐ نے بھی دوسروں کی طرح مفاہمت باہمی اور حسن سمجھوتے سے کام لیا؟ کیا آپؐ نے آدھا پونا کام کیا یا آہستہ آہستہ نئے خیالات کو رواج دیا؟ کیا آپؐ کے افعال وقتی ضروریات کے رفع کرنے کے لئے تھے؟ کیا آپؐ نے عارضی انتظامات یا اصلاحات نافذ کیں؟ کیا آپؐ نے کبھی ہنگامی مصلحت (پالیسی) سے کام لیا؟ وہاں تو معاملہ ہی دگر گوں تھا۔ جس بدی کا استیصال آپؐ کے مدنظر ہوا۔ اسے آپؐ نے صفائی کے ساتھ جڑ سے اکھیڑ دیا۔ نہ آپؐ نے ابن الوقتی کی اور نہ ضرورت پر خاموش رہے۔ اگرچہ آپؐ طبیعت کے حساس لیکن ساتھ ہی تنہائی اور خاموشی پسند تھے۔ ہر کام آزادی اور اخلاص کے ساتھ ہوتا تھا۔ غیر مسلم دنیا سے آپؐ قرآنی الفاظ میں یوں خطاب

(بقیہ صـــ) سینکڑوں بلکہ ہزاروں احادیث موجود ہیں جن میں ذاتی محبت کی جھلک نظر آتی ہے۔ اور یہ احادیث ان لوگوں سے مروی ہیں۔ جنکو آپؐ کی صحبت کا شرف حاصل ہوا۔"

فرماتے تھے۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (آل عمران) ۳: ۸۵

"جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا مذہب اختیار کرے گا۔ وہ قبول نہ کیا جائے گا۔ اور آخرت میں وہ شخص نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا"

عیسائیوں سے یوں فرمایا۔

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ (المائدہ) ۵: ۷۵

"مسیح ابن مریم صرف رسول ہے"

پس اللہ تعالےٰ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ، اور "تین" مت کہو تثلیث کے عقیدے سے باز آجاؤ تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ عیسائی کہتے ہیں۔ خدا نے بیٹا بنایا ہے۔ بیشک یہ بڑی خوفناک بات کہی۔ بلکہ قابلِ نفرت ممکن ہے زمین و آسمان پھٹ جائیں۔ اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ کہ انہوں نے ایسی بری بات کہی کہ خدا سے کسی انسان کو بطور بیٹے کے منسوب کر دیا۔ ان سے کہہ دو کہ خدا وحدہٗ لاشریک ہے وہ مختار ہے۔ نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ کسی سے جنا گیا۔

عیسائی کہتے ہیں۔ "مسیح خدا کا بیٹا ہے"، یہ ان کے منہ کے الفاظ ہیں۔ یہ لوگ دراصل ان مشرکوں اور بت پرستوں کی تقلید کرتے ہیں۔ جو اُن سے پہلے گزر چکے ہیں۔ اللہ نے انہیں برباد کر دیا۔ اب وہ راندۂ درگاہ ہو گئے۔ ارکانِ کلیسائے روم سے آپ نے فرمایا۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (التوبہ) ۹: ۳۱

"انہوں نے (یہودی علماء) اپنے عالموں اور راہبوں کو اللہ کے سوائے رب بنا لیا ہے"

یہود نے یقین کیا کہ ہم تو خدا کے بیٹے ہیں۔ اور عیسائی لوگوں نے یقین کیا کہ ہم خدا کے بیٹے ہیں لیکن آنحضرت ؐ نے دونوں کو خطاب کیا اور کہا۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ (المائدہ) ۵: ۱۸

"یہود اور عیسائی کہتے ہیں۔ کہ ہم لوگ خدا کے بیٹے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ اگر ایسا ہوتا تو خدا تمہیں سزا کیوں دیتا؟

یہود کو سرزنش کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ

(البقرہ) ۲: ۶۵

"اور بےشک تم ان کو جانتے ہو جو تم میں سے سبت کے معاملہ میں حد سے نکل گئے۔ پس ہم نے ان سے کہا کہ تم ذلیل بندر ہو جاؤ۔"

منافقوں سے آپؐ نے فرمایا۔

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ

(البقرہ) ۲: ۱۰

"ان کے دلوں میں بیماری ہے۔ سو اللہ نے ان کی بیماری کو بڑھایا۔ اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے اس لئے کہ جھوٹ بولتے تھے۔"

جو لوگ آپؐ کی نصیحت نہیں مانتے تھے۔ ان سے خطاب کیا۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ

(البقرہ) ۲: ۷

"اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔"

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ

(البقرہ) ۲: ۱۸

(اور یہ کہ) "بہرے، گونگے، اندھے ہیں سو وہ نہیں لوٹتے۔"

یہ بھی یاد رہے۔ کہ یہ زمانہ وہ تھا۔ جبکہ انسانی نجات عموماً خدا کے بیٹوں کی قربانی پر منحصر سمجھی جاتی تھی اور عامۃ الناس کا عقیدہ ہی یہ تھا۔ کہ نجات کے لیے قربانی کرو۔ چند مروجہ رسوم پر کاربند رہو۔ یا کسی خاص انسان کو شفیع مان لو۔ اور کوئی شخص اس بات کو گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی شخص ان عقاید کے خلاف تبلیغ کرے۔ لیکن آنحضرتؐ کی جرأتِ اخلاقی ملاحظہ ہو کہ آپؐ نے ان تمام عقاید کی تردید علی الاعلان فرما دی۔ آپؐ نے فرمایا۔

أَغَيْرَ اللّٰهِ أَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ۭ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰى ۚ ثُمَّ إِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ

(الانعام) ٦: ١٦٤

"کیا میں اللہ کے سوائے کوئی رب چاہوں اور وہ ہر چیز کا رب ہے اور کوئی جی (بدی) نہیں کماتا مگر اس کا وبال اسی پر ہے۔ اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔ پھر تمہارے رب کی طرف تمہیں لوٹ کر آنا ہے۔ پھر وہ تم کو اس کی خبر دے گا۔ جس میں تم اختلاف کرتے تھے۔"

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ

(الحج) ٢٢: ٣٧

"اللہ کو تمہاری قربانیوں کا گوشت یا خون نہیں پہنچتا بلکہ تمہارا تقویٰ اور راستبازی۔"

فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ (المدثر) ٧٤: ٤٨

"سو انہیں سفارش کرنے والوں کی سفارش فائدہ نہ دے گی۔"

اُس زمانہ میں ملک عرب مختلف مذاہب کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اور ہر مذہب دوسرے مذاہب کی عیب چینی پر تلا ہوا تھا۔ لیکن جزوی طور پر ہر مذہب میں صداقت موجود تھی۔ یہی حالت آج بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن آنحضرتؐ نے فرقہ بندی کو مردود قرار دیا۔ اور مذاہب کے باہم دگر مخالفانہ طرزِ عمل کی مذمت ان الفاظ میں فرمائی۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۠ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا

"اور یہودی کہتے ہیں کہ عیسائی کسی (سچائی) پر نہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودی کسی (سچائی) پر نہیں حالانکہ وہ کتاب پڑھتے ہیں۔ اسی طرح انہی کے قول کے مانند وہ لوگ کہتے ہیں جو کچھ نہیں جانتے سو اللہ ان کے درمیان قیامت کے دن ان باتوں کا فیصلہ کرے گا۔ جن

كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ — میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔"

(البقرہ) ۲: ۱۱۳

قُولُوا آمَنَّا بِاللهِ وَمَا — "تم کہو ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس
أُنزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ — پر جو ہماری طرف اتارا گیا اور اس پر
إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ — جو ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور
وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَ — اسحاقؑ اور یعقوبؑ اور اس کی
الْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ — اولاد کی طرف اتارا گیا، اور اس پر
مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَمَا — جو موسےؑ اور عیسیٰؑ کو دیا گیا، اور
أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِن — اس پر جو نبیوں کو اپنے رب کی طرف
رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ — سے دیا گیا۔ ہم ان میں سے کسی
أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ — میں تفریق نہیں کرتے اور ہم اسی کے
مُسْلِمُونَ (البقرہ) ۲: ۱۳۶ — فرمانبردار ہیں۔"

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ شرعی رسوم، تقریباً تمام مذاہب کی رُوح خیال کی جاتی تھیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تقدس ظاہری اور تقدس شرعی میں امتیاز قرار دیا۔ آپؐ نے فرمایا مذہب کی رُوح دو چیزیں ہیں۔

"ایمان باللہ اور شفقت علی خلق اللہ"

لَيْسَ الْبِرَّ أَن تُوَلُّوا — "بڑی نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے مونہوں
وُجُوهَكُمْ قِبَلَ — کو مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو
الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ — لیکن بڑا نیک وہ ہے
وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ — جو اللہ اور آخرت کے
آمَنَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ — دن اور فرشتوں اور

الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ	کتاب اور نبیوں پر
وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ	ایمان لائے اور اس کی
وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى	محبت کے لئے قریبیوں اور
حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى	یتیموں اور مسکینوں
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ	اور مسافروں اور
وَابْنَ السَّبِيْلِ	سوالیوں کو اور غلام آزاد
وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى	کرنے میں مال
الرِّقَابِ وَاَقَامَ	دے اور نماز قائم کرے
الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ	اور زکوۃ دے اور اپنے
وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ	اقرار کو پورا کرنے والے
اِذَا عٰهَدُوْا	جب وہ اقرار کریں
وَالصّٰبِرِيْنَ فِى	اور صبر کرنے والے
الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ	تنگی اور تکلیف میں
وَحِيْنَ الْبَاْسِ	اور مقابلہ کے وقت۔
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ	یہی وہ لوگ ہیں
صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ	جنھوں نے سچ کر دکھایا اور
هُمُ الْمُتَّقُوْنَ	یہی متقی ہیں"

(البقرہ) ۲: ۱۷۷

عرب کے لوگ شراب کے بیحد عادی تھے ، اور قمار بازی تو ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ لیکن ان امور میں بھی آپؐ نے صرف کمی پر اکتفا نہ فرمائی۔ آپؐ نے برائی کی جڑ پر کلہاڑی ماری۔ اور ان باتوں سے قطعاً محترز رہنے کی تلقین فرمائی۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ	"اے لوگو۔ جو ایمان لائے ہو شراب اور جُوا اور بُت اور پانسے ناپاک کام صرف شیطان کے عمل سے ہیں سو ان سے بچو تاکہ تم کامیاب ہو۔"

(المائدہ ۵ : ۹۰)

آپؐ کے ہم وطن لڑکیوں کو یا تو قتل کر دیتے تھے یا زندہ دفن کر دیتے تھے۔ یہ رسم قدیم زمانہ سے چلی آرہی تھی۔ لیکن آپؐ نے اس فعلِ بد کا بھی قلع قمع کر دیا۔ یہ فرما کر کہ

وَإِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ (التکویر ۸۱: ۸-۹)	"اور جب زندہ درگور کی ہوئی سے پوچھا جائے گا۔ کس گناہ پر وہ قتل کی گئی۔"

مختصر یہ کہ کوئی غلط عقیدہ یا بُری رسم ایسی باقی نہ رہی۔ جس کا عیب آپؐ نے آشکارا نہ کر دیا ہو۔ بایں ہمہ نہ آپؐ نے کسی کو غلط امید بندھائی نہ دعوئے الوہیت کیا۔ نہ کوئی غیر معمولی ادعا فرمایا نہ مبالغہ آمیزی سے کام لیا۔ نہ اپنی ذات کو مقدّس و مُعزّز بنانے کے لئے کوئی تجویز اختیار کی آپؐ اکثر یہی فرمایا کرتے۔ "میں تو محض خُدا کے احکامات سنانے والا ہوں۔ اور خدا کا حکم بندوں تک پہنچانے والا ہوں۔"

مُعجزات بیشک آپؐ سے سرزد ہوئے۔ لیکن اُن سے اشاعتِ مذہب مقصود نہ تھی۔ آپؐ صفائی سے فرمایا کرتے کہ "میں تو دوسرے انسانوں کی مثل ایک انسان ہوں۔ میرے پاس کوئی خزانہ نہیں اور نہ مجھے غیب کا علم حاصل ہے۔"

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ	"تو کہہ دے میں مثل تمہارے ایک انسان ہوں"

(الکہف ۱۸ : ۱۱۰)

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۛۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۛ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۠ (الاعراف) ۷ : ۱۸۸

"کہہ میں اپنی جان کے لئے نفع کا مالک نہیں اور نہ نقصان کا مگر جو اللہ چاہے۔ اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو بہت بھلائی لے لیتا، اور مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچتی۔ میں صرف ڈرانے والا ہوں، اور ان لوگوں کو خوشخبری دینے والا ہوں۔ جو ایمان لاتے ہیں۔"

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ (الانعام) ۶ : ۵۰

"کہہ دے، میں تم کو نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں تم کو کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔"

عرب کے لوگ نہایت توہم پرست تھے۔ اس صورت میں اگر آپ چاہتے تو حسب دلخواہ ربانی طاقتیں اپنی ذات سے منسوب کر لیتے۔ علاوہ ازیں آپؐ کی زندگی میں بہت سے واقعات ایسے ہوئے۔ جبکہ لوگوں نے آپؐ سے ربانی طاقت منسوب کرنی چاہی۔ لیکن آپؐ نے اس قسم کے جملہ خیالات کی تردید فرمادی۔ جب آپؐ کے لڑکے کی وفات ہوئی تو اس دن سورج پورے طور پر گہن میں آگیا۔ بعض بُت پرستوں نے یہ خیال ظاہر کیا۔ کہ آپؐ کے بیٹے کی وفات کی وجہ سے سورج کو گہن لگا اور اس خیال سے عبرت آموز ہو کر آپؐ کے پاس آئے، اور آپؐ کے دین میں شامل ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن آپؐ نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھانا اپنی شان کے خلاف سمجھا اور فرمایا "یقیناً آفتاب اور ماہتاب اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں۔ وہ نہ کسی شخص کی وفات پر گہن میں آتے ہیں۔ نہ کسی کی پیدائش پر۔"

یہ امر قابل غور ہے۔ کہ آپؐ ایک مُصلح قوم اور رسول کی شخصیت میں ظاہر ہوئے ہیں۔ مگر آپؐ نے اپنے آپ کو ان تمام صفات و خواص سے معرّیٰ فرمایا جو ان تمام لوگوں سے منسوب کئے گئے ہیں۔ جو آپؐ سے پہلے گزر چکے ہیں۔ آپؐ نے ان تمام باتوں سے برأت ظاہر فرمائی۔ جن کی بدولت لوگوں کو دوسروں کی رفاقت، دوستی متابعت اور ہمدردی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس طرح آپؐ نے ان

سبھوں کو اپنا دشمن بنالیا۔ اور نہ کبھی آپؐ نے اپنے مقاصد کی تکمیل کی غرض سے کسی کے آگے دست سوال دراز کیا نہ کوئی دنیاوی وجاہت یا مرتبہ حاصل کرنا چاہا۔ اور مقاصد بھی وہ تھے۔ جن سے آپؐ کو کوئی ذاتی منفعت متصور نہ تھی۔ بلکہ وہ مقاصد خدا کے تھے۔ نسلِ انسانی کے تھے۔ اور ہر اعلیٰ اور اشرف چیز کے تھے۔ آپؐ کے مقاصد یہ تھے۔ کہ خدا کی توحید دنیا میں قائم ہو جائے۔ اور اس کی مدد سے نوع انسانی میں وحدت قائم ہو جائے۔ بنی نوع آدم جو قعرِ مذلت میں گرے ہوئے تھے۔ اس اعلیٰ مقام پر پہنچ جائیں جو ان کے شایان شان ہے۔ مختصر یہ کہ آپؐ نے ان تمام باتوں کو اپنی ذات سے دور کر دیا جن کی وجہ سے آپؐ کی زندگی خوشگوار ہو سکتی تھی اور کامیابی بھی آسان۔ لیکن اگر آپؐ ایسا کرتے تو پھر آپؐ اپنے مقاصد اور اپنی بعثت دونوں سے بیوفائی کے مرتکب ہوتے (اعوذ باللہ) آپؐ نے حصولِ مقاصد کی غرض سے معجزات نہیں دکھلائے۔ بلکہ آپؐ نے جو کام انجام دیا۔ وہ معجزات سے بھی بڑھ کر تھا۔ یعنی آپؐ نے باوجود مخالفت کامیابی حاصل کی۔ اور یہ کامیابی ایسی تھی کہ ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک کسی فرد کو حاصل نہیں ہوئی۔ نہ دین میں نہ دنیا میں لیکن اس کامیابی کے حصول کی غرض سے آپؐ نے انسانی قوت سے بالاتر اُمور میں ہاتھ نہیں ڈالا۔ کیونکہ پھر آپؐ دوسرے انسانوں کے لئے نمونہ نہیں ہو سکتے تھے۔ آپؐ نے وہی پاک اور اشرف ذرائع اختیار فرمائے جو دوسروں کے لئے بھی مہیا ہو سکتے ہیں۔ بس آپؐ کی زندگی ان لوگوں کے لئے اُسوہ حسنہ ہے۔ جو باوجود مخالفتِ شدید کامیابی سے ہم آغوش ہونا چاہتے ہیں۔

نبی آتا ہی اس لئے ہے۔ کہ عامۃ الناس کے لئے نمونہ اور رہنما ہو۔ اور آنحضرتؐ میں یہ دونوں صفات بدرجۂ اتم واکمل موجود ہیں۔ آپؐ سچے بشر ہیں۔ اور اس لئے آپؐ صحیح معنوں میں بنی نوع آدم کے لئے اسوہ حسنہ ہو سکتے ہیں۔ آپؐ نے مشکلات کا مقابلہ کیا اور ان ذرائع کی مدد سے ان پر غالب آئے جو دوسروں کے حیطۂ اقتدار میں بھی ہیں۔

دوسرے انبیاءؑ نے بوقت ضرورت معجزات سے کام لیا۔ معجزات کی ضرورت بظاہر اس لئے ہوتی ہے۔ کہ اُن کے ذریعہ دوسروں کے عقاید میں مضبوطی ہو یا ان کے دلوں میں کسی صداقت کا نقش قائم ہو۔ یہ بات بھی صحیح ہے۔ اور نبی کریمؐ نے بھی انہی اغراض کے لئے معجزات دکھلائے۔ لیکن وقت

یہ ہے ۔ کہ ہم لوگ رات دن اس دنیا میں مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں ۔ اور ان پر قابو پانے کے لئے معجزات نہیں کر سکتے ۔ جناب موسےؑ نے اپنی قوم کو مصریوں کی غلامی سے نجات دلائی ۔ لیکن بذریعہ معجزات، اس کے مقابلہ میں آنحضرتؐ نے محاصرۂ مدینہ کے موقعہ پر صرف اپنے مخلص اور جانباز مٹھی بھر دوستوں کے ساتھ دس ہزار دشمنوں کے مقابلہ میں داد شجاعت دی ۔ اور ایسی قابلیت کے ساتھ کارِ مدافعت انجام دیا ۔ کہ بڑے سے بڑا سپہ سالار نہایت شوق کے ساتھ ان صورتوں اور تجاویز پر عمل کرے گا ۔ لیکن جناب موسےؑ باوجود معجزات اپنے ہمراہیوں میں وہ روحِ شجاعت پیدا نہ کر سکے ۔ جو آنحضرتؐ کے رفقاء میں پائی جاتی ہے ۔ جناب مسیحؑ تو ہمیشہ اپنے شاگردوں میں نقص ایمان ہی کی شکایت کرتے رہے ۔ حالانکہ انہوں نے ایک دو نہیں بیشمار معجزات دیکھے تھے لیکن آنحضرتؐ کے رفقاء اپنی محبّت اور اطاعت کے لحاظ سے عدیم المثال لوگ گزرے ہیں۔

بہت کم لوگ ایسے ہیں ۔ جو طاقت پاکر اپنی مصیبت اور بیکسی کے زمانہ کو یاد رکھتے ہیں صرف عالی ہمتی اور بلندی طبیعت ہی وہ صفات ہیں ۔ جن کی وجہ سے ایک شخص نکبت و عزت میں یکساں رہ سکتا ہے ۔ ان صفات والوں میں تبدیلئ حالات محض ان صفات کے اظہار کے مواقع ہوتے ہیں ۔ جن کا اظہار دیگر حالات میں ناممکن تھا ۔ دراصل ہر صفت کے اظہار کے لئے ایک خاص موقعہ ہوا کرتا ہے ۔ اگر مشکلات پر غلبہ حاصل کرنے سے انسان کا کیریکٹر بنتا ہے تو کامیابی سے اس کو صفات حسنہ کے دکھلانے کا موقعہ ملتا ہے ۔ بشرطیکہ وہ ان سے موصوف ہو ۔ صرف رحمدلی ہی کا نام انسانیت نہیں ہے ۔ بلکہ انسانیت تو مختلف صفات اخلاق کا مجموعہ ہے ۔ خواہ وہ نرم ہو یا گرم ۔ ایسا ہی ان اخلاق کے نشو و نماء کے لئے مختلف حالات کی ضرورت ہے ۔ اگر بعض صفات حالت افلاس میں ظاہر ہوتی ہیں ۔ تو بعض ثروت و شوکت کو چاہتی ہیں ۔ رہنمایان عالم میں سے بہت کم لوگ ایسے گزرے ہیں جن کو دونوں حالتیں نصیب ہوئی ہوں ۔ لیکن آنحضرتؐ چونکہ کل دنیا کے لئے نمونہ بن کر آئے تھے اس لئے آپؐ کو انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں سے ہو کر گزرنا پڑا ۔ اگر جلال و شوکت کے زمانہ میں آپؐ نے صفات عفو، کرم، عطاء وغیرہ کا اظہار کیا تو حالتِ ناخوشگوار میں آپؐ نے صفات صبر، تحمل، برداشت اور اعتماد علی اللہ دکھایا۔

ایک بات آپؐ میں ایسی پائی جاتی ہے ۔ جس سے ثابت ہوتا ہے ۔ کہ آپؐ نے کیریکٹر اور اخلاق میں

وہ رُتبۂ عظیم حاصل کر لیا تھا۔ جس سے زیادہ کسی انسان سے ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ وہ مرتبہ ہے۔ جس پر پہنچ کر ایک انسان خُدا کی سی صفات حاصل کر لیتا ہے۔ اور خدا ہی کی سی صفات کا مظاہرہ بھی کرتا ہے۔ خدا کی سنّت و قوانین کی طرح آپؐ کی طبیعت بھی لاتبدیل و مستقل واقع ہوئی تھی۔ فتح ہو یا شکست افلاس ہو یا خوشحالی، فارغ البالی ہو یا تنگی، غرضکہ کچھ ہی کیوں نہ ہو آپؐ کی طبیعت میں تغیّر نہ ہوتا تھا۔ مثلاً فروتنی اور انکساری تمام عمر آپؐ کا شیوۂ خصوصی رہا۔ واشنگٹن اِروِنگ لکھتا ہے" جنگی فتوحات کی وجہ سے آپؐ کے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ نہ آپؐ میں غرور پیدا ہوا نہ شیخی۔ اگر ذاتی اغراض کے لئے یہ سب کارروائی ہوئی ہوتی۔ تو ضرور تبدیلی بھی ہو جاتی۔ انتہائی طاقت و حشمت کے زمانہ میں بھی آپؐ نے وہی سادگی قائم رکھی جو انتہائی مصیبت کے زمانہ میں آپؐ کا طغرائے امتیاز تھی۔ شاہانہ شان و شوکت کا اختیار کرنا تو بڑی بات ہے۔ اگر کسی مکان میں داخل ہوتے وقت لوگ آپؐ کی تکریم و تعظیم میں مبالغہ کرتے تو آپؐ ناراض ہوتے اگر آپؐ اپنی فتوحات کو عالمگیر بنانا چاہتے تھے تو محض دین کے لیئے۔ دنیاوی حکومت جو آپؐ کو ضمنی طور پر حاصل ہو گئی۔ آپؐ نے اس کا استعمال ازراہِ تفاخر کبھی نہ کیا۔ بلکہ یہ بھی نہ چاہا کہ وہ حکومت مستقلاً آپؐ کے خاندان میں قائم ہو جائے۔

بادشاہ عرب بن جانے کے بعد بھی آپؐ ہر ایک سے مساویانہ اور برادرانہ طور پر ملتے تھے۔ آپؐ نے کبھی ایڈیکانگ اور باڈی گارڈز قائم نہیں کیئے اور آپؐ اپنے احباب و حلقۂ متبعین کے دائرہ میں مثل ایک معمولی انسان کے چلتے پھرتے تھے"۔ گبن لکھتا ہے" اپنے انتہائی عروج کے زمانہ میں بھی محمدؐ کو شان و شوکت سے نفرت تھی۔ اور خدا کا یہ رسول اپنے گھر کے سارے کام کاج انجام دیا کرتا تھا۔ آگ سلگانا' جھاڑو دینا' بکریوں کا دوہنا' جوتے کی مرمت کرنا' کپڑوں میں پیوند لگانا۔ غرضکہ سارے کام آپؐ کیلئے آسان تھے۔ اگرچہ رُہبانوں کی طرح آپؐ نے ترک دنیا نہیں کی۔ لیکن ایک عرب اور ایک سپاہی کی طرح آپؐ بھی قلیل غذا پر اکتفا کرتے تھے۔ مختلف مواقع پر آپؐ اپنے احباب کی نہایت فراخ دلی سے ضیافت فرماتے تھے۔ لیکن خانگی زندگی میں ہفتوں آپؐ کے یہاں چولھا بھی گرم نہ ہوتا۔ ان باتوں کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے۔ جو حضرت عائشہ صدیقہ کی معرفت ہم تک پہنچی ہے۔ اور یہ اس لیئے کہ عربی میں ایک مثل ہے۔ کہ شہادت وہ ہوتی ہے جو کسی کے گھر کے لوگ دیں"۔ ایک مرتبہ ایسا

ہوا کہ مسلسل ایک ماہ تک ہمارے گھر میں آگ نہیں سلگائی گئی۔ اور ہماری غذا صرف کھجوریں اور پانی تھا۔ اگر کسی نے گوشت بھیج دیا تو وہ اور بات ہے۔ آنحضرتؐ کے عیال نے کبھی دو روز تک متواتر گیہوں کی روٹی نہیں کھائی"۔ ؎

یہ تھی آنحضرتؐ کی زندگی اور یہ تھیں آپؐ کی عادات جبکہ سارا عرب آپؐ کے زیر نگین آچکا تھا۔ اور لاکھوں انسان آپؐ کے اشارۂ ابرو پر اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے تیار تھے۔ آپؐ کی زندگی کے آخری حصہ میں اہل مدینہ متموّل اور فارغ البال ہو گئے تھے۔ ہر طرف زر و جواہر کی افراط تھی۔ لیکن خود آنحضرتؐ کی دختر نیک اختر کے گھر میں دولت و ثروت کا کوئی نشان نہ تھا آپؐ کی وفات کے روز آپؐ کے پاس صرف چند روپئے تھے۔ جن میں سے نصف سے زیادہ

؎ جامع ترمذی میں جو حدیث کی کتاب ہے مرقوم ہے۔ کہ آنحضرتؐ اور آپؐ کے عیال اکثر راتوں کو گرسنہ ہی سو جاتے تھے۔ کیونکہ ان کے پاس کھانے کو نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ آپؐ کے حرم سرا میں دو ماہ تک آگ بھی نہیں سلگائی گئی۔ عروہ ابن زبیر نے ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا۔ کہ آپؐ آج کل کیا کھاتی ہیں؟ آپ نے فرمایا۔ "کھجوریں اور آب تازہ" بعض اوقات آپکے ہمسائے بکری کا تھوڑا سا دودھ بھیج دیتے تھے۔ بخاری کتاب الرقاق میں مذکور ہے کہ آنحضرتؐ نے کبھی گیہوں کی روٹی نہیں کھائی۔ سہل ابن سعد کا قول ہے۔ کہ نبی کریمؐ نے کبھی چھنا ہوا آٹا استعمال نہیں کیا۔ لوگوں نے پوچھا۔ کیا اُس زمانہ میں چھلنیاں تھیں؟ انہوں نے جواب دیا۔ "نہیں" لوگوں نے پوچھا۔ "پھر بھوسی کس طرح دور کرتے تھے؟ انہوں نے جواب دیا "پھونک سے اڑا دیتے تھے ماباقی کو گوندھ لیتے"۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں "یوم الہجرت سے تا دم وفات آنحضرتؐ نے شکم سیر ہو کر غذا تناول نہیں کی۔ صحیح مسلم میں مذکور ہے حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں حضور اقدسؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ نے ایک کپڑا نہایت مضبوطی سے پیٹ کے گرد لپیٹا ہوا تھا۔ میں نے اس کے متعلق سوال کیا تو صحابہؓ نے جواب دیا۔ بوجہ گرسنگی حضورؐ نے ایسا کیا ہے"۔

تو قرضہ کی ادائیگی میں چلے گئے۔ اور باقی ماندہ رقم ایک محتاج کو دے دی گئی۔ جس لباس میں آپؐ نے رحلت فرمائی اس میں پیوند لگے ہوئے تھے۔ جب گھر کا اثاثہ اس طرح ختم ہو گیا۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ "ہم لوگ یعنی طبقۂ انبیاء کے افراد نہ ورثہ حاصل کرتے ہیں۔ اور نہ دوسروں کے لئے چھوڑتے ہیں۔"

باب ششم

مکمل سیرت (کیریکٹر) مشکلات و مصائب کی بھٹی میں پڑ کر فطرت انسانی کا کچا لوہا دمکتا ہوا سونا بن جاتا ہے۔ انسان کی خوبی یا جوہر ذاتی غرضکہ جو کچھ اس میں قابل تعریف عنصر ہو۔ وہ مصائب اور تکالیف کے موقعہ پر ہی ظاہر ہوتا ہے۔ اگر اس میں کوئی خوبی ہے۔ تو وہ انسان شہرت ابدی حاصل کرلیتا ہے۔ ورنہ قعر گمنامی میں گر جاتا ہے۔ پس ان لوگوں کو جو کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

جب غارِ حرا میں آپؐ کو منصب نبوت پر سرفراز کیا گیا تو معاً آپؐ پر ذمہ داریوں کا وہ پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ جس کے بوجھ سے آپؐ کے بدن میں کپکپاہٹ پیدا ہوگئی۔ آپؐ بعجلت تمام دولت کدہ واپس آئے اور حرم محترمہ سے فرمایا "مجھے چادر اوڑھا دو"۔ جب ذرا افاقہ ہوا۔ تو آپؐ نے فرمایا۔ "اے خدیجہ میں جس کے متعلق کوئی بھی یقین نہ کرے گا۔ یا تو "نبی" کے مرتبہ پر پہنچ گیا ہوں۔ یا مجھ پر کسی "مخفی طاقت" کا تسلط ہو گیا ہے۔ آپ نے جواب دیا۔ (اعوذ باللہ!) اے ابوالقاسم خدا کبھی آپؐ پر کسی شیطانی طاقت کو مسلط نہ ہونے دے گا۔ کیونکہ آپؐ صادق القول ہیں برائی کے بدلہ برائی نہیں کرتے۔ خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ پاک زندگی بسر کرتے ہیں۔ احباء اور اقرباء پر کرم فرماتے ہیں۔ اور کوچہ و بازار میں کبھی یاوہ گوئی نہیں کرتے بہر کیف آپؐ یہ تو بتائیں کیا واقعہ گزرا؟ کوئی خوفناک بات آپؐ نے دیکھی؟ آپؐ نے مفصل حالات سے اطلاع دی اس پر انہوں نے کہا۔ "اے محترم شوہر! تسلی رکھیئے جس کے ہاتھ میں خدیجہ کی جان ہے وہ میرا گواہ ہے۔ آپؐ ضرور قوم کے لئے نبی مقرر کئے جائیں گے"۔ اگر نبی کریمؐ (نعوذ باللہ) اپنے دعوے میں مفتری ہوتے۔ تو کیا آپؐ ایسی حالت پریشانی میں اپنے گھر جاتے اور اپنی بیوی سے جو تمام رازوں سے واقف تھیں، جملہ باتیں بیان کرتے؟ اور کیا پھر خدیجہؓ ان سے اس طرح خطاب کرتیں۔ اگر فی الواقع آپؐ کا کیریکٹر سزاوار درجۂ نبوت نہ ہوتا؟ یسوع صاحب تو اپنے اقرباء اعزہ کو بھی دائرہ

ارادت میں شامل نہ کرسکے۔ اور تو اور ان کے بھائی ان پر ایمان نہ لائے۔ بلکہ انھیں مخبوط الحواس سمجھتے تھے۔ لیکن آنحضرتؐ نے تو اپنا رازِ دل اُن سے کہا جو آپؐ سے خوب واقف تھے۔ یعنی زوجہ، بھائی اور احباب جنہوں نے آپؐ کے ساتھ برسوں ہم نوالگی میں گزارے تھے۔ اور آپؐ کی حرکات و سکنات تک سے واقف تھے۔ اگر وہ لوگ آپؐ میں شمہ بھر بھی ریاکاری، دنیاداری یا بے ایمانی دیکھ لیتے تو وہ لوگ ہرگز آپؐ کی وحی پر ایمان نہ لاتے۔ ان لوگوں کا آپؐ پر ایمان لے آنا ہی آپؐ کے چال چلن کی عمدگی اور دعوے کی صداقت کی نہایت زبردست دلیل ہے۔ یہ سچ ہے کہ آپؐ کے چچا ابو طالب نے یہ کہہ دیا تھا۔ کہ میں اپنے آبا و اجداد کے مسلک کو ترک نہیں کرسکتا۔ لیکن جب انہوں نے اپنے بیٹے علی کے قبولِ اسلام کا ذکر سنا تو انھیں بلا کر کہا "مجھے یقین ہے کہ میرا بھتیجا محمدؐ سوائے نیکی کے اور کسی طرف نہیں بلائے گا۔ پس تم بخوشی خاطر اس کی اتباع کرو۔"

جب آپؐ نے نبوت کا دعوے کیا تو اہلِ مکہ نے کہا کہ آپؐ پر کذب اور افترا کا الزام تو عائد نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ یہ دونوں برائیاں آپؐ میں کبھی پائی ہی نہیں گئیں۔ پس لامحالہ یہی کہنا پڑے گا کہ (معاذاللہ) آپؐ کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ بعضوں نے خیال کیا کہ آپؐ مبالغہ پسند شاعر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں ان لوگوں کے خیالات کی طرف بایں الفاظ اشارہ کیا گیا ہے "بعض کہتے ہیں کہ محمدؐ مخبوط الحواس ہے۔ یا شاعر ہے یا مسحور و مجنون ہے وغیرہ" بہر حال انھوں نے آپؐ کو "کاذب" کبھی نہیں کہا ایک مرتبہ عمائدینِ قریش سرگرم گفتگو تھے۔ بسبیلِ تذکرہ آپؐ کا ذکر آگیا جس پر قریش میں سے ایک تجربہ کار شخص موسوم نضر بن حارث نے کہا "اے اہلِ قریش! تم لوگ ابھی تک اس مشکل کو نہیں ٹال سکے۔ جو تم لوگوں کے سروں پر آئی ہوئی ہے۔ آخر محمدؐ تمہارے سامنے بچہ سے جوان ہوئے۔ اور تم خوب جانتے ہو کہ انھوں نے مدت العمر جھوٹ نہیں بولا۔ بلکہ وہ اپنے زمانہ میں سب سے ایماندار، صادق اور ہر دلعزیز قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ تو جب ان کے بال سفید ہوتے آئے تو تم کو ان کے دعاوی پر یہ کہنے کی جرأت کرتے ہو کہ وہ پاگل ہیں، جادوگر ہیں۔ کاہن ہیں، شاعر ہیں وغیرہ وغیرہ۔ خدا کی قسم میں نے کئی مرتبہ محمدؐ کو تقریر کرتے ہوئے سنا ہے۔ وہ نہ شاعر ہیں نہ پاگل نہ جادوگر نہ کاہن۔ مجھے یقین ہے کہ اس انکارِ حق کی پاداش میں تم پر ضرور کوئی نہ کوئی آفت نازل ہوگی

ابوجہل جو آپؐ کا اشد مخالف تھا، کہا کرتا تھا۔ کہ "محمدؐ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ تم کاذب ہو، مگر جو کچھ تم لوگوں کو تلقین کرتے ہو وہ ضرور غلط ہے۔ اور میں اُسے دروغ جانتا ہوں۔
زمانِ بعثت سے تین سال تک آپؐ خاموشی کے ساتھ لوگوں کو بُت پرستی کے ترک کر دینے کی ترغیب دیتے رہے۔ لیکن قدیم عقاید مضبوطی کے ساتھ انکے دلوں میں گھر کر چکے تھے۔ علاوہ ازیں ان عقاید کے قیام سے آپؐ کی قوم کے لوگوں کی ذاتی اغراض بھی وابستہ تھیں۔ بلکہ ان کا اقتدار قوی اور بسر اوقات دونوں اسی مشربِ قدیم پر منحصر تھے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ان لوگوں نے آپؐ کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگانا شروع کر دیا۔ پہلے تین سال تک موت و زیست والا معاملہ رہا۔ اور اس عرصہ میں آپؐ نے معدودے چند لوگوں کو راہ راست دکھائی۔ لیکن آپؐ نے ہمت نہ ہاری۔ آپؐ خاموشی کے ساتھ تبلیغ میں مصروف رہے۔ مکّے کے لوگ اگرچہ آپؐ کو مجنون یا آسیب زدہ سمجھے تھے۔ لیکن شروع شروع میں انہوں نے زیادہ مخالفت نہ کی۔ لیکن جب دوبارہ حکم الٰہی ان الفاظ میں نازل ہوا۔

يَاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ	"اے چادر اوڑھنے والے اٹھ اور ڈرا
فَاَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ	اور اپنے رب کی بڑائی کر۔ اور
وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ	اپنے کپڑوں کو پاک رکھ، اور ناپاکی
فَاهْجُرْ (المدثر ۷۴: ۱-۵)	سے دور رہ۔"

تو آپؐ نے مستقل کام کرنے کا تہیہ فرمالیا۔ یہ پیغام دراصل دوسروں کے لئے تھا۔ کہ لوگوں کو چاہیے کہ بُری باتیں چھوڑیں۔ اور ناپاک خیالات کو ترک کریں۔ اپنے روحانی پارچات کو پلیدی سے پاک کریں۔ جن میں وہ اپنے اعمال بد اور عقاید فاسد کے سبب ملبس تھے۔ اس پیغام الٰہی پر آپؐ نے ارادہ کر لیا کہ وہ قریش کو بُت پرستی چھوڑنے کی تبلیغ کریں۔ پس ایک دن آپؐ نے جملہ اعیان قریش کو کوہِ صفا پر جمع کیا۔ اور یوں خطاب کیا۔ "یا معشر القریش۔ اگر میں تم سے کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک فوج عظیم تم پر حملہ آور ہونے کے لئے پوشیدہ ہے۔ تو کیا تم اس پر یقین کر دگے؟" سب نے کہا۔ "بیشک، بیشک کیونکہ جہاں تک ہمارا علم گواہی دیتا ہے۔ تو نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔" تب

آپؐ نے کہا۔ کہ خدا تم سے ناراض ہے۔ کیونکہ تم نے اسے چھوڑ کر بُت پرستی اختیار کی' اور جن لوگوں نے خدا کے احکام سے سرتابی کی۔ ان پر خدا کا عذاب نازل ہوا۔ پس گناہوں سے توبہ کرو۔ اور راہ راست پر آجاؤ۔" یہ سُن کر لوگوں نے آپؐ پر آوازے چُست کیے اور منتشر ہو گئے۔ ان لوگوں سے نااُمید ہو کر آپؐ نے ان لوگوں کو تلقین فرمانی شروع کی۔ جو باہر سے بغرضِ تجارت مکّہ میں آتے جاتے رہتے تھے۔ اس پر قریش نے مزاحمت شروع کی۔ اکثر اوقات آپؐ کے دشمن گلی کوچوں میں کھڑے ہو کر اجنبی لوگوں کو آپؐ کے ساتھ بات کرنے سے روکتے تھے۔ اور یہ کہہ کر ڈرا دیتے تھے کہ اس سے بات نہ کرنا وہ تو جادوگر ہے۔ عیب جوئی ازالہ حیثیت عرفی اور دشنام طرازی غرضیکہ آپؐ کے خلاف سارے حربے استعمال ہونے لگے۔ لیکن آپؐ خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتے رہے۔ تبلیغ اسلام کے متعلق جس قدر مستعدی آپؐ کی طرف سے ظاہر ہوتی تھی۔ اسی قدر مخالفت میں شدت ہوتی جاتی تھی۔ دشمنوں نے آپؐ کو خانہ کعبہ میں نماز ادا کرنے سے روک دیا۔ اور آپؐ کی حرکات و سکنات پر پہرے چوکی بٹھا دیئے۔ لیکن ان باتوں سے آپؐ کی ہمت میں کوئی فرق نہ آیا۔ کئی دفعہ آپؐ کی جان لینے کی کوشش کی گئی۔ لیکن آپؐ کے بے نظیر استقلال اور ہمت نے ہمیشہ اُن کے منصوبوں کو خاک ہی میں ملا دیا۔ اور ان باتوں سے آپؐ کے مشاغل تبلیغی میں کوئی فرق نہ پڑا۔ جس قدر وہ مخالفت کرتے تھے۔ اسی قدر آپؐ جوش تبلیغ دکھاتے تھے۔ دشمنوں نے اپنی ساری طاقتیں آپؐ کے خلاف استعمال کرنی شروع کر دیں۔ لیکن آپؐ نے صرف اتنا ہی کہا کہ قدیم زمانہ میں جب کبھی لوگوں نے انبیاء کی مخالفت کی۔ تو اس کا انجام یہی ہوا۔ کہ وہ لوگ خائب و خاسر ہوئے۔ اور اُن پر عذاب الٰہی نازل ہوا۔ اسی طرح تم لوگ بھی "صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ فَھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ"[1] کے مصداق ہو گئے ہو۔ اور تمہارا بھی یہی حشر ہوگا۔ برافروختہ ہو کر انہوں نے مسلمانوں کو ستانا شروع کیا۔ بخاری میں وارد ہے کہ ان لوگوں کو قید میں ڈالا جاتا تھا روٹی پانی بند کیا جاتا تھا۔ اور جب آپؐ کے متبعین شدت گرسنگی سے بیہوش جاتے تھے۔ تو ان کے سامنے بُت پرستی یا موت یہ دو صورتیں پیش کی جاتی تھیں۔ لیکن آپؐ کے عشاق ہمیشہ وفادار رہے۔ جان دی۔ مگر ایمان نہ دیا۔ آپؐ نے بھی ان بیگناہوں کی تکالیف دیکھیں۔ لیکن پائے استقلال میں فرق نہیں آیا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ شہدائے اسلام کے خون سے نخل اسلام بار آور ہوتا جاتا ہے۔ تو انہوں نے آپؐ کو اپنے فرضِ منصبی سے

[1] (البقرہ ۲:۱۸)

باز رکھنے کے لئے دوسرا ذریعہ اختیار کیا۔ چونکہ وہ خود دنیا پرست تھے۔ اس لئے انہوں نے سوچا کہ شاید محمدؐ بھی لذائذ دنیوی سے مغلوب ہو جائیں۔ پس ایک دن جبکہ آپؐ کعبہ میں تشریف فرما تھے بہت سے لوگ آپؐ کے گرد جمع ہو گئے۔ اور عُتبہ نے ان کی ترجمانی ان الفاظ میں کی۔ "اے میرے بھائی کے بیٹے! تو اپنی صفاتِ حسنہ کے لئے مشہور رہے۔ اور نسل کے اعتبار سے بھی ممتاز ہے۔ لیکن تو نے ہم لوگوں میں جدائی ڈال رکھی ہے۔ اور مختلف خاندانوں میں تنازعات برپا کرا دیئے ہیں۔ تو علانیہ طور پر ہمارے بتوں اور دیوتاؤں کی مذمت کرتا رہتا ہے۔ اور ہمارے بزرگوں کی اغلاط آشکارا کرتا ہے۔ بہرحال ہم ایک تجویز تیرے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس کو سُن اور غور کر اگر پسند آئے تو قبول کرلے۔" آپؐ نے فرمایا "اے ابو ولید! جو تجھے کہنا ہے شوق سے کہہ۔" اس پر عُتبہ نے کہا "اے محمدؐ! اگر تجھے دولت کی خواہش ہو تو ہم تیرے لئے اس قدر دولت جمع کر سکتے ہیں۔ کہ ہم میں سے کسی کے پاس نہ ہوگی۔ اگر تجھے عزت اور مرتبہ درکار ہے۔ تو ہم تجھے اپنا سردار تسلیم کر لیں گے۔ اور تیرے بغیر کوئی کام نہ کریں گے۔ اگر تو حکومت چاہتا ہے۔ تو ہم تجھے اپنا بادشاہ بنا سکتے ہیں۔ اور اگر کسی نے تجھ پر جادو کر دیا ہے تو ہم نامور اطباء کو بلا کر تیرا علاج کرا سکتے ہیں۔" آپؐ نے فرمایا۔

تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	(کتاب کا) نازل کرنا اللہ بے انتہا رحم والے
كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا	بار بار رحم کرنے والے کی طرف سے ہے۔ یہ
عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ	کتاب ہے جس کی آیتیں کھول کر بیان کی گئی
بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا فَاَعْرَضَ	ہیں۔ قرآن عربی ان لوگوں کے لئے جو علم
اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ	رکھتے ہیں۔ خوشخبری دینے والا اور ڈرانے
وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ	والا۔ پر ان میں سے بہتوں نے منہ پھیر لیا۔ سو وہ
مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ	نہیں سنتے۔ اور کہتے ہیں ہمارے دل اس بات
اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا	سے پردوں میں ہیں۔ جس کی طرف تو ہمیں
وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ	بلاتا ہے اور ہمارے کانوں میں بوجھ ہے۔ اور
اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا	ہمارے اور تمہارے درمیان پردہ ہے۔ سو عمل

بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحٰى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ (حم السجدة) ۴۱: ۲-۸

کرہم بھی عمل کرنے والے ہیں۔ کہہ میں صرف تمہاری طرح ایک انسان ہوں۔ میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے سو اسی کی طرف سیدھی راہ پر لگے رہو اور اس کی حفاظت مانگو اور مشرکوں کے لئے افسوس ہے جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور وہ آخرت کے بھی منکر ہیں۔ جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں ان کے لئے نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔

جب آپؐ ان آیات کی تلاوت کر چکے تو آپؐ نے فرمایا "اے عتبہ تو نے سن لیا۔ اب جو راستہ تجھے مناسب معلوم ہو وہ اختیار کر لے"

یہ آزمائش اور امتحان خواب میں نہیں ہوا بلکہ جیتے جاگتے کوئی آزمائش میں ڈالنے والا خواب میں نہیں آیا۔ نہ آپؐ نے کشفی نظارہ دیکھا جیساکہ بائیبل میں مرقوم ہے۔ بلکہ آپؐ کو آزمائش میں ڈالنے والا انسان کی شکل میں جلوہ گر ہوا۔

جب اہل مکہ کے مظالم حد سے متجاوز ہو گئے۔ تو آپؐ نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ جو لوگ استطاعت رکھتے ہوں۔ ہجرت کر کے ملک حبش میں چلے جائیں۔ اس پر پندرہ نفوس ملک مذکور کو ہجرت کر گئے۔ اُن کے بعد اور لوگ بھی گئے۔ لیکن قریش نے وہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ بہرکیف وہاں کے بادشاہ نے ان دشمنوں کی ایک نہ سنی اور مسلمان بہ آرام وہاں رہنے لگے۔ دربار حبشہ میں ذلیل ہوکر اور یہ دیکھ کر کہ مسلمانوں کو وہاں بہت آرام ہے قریش کے غم و غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ انہوں نے آپؐ کو بیحد تکلیف دینی شروع کی۔ لیکن آپؐ تو غیر معمولی استقلال کے مالک تھے۔ انتہائی مخالفت کے باوجود آپؐ اپنا فرض تبلیغ انجام دیتے رہے۔ مجبور ہوکر پھر چند لوگ آپؐ کے پاس آئے کہ کسی صورت سے آپؐ کو تبلیغ اسلام سے روکا جائے۔ چنانچہ انہوں نے پھر دولت و حکومت کا لالچ آپؐ کے سامنے پیش کیا

لیکن آپؐ نے تمام باتوں کے جواب میں یہی کہا "نہ میں دولت کا خواہشمند ہوں نہ حکومت کا طالب میں تو خدا کا رسول ہوں۔ اور اس نے مجھ کو بشارت دے کر بھیجا ہے۔ پس میں اس کا کلام آپؐ لوگوں کو سناتا ہوں۔ اور نصیحت کرتا ہوں۔ اگر تم میرے پیغام کو قبول کر دگے۔ تو خدا دونوں جہاں میں تمہیں کامیابی عطا کرے گا۔ اور اگر تم اُسے رد کر دو گے تو میں تمہارا معاملہ خدا کے ہاتھ میں سونپ دوں گا۔ تاکہ وہ ہم دونوں میں صحیح فیصلہ کردے"۔ اس بات کو سُن کر اہل مکہ کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ اور انہوں نے ابوطالب کے پاس ایک وفد بھیج کر درخواست کی کہ اپنے بھتیجے کو ہمارے بتوں کی مذمت کرنے سے باز رکھیئے۔ لیکن اس وفد کو مطلق کامیابی نہیں ہوئی۔ اور آپؐ بدستور بُت پرستی کی مذمت کرتے رہے۔ اس پر قریش نے آپؐ کو کعبہ میں جاکر تبلیغ سے روک دیا۔ اور کثیر جماعت لے کر ابوطالب کے پاس گئے۔ اور یوں گویا ہوئے "ہم آپؐ کا احترام کرتے ہیں۔ لیکن بہر حال اس کی کوئی حد ہے۔ اب ہم میں آپؐ کے بھتیجے کی زبان سے اپنے دیوتاؤں کی مذمت سننے کی تاب نہیں۔ پس یا تو اس کی زبان بند کیجیے یا پھر اس کے طرف دار ہو جائیے۔ تاکہ ہم لوگ باہم لڑ کر اس امر کا فیصلہ کرلیں۔ یقیناً دونوں میں سے ایک ہلاک ہو جائے گا اور جھگڑا ختم ہو جائے گا"۔ ان الفاظ نے ابوطالب پر بہت اثر کیا۔ انہوں نے آپؐ کو بلا بھیجا اور کہا کہ تبلیغِ اسلام چھوڑ دو۔ ان الفاظ سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ ابوطالب آئندہ آپؐ کی حمایت نہیں کریں گے۔ لیکن آپؐ پر اس طرزِ عمل کا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ اور آپؐ نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ فرمایا "اے عم محترم! اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند لاکر رکھ دیں تب بھی میں اپنے فرض کی ادائیگی سے باز نہیں رہ سکتا۔ حتیٰ کہ خدا میری کوششوں کو بارآور کردے۔ یا میں تباہ ہو جاؤں"۔ یہ فرما کر آپؐ رخصت ہونے والے تھے کہ ابوطالب نے آپؐ سے کہا "اے میرے بیٹے جو تیری مرضی ہو کر میں تیرا حامی ہوں"۔ ان کے اس اعلان نے اہل مکہ کو غضب ناک کر دیا۔ اور انہوں نے بنو ہاشم اور بنو مطلب یعنی آپؐ کے خاندان کو تباہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ انہوں نے ایک مجلس منعقد کی۔ اور فیصلہ کیا کہ کوئی شخص آپؐ کے خاندان سے کوئی تعلق نہ رکھے۔ بات چیت، داد وستد، لین دین، شادی بیاہ رسم وراہ، سلام و کلام، غرضیکہ ہر بات ترک کی جائے۔ اور بنو ہاشم کا یکسر بائیکاٹ کر دیا جائے۔ گویا جنگ کا اعلان ہو گیا۔

بنو ہاشم تعداد میں تھوڑے تھے۔ وہ مجبوراً ایک پہاڑ کی کھوہ میں پناہ گزین ہو گئے، جس میں ذرا سا راستہ تھا۔ تین سال تک یہ لوگ گوشہ نشینی اور خلوت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ بھوک پیاس کی تکلیف بھی اٹھائی۔ لیکن قوتِ ارادی اور بھی مضبوط ہو گئی۔ آنحضرتؐ پورے سال بھر تک فرائض رسالت انجام نہ دے سکے۔ کیونکہ ایسی حالت میں علانیہ تبلیغ کرنا یا گاہ بگاہ کوچہ و بازار میں پھرنا دیدہ و دانستہ موت کے منہ میں جانا تھا۔ لیکن جب ماہ ہائے محترم نزدیک آتے جس میں عرب قتل و غارت کو گناہ سمجھتے تھے۔ تو آپؐ پوشیدہ مقام سے باہر نکلتے اور باہر سے آنے والے لوگوں کو اسلام کی تبلیغ کرتے۔ مقدس مہینوں کی وجہ سے اہلِ مکہ آپؐ کو تکلیف تو نہیں پہنچا سکتے تھے۔ لیکن آپؐ کا مذاق اڑاتے اور بُرے بُرے ناموں سے یاد کرتے۔ یہ صورت دعوئے نبوت سے لے کر دس سال تک قائم رہی تا آنکہ دیگر قبائل نے بنو ہاشم کی سفارش کی۔ اور یہ قید اٹھا دی گئی۔ تب جا کر یہ لوگ اس قید سے آزاد ہوئے۔ لیکن اس کے تھوڑے عرصہ کے بعد آپؐ پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ یعنی یکے بعد دیگرے آپؐ کی زوجہ اور چچا نے وفات پائی۔ یوں سمجھئے کہ آپؐ کی دیرینہ غمگسار اور مخلص صلاح کار بیوی اور حمایتی اور آڑے وقت میں کام آنے والے چچا دونوں نے آپؐ کو تنہا چھوڑ دیا۔ مکہ والوں کی قساوت قلبی سے ناامید ہو کر آپؐ نے تبلیغ کا میدان بدل دیا۔ طائف چلے گئے۔ یہ قصبہ مکہ سے کوئی چالیس میل ہوگا، صرف آپؐ کا وفادار غلام زید آپؐ کے ہمراہ تھا، وہاں پہنچ کر آپؐ نے لوگوں کو بت پرستی کی برائیوں سے آگاہ کیا۔ اور خدائے واحد کی پرستش کی دعوت دی۔ انہوں نے آپؐ کے پیغام کو سخت حقارت کی نظر سے دیکھا۔ اور مجبوراً آپؐ کو شہر چھوڑنا پڑا۔ جب آپؐ واپس ہو رہے تھے۔ تو شہر کے اوباشوں نے آپؐ کی توہین و تذلیل کی۔ اور بعضوں نے آپؐ پر پتھر بھی پھینکے۔ جس سے آپؐ کی پنڈلیاں زخمی ہو گئیں اور خون بہنے لگا۔ بھوک پیاس اور ناکامی سے نڈھال ہو گئے۔ ایک ٹیلہ پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔ اور دونوں ہاتھ آسمان کی جانب بلند کر کے یوں لب کشا ہوئے۔

"اے میرے خدا میں تجھ سے اپنی تکالیف عرض کرتا ہوں، اپنی کمزوری اور اپنے خیالات کی کم مائیگی کی وجہ سے میں لوگوں میں ذلیل ہوں۔ اے رحمٰن کمزوروں کے آقا میں تجھ کو اپنا خدا مانتا ہوں۔ مجھے تنہا نہ چھوڑیو۔ مجھے اغیار اور دشمنوں کے ہاتھوں ذلیل ہونے سے بچالے۔

اگر تو مجھ سے ناراض نہ ہو تو کوئی شخص مجھے گزند نہیں پہنچا سکتا۔ میں تیرے چہرے کے نور میں جو ظلمت دُور کرتا ہے پناہ لیتا ہوں۔ تیرے نور ہی سے اس دنیا اور آخرت میں میرا بیڑا پار ہوگا۔ میری مشکلات کو جس طرح تیری مرضی ہو حل فرما۔ ان لوگوں کو سیدھی راہ دکھا۔ کیونکہ یہ لوگ نہیں جانتے کہ کیا کرتے ہیں۔"

یہ کس قدر شریفانہ الفاظ ہیں۔ اور ان شریف لبوں سے نکلنے کے لائق! اگرچہ آپؐ کو اپنی حالت اور کمزوری کا احساس ہے۔ تاہم دامنِ اعتماد ہاتھ سے جانے نہیں دیتے یہ الفاظ کہ اگر تو مجھ سے راضی ہے تو کوئی شخص میرا بال بیکا نہیں کر سکتا ظاہر کرتے ہیں کہ آپؐ مطلق ناامید نہ تھے۔ اور ایک لمحہ کے لئے بھی آپؐ کے دل میں یہ خیال نہیں گزرا کہ خدا نے آپؐ کو چھوڑ دیا ہے۔ نیز یہ التجا کہ تو اپنی مرضی کے مطابق میری مشکلات کو حل فرما۔ تنگ نظر پادریوں کی توجّہ کے لائق ہے جو یہ کہتے ہیں کہ یسوع صاحب کے الفاظ "تیری مرضی پوری ہو نہ کہ میری مرضی" تاریخ مذہب میں عدیم المثال ہیں۔ دُعا کے آخری حصّہ کو پڑھ کر مجھے یسوع صاحب کی دعا یاد آجاتی ہے "اے باپ انھیں معاف کر کیونکہ وہ اپنے افعال کے نتائج سے آگاہ نہیں ہیں۔" لیکن آپؐ یوں فرماتے ہیں "ان کو سیدھا رستہ دکھا۔ کیونکہ وہ اپنے افعال سے آگاہ نہیں ہیں۔" یہ الفاظ دونوں کے حالاتِ ذاتی کا آئینہ ہیں۔ اور ان کی سچائی پر بھی دلیل ہیں۔ یسوعؑ صاحب کو اپنی زندگی میں اپنے دشمنوں پر ایسا غلبہ نہیں ہو سکا۔ کہ آپؐ ان کو معافی دے کر اپنی علو ہمت کا ثبوت دیتے۔ لہٰذا وہ خدا سے ان کے لئے معافی طلب کرتے ہیں۔ آنحضرتؐ اس سے بھی بالا گئے۔ کیونکہ علم خداوندی میں مقدّر تھا۔ کہ آپؐ تو دا اپنے دشمنوں کو معاف کرینگے، علاوہ بریں آپؐ کی دعا جامع تر ہے۔ ہدایت میں معافی بھی شامل ہے۔ اور معافی تو صرف گزشتہ غلطیوں کے لئے ہوتی ہے۔ اور نیکی کی طرف ہدایت دینے میں ماضی و مستقبل دونوں آگئے۔ کیونکہ جب تک سابقہ گناہ معاف نہ ہو جائیں کوئی شخص راہ ہدایت پر گامزن نہیں ہو سکتا۔ پس آپؐ نے نہ صرف اپنے دشمنوں کے سابقہ گناہوں کی معافی کے لئے دعا کی۔ بلکہ ان کی آیندہ بہبودی کے لئے بھی۔ یہ دعا نہایت موثر تھی۔ اور بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ اللہ تعالےٰ نے آپؐ کو تمام دشمنوں پر غلبہ عطا فرمایا۔ اور آپؐ نے ان سبھوں کے ساتھ نہایت مہربانی کا برتاؤ کیا۔

خیر آپؐ بہت دل شکستہ ہو کر مکہؔ واپس آئے۔ لیکن کوششوں میں کسی طرح کی کمی نہ فرمائی۔
جو لوگ خانہ کعبہ کی زیارت کے لئے باہر سے آتے تھے۔ آپؐ انھیں دعوتِ اسلام دیتے تھے ایک دن آپؐ مدینہ کے چھ شخصوں سے ملے۔ انھوں نے آپؐ کی تصدیق کی اور ایمان لے آئے دوسرے سال وہ لوگ اپنے ساتھ چھ آدمی اور لائے جو اپنی اپنی جماعت کی طرف سے نمائندے بن کر آئے تھے۔ انھوں نے بھی آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ بیعت ان الفاظ میں لی گئی۔

"ہم کسی شے کو خدا کا شریک نہیں بنائیں گے۔ چوری، زنا، حرامکاری، غیبت، تہمت انگیزی اُن سب برائیوں سے محترز رہیں گے، اپنے بچوں کو قتل نہ کریں گے۔ اور ہر ایک امر میں آنحضرتؐ کی اطاعت کریں گے۔ اور رنج و راحت ہر حالت میں ان کی رفاقت کریں گے۔"

آپؐ عموماً ہر نومسلم سے یہی بیعت لیا کرتے تھے۔ ان الفاظ سے نہ صرف عربوں کی اخلاقی پستی کا پتہ چلتا ہے۔ بلکہ آپؐ کی مدنظر اصلاحات کی نوعیت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ تاریخ سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ آپؐ کی وفات پر ملک عرب ان تمام عیوب سے پاک ہو چکا تھا۔ بیعت کے مذکورہ بالا الفاظ میں ایک لفظ ایسا بھی ہے۔ جس سے آپؐ کی شخصیت کی برتری اور خوبی کا اندازہ ہو سکتا ہے اور وہ بے نفسی ہے جو دراصل تمام اخلاقی خوبیوں کی بنیاد ہے۔ مثلاً محبت، فیاضی، جرأت، دیانت انصاف پسندی وغیرہ وغیرہ۔ میری رائے میں ہر اخلاقی نیکی اسی صفت "بے نفسی" پر مبنی ہے۔ اس بیعت میں آپؐ نے اطاعت کا عہد تو بیشک لیا ہے۔ لیکن اپنی بڑائی کی خاطر نہیں بلکہ صداقت اور راستی کی راہ میں کام کرنے کے لئے۔ بہرکیف بیعت کے بعد اہلِ مدینہ واپس گئے۔ اور آنحضرتؐ نے ان کے ساتھ ایک صحبت یافتہ صحابی کو کر دیا۔ تاکہ وہ انہیں احکام دینی سمجھاتے رہیں۔ اگرچہ مدینہ میں اسلام پھیلنا شروع ہو گیا۔ لیکن مکہؔ میں آپؐ پر سخت ترین زمانہ گزرا۔ یہ ضرور ہے۔ کہ اس وجہ سے آپؐ کا جوہر ذاتی نمایاں ہو گیا۔ آپؐ کے کیرکٹر کی عظمت اور اعتماد علی اللہ ان دو باتوں نے ایک زمانہ کو حیران کر دیا۔ آپؐ کا قوتِ ارادی کے ساتھ اپنے خیال پر قائم رہنے۔ دشمنوں کی مخالفت کے باوجود دن رات تکمیل مقاصد میں کوشش کرنے اور اپنے مقاصد کی کامیابی کا یقین رکھنے کی وجہ سے سر ولیم میور جیسے مخالفین کو آپؐ کی عظمت عُلوِ مرتبت اور بے نظیر شخصیت کا

اعتراف کرنا پڑا۔

محمدؐ نے دشمنوں کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ انھیں مٹھی بھر آدمیوں کے ساتھ، دن رات اپنی کامیابی کا انتظار تھا۔ بظاہر بالکل غیر محفوظ بلکہ یوں کہیئے کہ شیر کے منہ میں رہ کر یہ ہمت اور استقلال دکھایا کہ اُس کی نظیر اگر کہیں مل سکتی ہے تو صرف بائیبل میں جہاں ایک نبی کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے ایک موقعہ پر خدا سے کہا تھا صرف میں ہی باقی رہ گیا ہوں"۔ (لائف آف محمد جلد دوم صفحہ ۲۲۸)

دوسرے سال جب اہل مدینہ پھر مکہ آئے تو پچھتر آدمیوں کو ساتھ لائے۔ جنہوں نے آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کی اور مدینہ تشریف لانے کی درخواست کی۔ آپؐ نے ان لوگوں سے کہا کہ مجھ سے بیعت کر کے آپ لوگوں نے اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈال لیا ہے۔ مجھے بلا کر آپ کی دشواریاں اور بھی بڑھ جائیں گی۔ لیکن انھوں نے کہا کہ ہم نے خوب سمجھ سوچ کر آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کی ہے آپ جو حکم دیں گے بسر و چشم بجا لائیں گے۔ ہم سے دوسری بیعت لے لیجئے۔ اس پر آپؐ نے ان سے بیعت اطاعت لی انھوں نے دریافت کیا۔ اگر ہم خدا کی راہ میں مارے جائیں تو کیا انعام ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا "آیندہ زندگی میں راحت اور آرام" غور کیجئے کہ آپؐ نے ان سے یہ وعدہ نہیں کیا کہ بادشاہت ملے گی یا تمہارے بچے میرے تخت جلال کے دائیں جانب بیٹھیں گے۔

اہل مدینہ کی یہ تجویز اگرچہ خلوت ہی میں کی گئی تھی۔ لیکن کسی نہ کسی طرح اہلِ مکہ کو اس کا علم ہو گیا اور انھوں نے ایذا رسانی میں شدت کر دی۔ آپؐ کے رفقا کی جانیں بالکل خطرہ میں معلوم ہوتی تھیں اور یہ گمان غالب تھا۔ کہ کسی روز سب کا قتل عام ہو جائے گا۔ لہٰذا آپؐ نے انکو مدینہ چلے جانے کی صلاح دی۔ اس پر مسلمانوں کے خاندان آہستہ آہستہ مکہ سے مدینہ کو منتقل ہونے لگے۔ لیکن آپؐ جگہ سے نہ ہلے۔ آخر کار امتحان کا وقت سر پر آ گیا۔ اگرچہ اہلِ مدینہ نے آپؐ کے ہجرت فرمانے کے لئے جملہ انتظامات مکمل کر دیئے تھے۔ لیکن آپؐ نے فرمایا۔ کہ جب تک ایک مسلمان بھی مکہ میں موجود ہو گا۔ میں مدینہ نہ جاؤں گا۔ غرضیکہ سوائے حضرت ابو بکر صدیقؓ اور علیؓ کے اور سب مسلمان مدینہ پہنچ گئے۔

جب قریش نے یہ صورت حال معائنہ کی تو اکابرین کی ایک مجلس قائم کی۔ اور آپؐ کے قتل

کا فیصلہ کیا گیا۔ مختلف قبائل سے ایک ایک شمشیر زن منتخب ہوا۔ تاکہ سب مل کر آپؐ کو قتل کریں، انھوں نے تمام رات آنحضرتؐ کے مکان کے گرد پہرا دیا۔ لیکن آپؐ نے علیؓ کو اپنے بستر پر لٹا دیا۔ اور خود حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ساتھ لے کر راتوں رات مکّہ سے باہر نکل گئے۔ اور تین دن تک غارِ ثور میں پوشیدہ رہے۔

اب قریش کے غصّہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ انھوں نے چپّہ چپّہ چھان مارا۔ اور آپؐ کے سر کیلئے انعام مقرر کیا۔ دشمنوں نے آپؐ کے نقوشِ قدم سے آپؐ کے راستہ کا پتہ چلایا۔ اور غار کے قریب پہنچ گئے۔ جب حضرت ابوبکرؓ نے ان کے پاؤں کی آہٹ سنی تو آپؐ کی وجہ سے متفکّر ہو کر کہنے لگے۔ "یا رسول اللہ ہم تو صرف دو ہی ہیں اور دشمن بہت ہیں۔" اگرچہ اس موقعہ پر دونوں صاحبوں کی جانیں خطرہ میں تھیں۔ لیکن جو جواب آپؐ نے دیا۔ اس سے آپؐ کی اس طمانیتِ قلب اور اعتماد علی اللہ کا پتہ چلتا ہے۔ جو دُنیا کی دیگر مقتدر ہستیوں میں نہیں پایا جاتا۔ آپؐ نے بڑے وثوق کے ساتھ فرمایا۔ "اے ابوبکر! غم نہ کرو، خدا ہمارے ساتھ ہے۔" تیسرے دن شام کے وقت آپؐ موقعہ پاکر غار سے نکلے۔ اور غیر معروف راستوں سے ہو کر بخیر و عافیت مدینہ پہنچ گئے۔

حالاتِ مابعد قلمبند کرنے سے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپؐ کی مکی زندگی کا اجمالی خاکہ سیّد امیر علی کی کتاب اسپرٹ آف اسلام سے اس جگہ نقل کر دیا جائے۔ سیّد محترم لکھتے ہیں:

"گزشتہ صفحات سے معلوم ہو گیا ہو گا۔ کہ آپؐ ایامِ طفلی ہی میں یتیم ہو گئے تھے۔ پیدائش سے پہلے باپ کا انتقال ہو گیا اور بچپن ہی میں ماں کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا۔ یعنی آپؐ نے شفقتِ پدری اور محبّتِ مادری دونوں میں سے ایک کا لطف بھی نہ اٹھایا۔ آپؐ کی بچپن کی زندگی درد و غم سے بھری ہوئی تھی۔ اور آپؐ کا زمانۂ طفولیّت جس قدر غور و فکر میں گزرا۔ اسی طرح آپؐ کی نوجوانی بھی۔ اور آپؐ کی جوانی بھی ویسی ہی پاکیزہ تھی جیسی کہ زمانۂ طفولیّت۔ آپؐ مساکین اور غم زدوں سے ہمدردی کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے۔ خدا کی جملہ مخلوقات کے لئے آپؐ کے دل میں محبّت کے جذبات موجزن رہتے تھے۔ آپؐ اس درجہ بردبار اور پاکیزہ خصائل واقع ہوئے تھے۔ کہ جب کبھی کسی راہ سے گزرتے تو لوگ آپؐ کی طرف اشارہ کر کے کہتے۔ یہ نہایت راستباز دیانتدار اور لائق

اعتماد ہے۔ اور فی الواقع "امین" ہے۔ آپؐ ایک وفادار دوست اور حق شناس خاوند تھے۔ زیادہ وقت آپؐ کا رازِ حیات و ممات کی تحقیق میں بسر ہوتا تھا۔ انسانی فرائض و تکلیفات اور حیاتِ ارضی کے مقاصد پر غور کرنا آپؐ کا واحد مشغلۂ زندگی تھا۔ کیونکہ آپؐ نے تمام دنیا کی اصلاح اور بہبودی کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ اور اس بڑے کام میں صرف ایک شخص آپؐ کا ہمدرد اور غمگسار تھا۔ یعنی آپؐ کی زوجۂ محترمہ رضؓ ناکامیوں سے سابقہ ہوا۔ مگر آپؐ کبھی بد دل نہ ہوئے۔ فسخ عزائم سے دوچار ہوئے۔ مگر کبھی ہمت نہ ہاری۔ بلکہ غیر معمولی جُرأت کے ساتھ مردانہ وار تا طورۂ کامیابی سے ہم آغوش ہونے کے لئے آگے ہی قدم بڑھایا۔ آپؐ کی پاکیزگیٔ طینت، علوِ ہمت اور اعتماد علی رحمت اللہ کی وجہ سے بہت سے مخلصین آپؐ کے گرد پروانہ وار جمع ہو گئے۔ اور جب نازک وقت آیا تو بہادر جہاز ران کی طرح آپؐ مضبوطی کے ساتھ اپنی جگہ پر قائم رہے۔ تا وقتیکہ آپؐ کے تمام ساتھی خطرہ کی زد سے باہر نہ ہو گئے۔ اور واقعی آپؐ نے ایسا ہی کر کے دکھا بھی دیا۔ اب ہم آئندہ صفحات میں پڑھیں گے۔ کہ خدا نے آپؐ کو بادشاہ اور حکمران بنا دیا۔ قانون سازی اور تعزیرات کے جملہ حقوق عطا کئے۔ لیکن آپؐ کی فروتنی بردباری اور خاکساری میں کوئی فرق نہ آیا۔ اور اس کے بعد آپؐ کی زندگی۔ اس مملکت کی زندگی میں مدغم ہو جاتی ہے۔ جس کا مرکز آپؐ ہی کی ذات تھی۔ اور اگرچہ آپؐ اپنے پھٹے ہوئے لباس میں خود ہی پیوند لگا لیتے تھے۔ لیکن شوکت و اقتدار دنیوی کے لحاظ سے دنیا کا کوئی بادشاہ آپؐ کی ہمسری نہیں کر سکتا تھا"۔

آپؐ کی مدنی زندگی انسانی کیریکٹر کی زنجیر کی ایک زبردست کڑی ہے۔ کیونکہ جو تعلیم آپؐ نے مکّہ میں پیش کی تھی۔ مدینہ میں اسے عملی رنگ میں پیش کرنے کا آپؐ کو موقعہ ملا۔ آپؐ نے شریعتِ موسوی میں اصلاح فرمائی۔ اور جس آسمانی بادشاہت کے لئے حضرت یسوع چشم براہ تھے، اس کو فی الحقیقت دنیا میں قائم کر دیا۔ آپؐ نے اپنے متبعین کے اخلاق اس درجہ بلند کر دیئے۔ کہ ارسطو اور افلاطون جس نظامِ حکومت کا خواب دیکھا کرتے تھے، اسے لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ آپؐ کے دم قدم سے دنیا میں پہلی مرتبہ حقیقی جمہوری حکومت قائم ہوئی۔ آپؐ نے ایسی سلطنت کی بنیاد ڈالی جس میں معصوم اور شریف آدمی فرائضِ حکومت بجا لاتے تھے۔ نہ ان کو قابو میں رکھنے کے لئے پولیس کے

ضرورت تھی۔ اور نہ ان کے دلوں میں کسی قسم کا نسلی قومی جماعتی یا لونی تعصب موجود تھا۔ اور نہ حاکم ومحکوم میں کسی قسم کا امتیاز پایا جاتا تھا۔

قومیت نسب ذات پات وغیرہ کے سارے امتیازات مٹا دیئے گئے۔ کالے گورے سرخ اور پیلے ہر رنگ کے آدمی خدا کی نظر میں برابر قرار پائے۔ کیونکہ وہ سب آدمؑ کی اولاد ہیں۔ نسل، خون، اور دولت کے امتیازات کو مٹانے کے لیئے یہ اصول وضع کیا گیا۔ کہ خدا کے نزدیک معزز وہ ہے۔ جو پرہیز گار ہو اور جس قدر کوئی شخص زیادہ پرہیز گار ہوگا۔ اسی قدر معزز ہوگا۔ تاریخ عالم میں پہلی مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ نے یہ اصول قائم کیا۔ کہ جب تک رعایا کو حقِ رائے دہندگی نہ حاصل ہو۔ اس وقت تک کوئی حکومت صحیح معنی میں حکومت کہلائے جانے کی مستحق نہیں ہے۔ چنانچہ آپؓ نے سلطنت کے ادنیٰ ترین فرد کو بھی وہی حقوق عطا کیئے جو خود بادشاہ کو حاصل تھے۔ اسی طرح تاریخ عالم میں پہلی مرتبہ نسلاً بعد نسلاً حکومت کرنے کے طریق کی جگہ کثرت رائے سے بادشاہ بنانے کے اصول کو رائج کیا گیا۔ اور غور طلب بات صرف یہ ہوتی تھی۔ کہ جو کوئی بھی بادشاہ منتخب ہو۔ وہ شریعت اسلامی کو مشعلِ راہ بنائے۔ اور جملہ جزئیات امور میں ان کلیات کی متابعت کی جائے۔ جو شارع اعظمؐ نے قائم فرمادی تھیں۔ چنانچہ اس زمانہ میں ایک معمولی مزدور کو یہ حق حاصل تھا کہ امیر المومنین پر بھی اعتراض کر سکے، اگر کوئی بات فی الحقیقت اس کی نظر میں اسلامی زاویہ نگاہ سے مذموم معلوم ہو۔ سلطنت سب کا حق ہے۔ اور سب خدائے واحد کے یکساں غلام تھے۔ سب ایک ہی قانون کی جو انسان کا وضع کردہ نہ تھا۔ بلکہ خدائے قدوس کا عطیہ تھا۔ پابندی کرتے تھے۔ اور یہ قانون امیر و غریب سب کے لئے یکساں تھا۔ حضرت یسوع نے تو سوشیلزم کا محض خواب ہی دیکھا تھا۔ لیکن آنحضرت نے سچ مچ مساواتِ انسانی کا نظارہ دنیا کو دکھا دیا۔ اور آپؐ نے تمام کام اپنے ہاتھ سے انجام دے کر محنت مزدوری کو دوامی عزت اور شرف عطا کر دیا۔

آپؐ اس بات کو کبھی پسند نہ فرماتے تھے کہ آپؐ کے ذاتی کاموں کو دوسرے لوگ انجام دیا کریں۔ سارا کام خود اپنے ہاتھوں سے انجام دیتے تھے۔ خانگی کاموں سے بھی عار نہ تھا جھاڑو دیتے بازار سے سودا لاتے جوتی کی مرمت کرتے کنوئیں سے پانی بھر کر لاتے اونٹوں کو باندھتے کھولتے

آٹا گوندھتے اور پیوند پارہ لگا لیتے تھے۔ حضرت انس رضؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن میں نے دیکھا کہ آپؐ اونٹوں کے تیل مل رہے تھے۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ صدقہ کے اونٹوں کو داغ رہے تھے۔ بچپن میں آپؐ نے خانہ کعبہ کی تعمیر میں امداد دی۔ یعنی اینٹ اور چونا لا لا کر معماروں کو دیا۔ جب خانہ کعبہ یا مسجد نبوی کی تعمیر یا خندقوں کے کھودنے کا کام درپیش ہوا۔ تو عام آدمیوں اور آنحضرتؐ میں کوئی تمیز نہیں کر سکتا تھا۔

کل جزیرۃ العرب آپؐ کے زیرنگین ہو گیا تھا۔ اور مدینہ میں دولت کی افراط ہو گئی تھی لیکن آپؐ کا مقولہ اس وقت بھی یہی تھا۔ کہ ایک انسان کو اپنی زندگی بسر کرنے کے لیے صرف ان اشیاء کی ضرورت ہے۔" رہنے کے لیے مکان، تن ڈھانکنے کے لیے دو کپڑے، کھانے کے لئے دو روٹیاں اور ایک پیالہ پانی۔"

آپؐ کی مدنی زندگی کا مطالعہ کرنے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے۔ کہ حصولِ مملکت آپؐ کا مقصدِ حیات ہرگز نہ تھا۔ بادشاہت از خود آپؐ کے قدموں میں آگئی اور آپؐ نے دنیا کے بادشاہوں کو دکھا دیا۔ کہ بیت المال اور جمیع خزائن ارضی رعایا کی بہبودی کے لئے ہیں۔ نہ ذاتی عیش و عشرت کے لئے۔

آپؐ کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ جو لباس میسر آجاتا اسی کو زیب تن فرما لیتے اور جو کچھ کھانا سامنے آتا اسی کو تناول فرما لیتے۔ جہاں جگہ ہوتی وہیں تشریف فرما ہو جاتے۔ خواہ چٹائی ہو یا فرش، دری ہو یا قالین۔ بغیر چھنا آٹا استعمال فرماتے۔ آپؐ کی قمیص عموماً بغیر بٹن کی ہوتی تھی۔ آرائش سے آپؐ کو دلی نفرت تھی۔ بیش قیمت لباس سے آپؐ کو طبعی نفرت تھی۔

اسلام رہبانیت کو پسند نہیں کرتا۔ اسی وجہ سے آپؐ نے لذائذ دنیوی کو جائز قرار دیا۔ اور خود بھی ان سے متمتع ہوئے۔ باایں ہمہ تن آسانی اور عیش پرستی کو آپؐ نے جائز قرار نہیں دیا۔ اور اس طرزِ زندگی کو جو رؤسا و امراء میں پائی جاتی ہے۔ آپؐ نے پسند نہیں فرمایا۔ بلکہ اس سے محترز رہنے کی نصیحت فرمائی۔ کیونکہ اس سے انسان میں مردانہ صفات زائل ہو جاتی ہیں۔ حضرت علیؓ کے ایک دوست نے ایکدفعہ کھانا بھیجا حضرت فاطمہ رضؓ نے ان سے کہا " کیا اچھا ہوتا اگر آنحضرتؐ بھی آج ہمارے ساتھ شریکِ طعام ہوتے۔"

یہ سن کر حضرت علیؓ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور آپؐ کی بیٹی کا پیغام پہنچایا۔ آپؐ ان کے ساتھ بیٹی کے گھر تشریف لائے۔ جبکہ اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ دیواروں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر آپؐ واپس ہو گئے۔ حضرت علیؓ نے سبب دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا "جس گھر میں اس قدر آرائش ہو، نبی کے لئے زیبا نہیں کہ اس میں داخل ہو"۔

آپؐ فرمایا کرتے تھے۔ کہ ایک مکان میں تین پلنگ کافی ہیں۔ ایک اپنے لئے دوسرا زوجہ کیلئے تیسرا مہمان کے لئے۔

عاجزی اور خاکساری کے جذبات کے ماتحت آپؐ عموماً موٹا جھوٹا کپڑا استعمال فرماتے تھے حضرت فاروقِ اعظمؓ کا خیال تھا۔ کہ جب غیر حکومتوں کے سفراء شرفِ باریابی حاصل کریں۔ تو آپؐ کو بیش قیمت لباس زیب تن کرنا چاہیئے۔ چنانچہ جب ایک بیش قیمت خلعت بازار میں فروخت ہونے کے لئے آیا۔ تو انہوں نے آپؐ کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی۔ کہ خطبۂ جمعہ اور دیگر مواقع کے لئے اُسے خرید لینا چاہیئے۔ حضورؐ نے فرمایا "اس کو وہ شخص پہنے جسے آخرت سے حصّہ لینے کی آرزو نہ ہو"۔ عموماً آپؐ ادنےٰ قسم کے کپڑے پہنتے تھے۔ اور اسی قسم کے لباس میں رحلت فرمائی۔

ایک دفعہ مشربہ میں حضرت عمرؓ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دیکھا کہ آپؐ صرف ایک قمیص پہنے ہوئے تھے۔ چارپائی پر کسی قسم کا بستر وغیرہ نہ تھا۔ صرف ایک تکیہ سرہانے رکھا تھا۔ جس میں کھجور کے پتے بھرے ہوئے تھے۔ ایک گوشہ میں تھوڑے سے جَو رکھے ہوئے تھے۔ دوسرے میں کھال پڑی ہوئی تھی۔ اور دو تین مشکیزے لٹک رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے جب یہ حالت دیکھی تو ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ آنحضرتؐ نے روتے کا سبب دریافت فرمایا۔ انہوں نے عرض کی "یارسول اللہ! آپؐ کے جسد مبارک پر کھرّی چارپائی کے باتوں کے نشان بنے ہوئے ہیں۔ کمرہ میں کوئی چیز آسائش کی نظر نہیں آتی۔ غضب کی بات ہے۔ کہ خسروِ ایران اور قیصرِ روم تو عیش و عشرت میں زندگی بسر کریں۔ اور آپؐ برگزیدۂ خدا ہو کر اس قدر تکلیف میں رہیں۔ آپؐ نے فرمایا" اے ابن الخطاب کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو کہ انہیں دنیا ملے اور مجھے آخرت"؟

آپؐ فرمایا کرتے تھے۔ کہ دنیا میں انسان کو صرف اسی قدر سامان کی ضرورت ہے۔ جس قدر

ایک مسافر کو کسی سفر پر جانے کے لئے ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ صحابہؓ نے آپؐ سے عرض کی۔ کہ اپنے پلنگ پر ایک گدا بچھا لیجئے۔ آپؐ نے فرمایا "مجھے اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ مجھے اس دنیا سے صرف اسی قدر تعلق ہے جس قدر کسی مسافر کو۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے کسی درخت کے سایہ میں بیٹھ جاتا ہے۔ پھر وہاں سے چل دیتا ہے۔ اور پیچھے مڑ کر دیکھتا بھی نہیں۔"

میں نے آپؐ کے کیریکٹر کے مختلف پہلوؤں کو جو دراصل مجموعۂ حسنات ہیں۔ بخوبی واضح کر دیا ہے۔ یہ صفات انسانی اخلاق کو مکمل کرنے کے لئے بالکل کافی ہیں۔ لیکن ان میں زیادہ تر ایسی ہیں۔ جو بلند مرتبہ زندگی میں ظاہر ہوتی ہیں۔ سعدیؒ لکھتے ہیں۔

تواضع زگردن فرازاں نکوست　　　　گدا اگر تواضع کند خوئے اوست

حالتِ افلاس میں عموماً لوگ صفات حسنہ کا اظہار کرتے ہیں۔ مثلاً مفلس آدمی عموماً متواضع اور حلیم ہوتا ہے۔ لیکن ایسی صورت میں یہ معلوم کرنا دشوار ہے۔ کہ یہ صفت عالی ہمت انسان سے ظاہر ہوئی یا کسی بزدل سے۔ لیکن یہی تواضع اور انکساری اگر کسی عالی رتبہ اور ذی مقدرت انسان سے ظاہر ہو تو بیشک اسے حامل صفاتِ حسنہ کہا جائے گا۔ مختصر یہ کہ وہ تمام امور جن سے کیریکٹر کی بلندی ظاہر ہوتی ہے۔ آپؐ کی مدنی زندگی میں ظاہر ہو گئے۔ آپؐ کی مدنی زندگی ہی کی بدولت بہت سے امور حل ہو گئے۔ جب آپؐ کے دشمن اسلام اور آپؐ کو مع رفقاء تباہ کرنے یعنی روئے زمین سے توحید کا نقش مٹانے کے لئے آئے۔ جیسا کہ جنگ بدر کے موقعہ پر آپؐ نے خود اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمایا تھا۔ کہ "اے خدا! اگر یہ مٹھی بھر جماعت کفار کے ہاتھوں برباد ہو گئی۔ تو تیرا نام لینے والا روئے زمین پر باقی نہ رہے گا۔" اس وقت دنیا کو تلوار کا صحیح استعمال معلوم ہوا۔ اور عورت اور غلامی کے مسائل کا حل نصیب ہوا۔ اس سے پہلے ان دونوں کے ساتھ دنیا نے نہایت برا سلوک کیا تھا۔ جنگوں کی بدولت آپؐ کو ان کی اصلاحات کا موقعہ ملا۔ اور آپؐ نے بہت سے قوانین ان کی بہبودی کے لئے وضع فرما دیئے۔ آپؐ نے اپنے دشمنوں سے عہد نامے بھی کئے۔ لیکن اپنے طرز عمل سے ثابت کر دیا۔ کہ وہ عہد نامے مقدس دستاویزات تھے نہ کہ کاغذ کے پُرزے۔ کاش یورپ نے آپؐ کو نمونہ بنایا ہوتا۔ تو دُنیا ان ہولناک مصائب سے بچ جاتی۔ جو دورانِ جنگ عظیم میں برپا ہوئے۔ رہے حضرتِ یسوع۔ سو ان کی زندگی میں تو کوئی بات ایسی ہے نہیں۔ جو

زندگی کی بلند شاہراہوں میں انسانوں کی راہنمائی کرسکے۔

صلح حدیبیہ کی شرائط میں جو ۶ھ میں ہوئی تھی۔ ایک شرط یہ تھی۔ کہ اگر کوئی مکہ کا باشندہ اسلام لا کر مدینہ میں آجائے۔ اور مسلمانوں میں پناہ گزیں ہو جائے۔ تو آنحضرتؐ اس شخص کو فوراً مکہ والوں کو واپس کر دیں گے۔ اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد ایک نومسلم ابوجندل نامی دشمنوں کی قید سے بھاگ کر مدینہ میں نبی کریم کے پاس پناہ گزیں ہو گیا۔ جس وقت اس نے اپنی دردبھری داستان سنائی۔ تو مسلمانوں پر رقت طاری ہو گئی۔ لیکن نبی کریم نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ فرمایا "ابوجندل صبر کرو! جو عہد ہم مکہ والوں سے کر چکے ہیں۔ اس کو توڑ نہیں سکتے۔ خدا تمہاری مشکل آسان کر دے گا۔" اس کے علاوہ بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ بارہا نومسلم، کفار کے ظلم وستم سے تنگ آکر مسلمانوں کے پاس مدینہ میں پناہ گزین ہوئے۔ لیکن آپؐ نے ہمیشہ ان کو واپس دے دیا۔ حالانکہ آپؐ جانتے تھے۔ کہ مکہ جا کر ان پر دگنا ظلم ہو گا۔ ایک شخص نے جس کا نام وحشی تھا۔ آپؐ کے چچا کو قتل کیا تھا۔ اس لئے فتح مکہ کے بعد یہ شخص روپوش ہو گیا تھا۔ کیونکہ اسے خیال تھا۔ کہ اگر مسلمانوں کے ہاتھ پڑ گیا تو وہ آنحضرتؐ کے سامنے پیش کر دیں گے۔ اور آپؐ قتل کرا دیں گے۔ اتفاق دیکھئے کہ طائف کے لوگوں نے جو وفد حضورؐ کی خدمت میں بھیجا۔ اس میں یہ شخص بھی شامل تھا۔ اس نے ان سے اپنا خوف ظاہر کیا۔ لیکن انہوں نے اسے یہ اطمینان دلایا۔ کہ آنحضرتؐ سے بعید ہے۔ کہ وہ کسی سفیر کو قتل کریں۔ چنانچہ وہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور آپؐ کے حسن سلوک سے اس قدر متاثر ہوا۔ کہ ایمان لے آیا۔

ابورفیع نامی ایک غلام اسلام لانے سے قبل قریش کا پیغام لے کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جب اس نے آپؐ کا نورانی چہرہ دیکھا تو دل میں آپؐ پر ایمان لے آیا۔ اور کہنے لگا "یا رسول اللہ اب میں کفار کے پاس واپس جانا نہیں چاہتا۔" آپؐ نے فرمایا "میں معاہدہ سے خلاف ورزی نہیں کر سکتا تم کو واپس جانا ہو گا۔ لیکن اگر وہاں پہنچ کر بھی تمہارے دل کی یہی کیفیت رہے تو پھر چلے آنا۔" چنانچہ وہ غلام واپس چلا گیا۔

ایفائے عہد کے سلسلہ میں ایک واقعہ اور قابل ذکر ہے۔ دعویٰ نبوت سے قبل ایک شخص عبداللہ ابن ابی اسماء نے آپؐ سے کوئی تجارتی معاملہ کیا۔ چونکہ اسے دوسری جگہ کسی کام سے جانا تھا۔

اس لئے اس نے آپؐ سے کہا۔ کہ اسی جگہ میرا انتظار کیجئے میں بہت جلد واپس آکر معاملہ طے کر دوں گا۔ یہ کہہ کر وہ شخص چلا گیا۔ سو اتفاق سے وہ اپنا وعدہ بھول گیا۔ تیسرے دن یہ خیال آیا۔ کہ آپؐ سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ جب وہ جائے ملاقات پر پہنچا۔ تو آپؐ کو بدستور وہیں موجود پایا۔ اسے دیکھ کر آپؐ نے فرمایا "میں تین دن سے اسی جگہ تمہارا انتظار کر رہا ہوں"۔ ایفائے عہد کی پابندی ہی کی وجہ سے لوگوں نے آپؐ کو "امین" کا لقب دیا تھا۔ منجملہ دیگر سوالات کے جو قیصر روم نے آپؐ کے متعلق ابوسفیان سے کئے تھے۔ ایک یہ تھا۔ کیا محمدؐ نے کبھی خلاف ورزی عہد کی ہے؟ ابوسفیان کو اعتراف کرنا پڑا۔ کہ آپؐ نے ہمیشہ اپنے قول کا پاس کیا ہے۔

جنگ بدر کے موقعہ پر دشمن کی فوج آپؐ کی فوج سے تگنی تھی۔ ایسے نازک موقع پر قدرتاً ہر شخص کو یہ خیال ہوتا ہے۔ کہ حتی الوسع اپنی جماعت میں اضافہ ہو جائے۔ اور اگر آپؐ اس خیال پر کاربند ہوتے تو کوئی عیب نہ تھا۔ لیکن آپؐ تو مجسم وفا تھے۔ آپؐ کے دو صحابی ابوحذیفہ اور ابوحسل مکہ سے مدینہ آرہے تھے راہ میں دشمنوں نے روک لیا۔ اور اس شرط پر رہائی دی۔ کہ آپؐ کے ساتھ جنگ میں شریک نہ ہوں۔ واپس آکر انہوں نے ماجرا بیان کیا۔ آپؐ نے فرمایا "تم اپنے عہد کی پابندی کرو۔ مجھے خدا کی مدد کافی ہے۔"

آپؐ کی مکی زندگی سراپا مصائب اور تکالیف کا مجموعہ تھی۔ مدینہ آکر صورتِ حال بدل گئی۔ اور خدا نے آپؐ کو کامیابی اور فارغ البالی عطا فرمائی۔ اس میں مسلمانوں کے لئے بڑا سبق موجود ہے۔ ان کی موجودہ حالت آپؐ کی مکی زندگی سے مشابہ ہے۔ یہ ان کے امتحان کا وقت ہے۔ اگر وہ آپؐ کی طرح مستقل مزاج رہیں گے۔ اگر وہ اعلٰے اخلاق دکھائیں گے۔ متحد اور پر جوش رہیں گے۔ اگر وہ اپنے ساتھ اپنے بھائیوں کے ساتھ۔ اپنے رسولؐ کے ساتھ۔ اور اپنے خدا کے ساتھ صادق القول اور صادق الوعد رہیں گے۔ تو انھیں بھی وہی کامیابی نصیب ہوگی۔ جو آپؐ کو ہوئی۔

مدنی زندگی میں ان کامیابیوں کی بدولت آپ کو ان اخلاق فاضلہ کے دکھانے کا موقعہ ملا۔ جن کی نظیر پیش کرنے سے دنیا کی تاریخ سراسر قاصر ہے۔ فتح مکہ کے بعد آپؐ کو انتقام لینے کا کافی موقعہ ملا تھا لیکن آپؐ نے کسی شخص سے ان تکالیف کا بدلہ نہیں لیا جو قیام مکہ کے زمانہ میں آپؐ کو دن رات پہنچی تھیں۔

خیبر میں ایک یہودیہ نے آپؐ کے کھانے میں زہر ملا کر آپؐ کو مار ڈالنا چاہا۔ کھانے کے بعد آپؐ کو احساس ہوا۔ کہ کھانے میں زہر ملا ہوا تھا۔ آپؐ نے یہود کو بلایا۔ اور ان سے اصل معاملہ دریافت فرمایا۔ انہوں نے اقرار کیا۔ کہ کھانے میں بیشک زہر ملا دیا گیا تھا۔ آپؐ نے کسی سے کچھ تعرض نہ کیا۔ لیکن ایک صحابی اس زہر کے اثر سے جاں بحق ہو گئے۔ بغوائے قصاص وہ یہودیہ قتل کر دی گئی۔ روایت میں ہے کہ اس زہر کا اثر تمام عمر آپؐ کو محسوس ہوتا رہا۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے آپؐ کی جان کا قصد کیا۔ جب گرفتار ہو کر وہ شخص آپؐ کے سامنے آیا تو ڈر کے مارے تھر تھر کانپنے لگا۔ آپؐ نے فرمایا "ڈرو مت! اگر تم قتل کرنے کا موقعہ پاتے تو بھی مجھے قتل نہ کر سکتے تھے۔"

عمیر ابن وہاب آپؐ کا جانی دشمن تھا۔ صفوان ابن امیہؓ نے اُسے انعام کا لالچ دے کر آپؐ کو قتل کرنے کی غرض سے مدینہ بھیجا۔ یہ شخص اپنی تلوار کو زہر میں بجھا کر مدینہ آیا لیکن صحابہؓ کو اس کے ارادہ کا پتہ چل گیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے اسے قتل کرنا چاہا۔ لیکن آپؐ نے ان کو روکا۔ اور عمیر کو اپنے پاس بلا کر باتوں باتوں میں اس پر ظاہر کر دیا۔ کہ آپؐ کو اس کے ارادہ سے واقفیت ہو چکی تھی۔ وہ شخص ششدر رہ گیا۔ اور آپؐ کی شانِ کریمی کو دیکھ کر فوراً مسلمان ہو گیا۔ اور جب وہ مکہ واپس گیا۔ تو اس کی ماہیت مقلوب ہو چکی تھی۔ آیا تھا قتل کے ارادہ سے۔ واپس گیا مبلغ اسلام ہو کر۔ سبحان اللہ! یہ واقعہ ۳ھ کا ہے۔

ایک دفعہ جب کہ آپؐ مع صحابہؓ میدان جنگ سے واپس آ رہے تھے۔ تو راہ میں گرمی سے بچنے کیلئے ایک سایہ دار درخت کے نیچے آرام کی نیت سے لیٹ گئے۔ دشمن آپؐ کے تاک میں لگے ہوئے تھے موقعہ پا کر ایک کافر آپؐ کے قریب آیا۔ اور شاخ سے آپؐ کی تلوار اتار کر قتل کے ارادہ سے آگے بڑھا۔ حسن اتفاق سے آپؐ کی آنکھ کھل گئی۔ اس شخص نے تلوار سونت کر آپؐ سے کہا "محمدؐ اب تمہیں کون بچا سکتا ہے؟" آپؐ نے نہایت طمانیت قلب کے ساتھ ارشاد فرمایا۔ "اللہ" آپؐ کا بے نظیر استقلال دیکھ کر اس شخص کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ پڑی اور سکتہ کا عالم طاری ہو گیا۔ اس اثناء میں آپؐ کے اصحاب بھی بیدار ہو گئے آپؐ نے یہ معاملہ ان سے بیان کیا۔ اور اس شخص کو واپس جانے کی اجازت دے دی۔

باب ہفتم

حصول منتہائے کامیابی

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (المائدہ) ۵: ۳

"آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے کامل کر دیا۔ اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا۔"

حضرت موسیٰؑ کی تربیت ایک دولتمند اور شائستہ خاندان میں ہوئی۔ حضرت یسوعؑ اس قوم میں پیدا ہوئے جو بہترین تہذیب کی مالک تھی۔ لیکن آنحضرتؐ ان لوگوں کو خدا کے احکام سنانے کے لئے مبعوث ہوئے۔ جو ابتدائی تہذیب سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھے تھے۔ اور جہالت کے سمندر میں سرتاپا غرق تھے۔ آپؐ اس قوم کی اصلاح اور تزکیۂ نفوس کے لئے مبعوث ہوئے جو وحشت، جہالت، تعدی اور شرارت میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ آپؐ کو ان لوگوں کو کتاب و حکمت سکھانے کے لئے متعین کیا گیا۔ جو کامل تاریکی میں ملفوف اور یکسر ذہنی اور اخلاقی پستی میں گرے ہوئے تھے۔

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ

"وہی ہے جس نے اُمیوں کے اندر انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے۔ اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور وہ پہلے یقیناً کھلی گمراہی میں پڑے تھے۔"

(الجمعہ) ۶۲: ۲

نبی کی زندگی تن آسانی کی نہیں ہوتی۔ وہ اپنے ہی لوگوں میں مبعوث ہوتا ہے۔ اور انہی کو پیغام سناتا ہے۔ جو اسے بچپن سے جانتے ہیں۔ اور اس کی زندگی کے جزئیات تک سے واقف ہوتے ہیں۔

اور اس کے حسن و قبح کو بخوبی پہچانتے ہیں۔ رقابت اور حسد کی قوتیں بھی اس کے خلاف زور آزما ہوتی ہیں۔ حضرت یسوعؑ اپنے اقربا تک کو اپنا پیرو نہ بنا سکے۔ اور ان کا یہ مقولہ "کسی نبی کی عزت اپنوں میں یا اپنے وطن میں نہیں ہوتی" آپ بیتی ہے (متی ۱۳ : ۵۷) لیکن آنحضرتؐ جو اونٹ چرانے والے امی محض تھے۔ یتیم اور بیکس تھے۔ بلکہ ابو طالب کے لیے یک و تنہا ان تمام مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ اور ایسی عدیم النظیر کامیابی حاصل کی۔ جس کا جواب تاریخ انبیاء میں اس سرے سے اس سرے تک نہیں ملتا۔ بلند آہنگ دعاوی کرنا یا دور رس تجاویز سوچ لینا آسان ہے۔ مگر انہیں پورا کر کے دکھانا کارے دارد۔ آپؐ سے پہلے یسوعؑ موسےؑ اور بہت سے انبیاء اپنی کوششوں کو بار آور ہوتے نہ دیکھ سکے۔ اور ان میں سے ایک نبی تو اس قدر ناامید ہو گیا تھا۔ کہ اس کے دل میں یہ خدشہ گذر گیا۔ کہ کہیں خدا نے مجھے اپنے دل سے بھلا تو نہیں دیا۔ اور اگر ان میں سے کسی نے کچھ لوگوں کو اپنا پیرو بنا بھی لیا تو بھی وہ ان میں روح اعتماد و ایقان پیدا نہ کر سکا۔ بنی اسرائیل نے بارہا حضرت موسےؑ کی نافرمانی کی۔ پطرس اور دوسرے شاگردوں نے عین وقت پر اپنے آقا کا انکار کر دیا۔ لیکن آنحضرتؐ نے ان مغرور اہل مکہ کے سامنے جنہوں نے آپؐ کو ستایا، ایذا پہنچائی۔ آپؐ پر آوازے کسے، پتھر پھینکے۔ اپنا دعویٰ پیش کیا۔ ایک قلیل عرصہ میں انہی لوگوں کو قعرمذلت و جہالت سے نکال کر تہذیب و طہارت کے بلند ترین مقام پر پہنچا دیا۔ آپ کا زمانہ نبوت و رسالت تئیس سالوں پر منتہی ہوتا ہے۔ لیکن پانچ ہی سال کی قلیل مدت میں جو انقلاب ان لوگوں کی ذہنیت میں آپ نے پیدا کر دیا تھا۔ اس کا اندازہ اس تقریر سے ہو سکتا ہے۔ جو حضرت جعفر طیارؓ نے جو ان نوے مہاجرین میں سے تھے۔ جنہوں نے اہل مکہ کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر بادشاہ حبش کے دربار میں پناہ لی تھی اور بادشاہ مذکور کے سامنے کی تھی۔ "اے بادشاہ" (انہوں نے بیان کیا) "ہم ایک جاہل اور گمراہ قوم تھے۔ بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ مردار کھاتے تھے۔ اپنے ہمسائیوں کو ستاتے تھے۔ بدافعالیاں کرتے تھے۔ کمزوروں کا مال چھینتے تھے۔ تب خدا نے ہم میں ایک نبی کو مبعوث کیا۔ جس کی شرافت، صداقت، دیانت اور پاکبازی ہم سب پر روشن تھی۔ اس نے ہمیں خدائے واحد کی عبادت کی طرف بلایا۔ اور ان بتوں اور پتھروں کی پوجا کرنے سے روکا جن کو ہمارے آباء پوجا کرتے تھے۔ اس نے صرف ایک خدا کی اطاعت کا حکم دیا۔ کہ اس کے

ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ نماز، زکوٰۃ اور روزہ ہم پر فرض قرار دیا۔ سچ بولنے امانت کو دیانت کے ساتھ واپس کرنے رشتہ داروں اور ہمسایوں کے ساتھ نیک سلوک کرتے برائیوں سے بچنے عیاشی اور خونریزی سے احتراز کرنے کا حکم دیا۔ اس نے ہمیں نصیحت کی۔ کہ جھوٹ ہرگز نہ بولو' جھوٹی گواہی نہ دو، یتامیٰ کا مال نہ کھاؤ، اور نہ عورتوں پر شبہ کرو۔ نہ ان پر سوءظن رکھو۔ ہم نے اس کی تعلیم اور نصائح کو حرز جان بنایا ہم اس کی صداقت کے قائل ہو گئے۔ اور احکام الٰہی کی پابندی کی۔ اور اسکی توحید پر ایمان لائے۔ ہم منہیات سے محترز رہتے ہیں۔ اور اوامر پر کاربند ہیں۔ ہمارے احباب واقربا اس تبدیلی کی وجہ سے جو ہم میں رونما ہو گئی ہے۔ ہم سے ناراض ہیں۔ انہوں نے ہمیں حتے الوسع ستایا۔ اور ان بتوں کی پرستش اور بداعمالیوں کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی۔ جنہیں ہم ترک کر چکے ہیں۔ جب ان میں ہمارا رہنا ناممکن ہو گیا۔ اور ان کی ایذا رسانی ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ تو ہم نے ترک وطن کر دیا۔ اور آپکو ایک رحم دل بادشاہ یقین کر کے آپ کے ملک میں پناہ لینے کے لئے آئے ہیں"۔

ممکن ہے۔ بعض لوگ یہ خیال کریں کہ آنحضرت ؐ کی جو توصیف جعفر طیار نے کی۔ وہ فرطِ عقیدت کا نتیجہ ہے۔ یا اس بادشاہ کو خوش کرنے اور اپنے اوپر مہربانی کرنے کے لئے۔ تاکہ وہ رحم کھا کر انہیں پناہ دے اس لئے ہم اسلام کے ایک علانیہ دشمن کی شہادت پیش کرتے ہیں۔ سر ولیم میور لکھتا ہے۔

"محمد (صلعم) کی تعلیم بہت مختصر اور سادہ تھی۔ ان کی تعلیم نے حیرت انگیز تبدیلی پیدا کر دی۔ اور ایل مسیحیت سے لے کر تا ایں دم لوگوں میں ایسی روحانی بیداری کسی وقت میں بھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ نہ لوگوں کے اندر ایسا ایمانی جوش پیدا ہوا۔ کہ وہ اپنے ضمیر کی خاطر ہر قسم کی جانی و مالی قربانیاں گوارا کر سکتے"۔

مدت دراز سے تمام جزیرۃ العرب روحانی غفلت میں گرفتار تھا۔ یہودیت اور مسیحیت کا آنی اور وقتی اثر عربوں کی طبائع پر ویسا ہی ہوا۔ جیسے کہ سمندر کی سطح پر ہوا سے چند لہریں پیدا ہو جائیں۔ لیکن نہ آب وہی جمود اور سکون ہو۔ تمام لوگ توہمات خونریزی اور بدکاریوں میں مبتلا تھے۔ یہ ایک عام رسم تھی۔ کہ باپ کے مرنے کے بعد بیٹا متوفی کی ساری بیویوں کا بھی مالک ہو جاتا تھا۔ غرور اور مفلسی کی وجہ سے ان میں دختر کشی کی رسم عام ہو گئی تھی۔ ان کا مذہب بت پرستی کی بدترین شکل تھا۔ اور ان

کاایمان صرف یہ تھا۔ کہ ابناءُ الغیب پر خوف کی وجہ سے عقیدہ رکھیں۔ اور ان کی ناراضگی سے بچیں اور انہیں خوش رکھنے کی کوشش کریں۔ نہ یہ کہ کسی قادرِ مطلق ہستی کو اپنا معبود بنائیں۔ آخرت اور مکافاتِ عمل کی بناء پر کوئی اعمال ان سے سرزد ہوتے ہی نہ تھے۔ سنہ ھ کی ابتدا سے تیرہ سال پہلے تک تمام ملک اسی خوابِ غفلت میں گرفتار تھا لیکن آیندہ تیرہ سالوں میں نہایت زبردست انقلاب رونما ہوگیا۔ ڈیڑھ تین سو آدمیوں کی مٹھی بھر جماعت نے بُت پرستی کو ترک کرکے خدائے واحد کی پرستش اختیار کی۔ اور اس فرمان کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیا۔ جس کو وہ لوگ وحی یقین کرتے تھے۔ خدا کی عبادت ذوق و شوق سے ادا کرنے لگے۔ اور اس کے رحم کے امیدوار ہوگئے۔ نیک اعمال بجالانے لگے زکوٰۃ دینے لگے، پاکیزہ خصائل اور نیک دل بن گئے۔ اب وہ اپنی حیات کا ایک ایک لحظہ اس خدا کی یاد میں بسر کرنے لگے۔ جسے وہ اپنے جزئیاتِ امور کا نگراں یقین کرتے تھے۔ علاوہ بریں اس طرزِ زندگی کو وہ لوگ عطیۂ رحمتِ ربانی یقین کرتے تھے۔ محمدؐ کو وہ لوگ حیاتِ ابدی اور نشاطِ سرمدی کا عطا کنندہ یقین کرتے تھے۔ جس کے احکام کی تعمیل وہ لوگ بے چون و چرا کرتے تھے۔ اس قلیل عرصہ میں مکہ دو جماعتوں میں منقسم ہوگیا۔ جو اپنے سابقہ تعلقات کو ایک دم فراموش کرکے ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوگئیں۔ مسلمان جملہ تکالیف کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرتے تھے۔ اور ایسا کرنے کو مفید جانتے تھے۔ اور واقعی ان کی علو ہمت کی تحسین کرنی چاہیئے۔ پورے سو آدمیوں نے محض دینِ حنیف کی خاطر اپنے گھر بار دولت و اثاثہ کو چھوڑ کر ملک حبش میں پناہ لی۔ تاکہ مخالفت کا طوفان ذرا کم ہوجائے۔ اور اس کے بعد کئی سو آدمی مع محمدؐ اپنے مولد و منشاء مکہ کو چھوڑ کر جس میں کعبہ واقع ہے۔ مدینہ جارہے ہیں۔ اسی حیرت انگیز انقلاب کی بدولت تھوڑے ہی عرصہ میں ایک جماعت ایسی تیار ہوگئی تھی۔ جس نے ان سب کو اپنا حقیقی بھائی تصور کیا۔ پناہ دی۔ اور اپنی جان بیچ کر دشمنوں سے ان کی حفاظت کی۔ اہلِ مدینہ کے کانوں میں یہودیت کی آواز عرصہ سے آرہی تھی۔ لیکن یہ تاثیر پیغمبر عرب ہی کے الفاظ میں تھی۔ جس نے مدینہ والوں کو یکلخت بیدار کردیا۔ اور زندگی کی روح چھوٹے سے لے کر بڑے تک میں پھونک دی۔

مخالفین کو بھی مسلّم ہے۔ کہ آنحضرتؐ تمام مذہبی رہنماؤں میں سب سے زیادہ کامیاب انسان گزرے ہیں۔ آپؐ نے اپنی زندگی ہی میں عربوں کے اندر جیسا سیاسی، تمدنی، ذہنی اور مذہبی انقلاب پیدا کردیا۔ اس کی نظیر کسی ملک میں اور کسی زمانہ میں پے در پے مصلحین کی متحد کوششوں سے بھی نہیں پائی جاتی۔ آپؐ

کی آواز میں بجلی کی قوت موجود تھی۔ مدتِ مدید کی برائیاں جو طبیعت ثانی بن چکی تھیں۔ اس طرح کافور ہوگئیں۔ جس طرح سیلاب کے سامنے خس وخاشاک۔ آپؐ نے لوگوں کو موت کی نیند سے بیدار کرکے ان کو ترقی کے بلند ترین مقام پر پہنچا دیا۔ جو لوگ چند سالوں پہلے ہر بیہودہ چیز کو اپنا معبود قرار دیتے تھے۔ اور سفر کو جاتے ہوئے اپنے پتھروں کے معبودوں کو حفاظت کے لئے ساتھ لے جاتے تھے۔ وہ لوگ آپؐ کی تعلیم سے پکّے موحد بن گئے۔ حتےٰ کہ حضرتِ عمرؓ نے جو کسی زمانہ میں ہر پتھر کو معبود سمجھتے تھے۔ اور ہر چیز کو اپنا معبود بناکر پوجتے تھے عقیدہ توحید باری میں وہ بلند مقام حاصل کرلیا۔ کہ طوافِ کعبہ کے وقت یہ الفاظ ان کی زبان پر جاری ہوگئے "اے حجرِ اسود! میں جانتا ہوں۔ کہ تو محض اِک پتھر ہے۔ اور اگر رسول اللہؐ نے تجھے بوسہ نہ دیا ہوتا۔ تو میں تجھے ریزہ ریزہ کرڈالتا" نہ صرف بیس سال میں تمام ملک عرب جو بارہ لاکھ میل مربع میں پھیلا ہوا ہے۔ بُت پرستی کی لعنت سے آزاد ہوگیا۔ بلکہ توحید باری کی اشاعت کے لئے عربوں کے سینوں میں وہ آگ مشتعل ہوگئی۔ کہ ارضِ معلومہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک توحید کا ڈنکا بج گیا۔ جو لوگ کل تک ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ اور معمولی معمولی باتوں پر خونریزی کے عادی تھے۔ ایسی مضبوط سلکِ اخوت میں منسلک ہوگئے۔ کہ اس کا ہر فرد کوئی کام اپنے لئے نہ کرتا تھا بلکہ غیروں کے فائدہ کے لئے۔ دنیا کی جاہل ترین قوم کل عالم کے لئے اشاعت علوم کی علمبردار بن گئی۔ بقول کارلائل

"اہل عرب ایک جاہل اور مفلس قوم تھے۔ جو صحرانوردی کیا کرتے تھے۔ ان میں ایک نبی مبعوث ہوتا ہے۔ کس قدر حیرانی ہے کہ وہی قوم جسے کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ کل دنیا میں مشہور ہوگئی۔ اور جو لوگ سب سے چھوٹے تھے۔ وہ یکدم سب سے بڑے بن گئے۔ ایک صدی کے بعد اگر مغرب میں غرناطہ تک عربوں کا سکّہ رواں ہوگیا تو مشرق میں دہلی تک انہی کے نام کا سکّہ چلنے لگا۔ اور جرات واولوالعزمی سے متصف ہوکر ملک عرب کے لوگ صدیوں تک دنیا کے ایک بڑے حصّہ پر چمکتے رہے" جو لوگ عورت کی عزت مطلق نہ کرتے تھے۔ وہی لوگ حقوق نسواں کے زبردست وکیل بن گئے اور تمام دنیا میں احترام نساء کی وہ روح پھونک دی جو اس سے پہلے قطعاً ناپید تھی۔

"فی الجملہ، اذل مخلوقات اور گناہ میں ڈوبی ہوئی قوم سیدالاتقیا ہوگئی۔ بدمعاشانِ زمانہ نوامیسِ الٰہی کے پاسبان بن گئے۔ اور جماعتی قوانین کا احترام کرنے لگے۔ جن لوگوں کے افعال کا محرک محض یہ دنیائے دنی

تھی۔ اب ان کے سامنے حیات بعد الممات کا نقشہ ہر دم رہنے لگا۔ اور وہ کسی اعلےٰ اشرف اور روحانی زندگی کے منتظر ہوگئے۔ جس کے حصول کے لئے ان سے افعال حسنہ سرزد ہونے لگے۔ مقام غور ہے کہ کس قدر زبردست انقلاب چند سالوں میں پیدا ہوگیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا فرشتۂ رحمت ان لوگوں کے دلوں میں پاکیزگی کی روح پھونک گیا۔ جو چند سال پہلے سراپا وحشت اور جہالت تھے۔ وہ ملک جو چند سال پہلے اخلاق کے لحاظ سے ایک صحرا تھا۔ جہاں تمام قوانین دینی اور اخلاقی نہایت بیدردی کے ساتھ پامال ہو رہے تھے۔ اب ایک گلزار بن گیا۔" (از امیر علی اسپرٹ آف اسلام)

ایک ایسے نظام حکومت کا تصور جہاں نہ فوج ہو نہ پولیس۔ جس کی بناء پر امن قائم رہتا ہے ناظرین کے لئے آسان نہیں ہے۔ لیکن میں یقین دلاتا ہوں۔ کہ نبی کریمؐ نے اپنی زندگی ہی میں مدینہ کے اندر یہ حالت پیدا کر دی تھی۔ کہ جرائم کا وجود وہاں سے ناپید ہوگیا۔ اور اگر کوئی شخص کسی گناہ کا مرتکب ہوتا تھا۔ تو قطع نظر اس امر سے کہ کسی نے اسے دیکھا ہو یا نہ فوراً وہ شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کا اقرار کر لیتا تھا جو لوگ آپؐ کے گرد و پیش رہتے تھے۔ ان کے لئے خدا کا حاضر و ناظر ہونا ایک امر یقینی ہوگیا تھا۔ اس لئے کسی خفیہ پولیس کی حاجت ہی نہ تھی۔ مجرم خود اپنے آپؐ کو گرفتار کر لیتا تھا۔ جھوٹ قطعًا ناپید ہوگیا تھا۔ کسی معاملہ میں بھی زیادہ تحقیقات یا وکلاء کی امداد کی ضرورت لاحق نہ ہوتی تھی۔ کسی مفلس کو بھی اپنے معاملہ کے تصفیہ کے لئے کسی خارجی مدد کی ضرورت نہ تھی۔ نہ شہادت استغاثہ ہوتی تھی۔ اور نہ گواہوں کی طویل فہرست پیش کی جاتی تھی۔ ہر جگہ عالم الغیب اور عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ شَہِیْد خدا کا جلوہ نظر آتا تھا۔ آنحضرتؐ کے احکام کی بدولت اسی دنیا میں اس آسمانی بادشاہت کا نقشہ نظر آنے لگا تھا۔ جس کی آرزو حضرت یسوعؑ کو مدت العمر رہی مگر پوری نہ ہوسکی۔

یہ کامیابی جو تاریخ عالم میں عدیم المثال ہے، نبی کریمؐ کی اعلےٰ ترین روحانی قوت پر اک روشن دلیل ہے۔ کسی جماعت میں کوئی اصلاح نافذ نہیں ہوسکتی۔ جب تک اس کے افراد کے قلب میں مصلح کا زبردست احترام موجود نہ ہو۔ اور یہ رنگ انقیاد اعلیٰ روحانی قوت کی بدولت دوسروں میں پیدا ہوسکتا ہے۔ وہ نہ زور بازو سے ممکن ہے نہ صرف دولت سے نہ اظہار معجزات سے۔ آنحضرتؐ کے الفاظ کسی دنیاوی بادشاہ کے الفاظ قطعًا نہ تھے۔ بلکہ آپؐ طبعًا ان تمام باتوں سے نفور تھے۔ جن سے دوسروں پر اثر ڈال سکیں آپ عمومًا

یہی فرمایا کرتے تھے۔ "میں تم سے یہ نہیں کہتا۔ کہ میرے پاس خزانے ہیں۔ نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف وحی الٰہی کی پیروی کرتا ہوں" تاہم لوگ جس قدر آپؐ کی اطاعت کرتے تھے۔ اس کا اندازہ دشوار ہے۔ آپؐ کے الفاظ کسی محبوب کے الفاظ ہوتے تھے۔ جن پر عمل کرنا عاشق کے لئے معراج ہوتا ہے۔ پس اگر آپؐ کے متبعین کا تعلق آپ سے ایسا ہی تھا جیسا کہ عاشق کا معشوق سے ہوتا ہے تو پھر اس بات پر مطلق تعجب نہ کرنا چاہیئے آپؐ تمام مذہبی ہادیوں میں کامیاب ترین انسان گزرے ہیں۔ لیکن کامیابی حاصل کرنے سے پہلے لازمی ہے۔ کہ انسان روحانیت کے بلند ترین مقام کو حاصل کرے۔ ممکن ہے یشوع نے پانی کو شراب میں تبدیل کر دیا ہو۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو حسب دلخواہ تبدیل نہ کر سکا۔ وہ تو اسی آرزو میں رہا۔ کہ ان میں رائی کے دانہ کی برابر ہی ایمان پیدا ہو جائے۔ اور جب امتحان کا وقت آیا تو یہی ثابت ہوا۔ کہ ان میں اس قدر ایمان بھی نہ تھا۔ جس پر اسے سب سے زیادہ اعتماد تھا۔ اسی نے اُسے دشمنوں کے حوالہ کر دیا۔ اگر دوسرے شاگرد اسے تنہا چھوڑ کر بھاگ گئے۔ تو جس کے پاس بہشت کی کنجیاں تھیں۔ اس نے علانیہ اس پر لعنت کی۔ خواہ آپ ان لوگوں کو "ایمان کے کمزور" کہیں یا "روحانیت میں قاصر" امر واقعی میں کچھ تغیر نہیں ہو سکتا۔ استاد کے پاس وہ کیمیا ہی نہ تھی۔ جس سے تانبا سونا ہو جاتا ہے اسی طرح بنی اسرائیل کے قلوب میں بھی موسیٰؑ کے لئے کوئی عزت یا محبت نہ تھی۔ ارض موعود کی طرف جاتے ہوئے انہوں نے ان کی کوئی بات نہ سنی۔ لیکن آنحضرتؐ کے شاگرد تو ہمیشہ یہی کہتے تھے۔ ہم موسیٰؑ کے ہمراہیوں کی طرح یہ نہ کہیں گے کہ "اے موسیٰ تم اور تمہارا خدا دونوں دشمنوں کا مقابلہ کرنے جائیں۔ ہم تو یہیں کھڑے رہیں گے"۔ نہیں "ہم تو اے محمدؐ! آپؐ کے دائیں طرف لڑیں گے بائیں طرف لڑیں گے۔ آگے لڑیں گے اور پیچھے لڑیں گے"۔ اور واضح ہو کہ یہ باتیں محض زبانی نہ تھیں۔ آپؐ کے متبعین نے جنگ احد میں ان الفاظ پر من وعن عمل کر کے دکھا دیا۔ شدید ترین مصائب میں بھی وہ لوگ صادق القول ثابت ہوئے۔

جنگِ اُحد میں دشمنوں نے نبی کریمؐ پر اس سختی سے حملہ کیا۔ کہ آپؐ ایک گڑھے میں گر پڑے، آپؐ کے جسم مبارک پر اسی زخم آئے۔ اور چہرہِ مبارک خون میں نہا گیا۔ بلکہ زندگی ہی کے لالے پڑ گئے۔ اس موقعہ پر بھی آپ کے پیروؤں کی جاں نثاری آپؐ کے آڑے آئی۔ آپؐ گڑھے میں گرے پڑے تھے۔ اور اگر دشمن دیکھ پاتے تو جان سے مار ڈالنا کوئی بات ہی نہ تھی۔ لیکن حضورؐ کے ہمراہیوں نے

آپؐ کے چاروں طرف گھیرا باندھ کر انسانوں کی دیواریں قائم کر دیں۔ اور نہایت شوق کے ساتھ اپنے سینے دشمنوں کے تیروں کے سامنے سپرد کر دیئے۔ جب کوئی شخص تلوار یا تیر کا زخم کھا کر گر پڑتا تھا۔ تو دوسرا آدمی اس کی جگہ آجاتا تھا۔ عورتیں بھی اظہار وفاداری میں مردوں سے پیچھے نہیں رہیں۔ ام نصیبہ ام سلمہ عائشہ اور دیگر کئی عورتیں تلواریں سونت سونت کر حضورؐ پر جان قربان کرنے کے لیئے کھڑی ہو گئیں۔ اور نہایت پامردی کے ساتھ دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ نبی کریمؐ کے ساتھی جب میدان جنگ کو جاتے تھے۔ تو عموماً یہ رجز پڑھا کرتے تھے۔ ”ہم وہی لوگ ہیں جنہوں نے محمدؐ سے وفادار رہنے کا عہد کیا ہے۔ کہ ہم تمام عمر اپنے دین کی حفاظت کے لیئے لڑتے رہیں گے۔ کبھی پیچھے نہ ہٹیں گے“ جب وقتِ امتحان آیا۔ تو ان لوگوں نے من وعن اپنے الفاظ کو سچا ثابت کر دکھایا۔ اس بات سے استاد اور شاگرد دونوں کی عزت اور مرتبت جریدۂ عالم پر ثبت ہوتی ہے۔

جو روح آپؐ نے ان صحرائی لوگوں میں پھونک دی تھی۔ اس کا اظہار نہ صرف میدانِ جنگ میں ہوا۔ بلکہ انسان کے سب سے بڑے دشمن سے مقابلہ کرنے میں بھی۔ وہ دشمن جیسا کہ سب جانتے ہیں۔ نفس امارہ ہے۔ تاریخ میں اس کامیابی کی نظیر بھی نہیں ملتی۔ جو اس معاملہ میں آپ کو حاصل ہوئی۔ کسی مصلح کی ان لوگوں نے جن کی اصلاح مدنظر تھی۔ اس قدر اطاعت نہیں کی۔ جس قدر عربوں نے آپؐ کی کی مثلاً شراب خوری اُن کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ شاید اُس زمانہ میں کوئی قوم ان سے زیادہ شراب کی دلدادہ نہ تھی۔ وہ لوگ کھانا تو تین وقت کھاتے تھے۔ مگر بکس (شراب کا دیوتا) کی عبادت دن میں پانچ دفعہ کرتے تھے۔ جب آنحضرتؐ نے شراب کی ممانعت فرمائی۔ تو اِدھر آپؐ کے منہ سے امتناعی الفاظ نکلے۔ اُدھر مدینہ کی گلیوں میں ”شراب ناب“ اس طرح پڑی بہنے لگی جس طرح برسات میں بارش کا پانی۔ آپؐ کے حکم میں بجلی کی سی سرعت اثر تھی تو جادو کی سی تاثیر۔ ایک لفظ نے کایا پلٹ دی۔ شراب نوشی کے پانچ وقت اوقات صلوۃ پنجگانہ میں تبدیل ہو گئے۔

ظاہر ہے۔ کہ ایسی حیرت انگیز تبدیلی لوگوں کے اخلاق میں وہی شخص کر سکتا ہے۔ جو روحانیت کے تمام مدارج عالیہ طے کر چکا ہو۔ اور آپؐ نے تو اپنی ساری جوانی غار حرا میں مجاہدہ و مراقبہ میں بسر کر دی تھی۔ پھر بھلا آپؐ کو یہ قوت کیوں نہ حاصل ہوتی۔ اگرچہ اس زمانہ میں آپؐ کی نئی نئی شادی ہوئی

تھی۔ لیکن آپؐ مہینوں اسی غار میں بسر کرتے اور مجاہدہ و مراقبہ میں مصروف رہا کرتے تھے۔ وہیں آپ کو پہلی "وحی" سے مشرف کیا گیا تھا۔

اگرچہ وظائفِ نبوت آئندہ چل کر بہت وسیع ہو گئے تھے۔ لیکن پھر بھی مراقبہ و توجہ الی اللہ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ دن بھر کام کرتے رات بھر نماز پڑھتے مکہ کی مصروف زندگی میں بھی آپؐ اس قدر نمازیں پڑھتے تھے۔ کہ پائے مبارک متورم ہو جاتے تھے۔ جب تک آخری سانس تھی۔ آپؐ کے ذوق عبادت کی یہی نوعیت قائم رہی۔

ہجرت کے دسویں سال عرب کے لوگ فوج در فوج اسلام قبول کرنے کے لئے آنے لگے۔ اور عرب کے تمام قبائل نے اپنے اپنے سفیر رشتہ مودت استوار کرنے کے لئے بھیجے۔ تب خدا کی آخری وحی ان الفاظ میں نازل ہوئی۔

إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ	"اور جب اللہ (تعالیٰ) کی مدد اور فتح
وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ	آگئی اور تو نے لوگوں کو اللہ (تعالیٰ)
فِي دِينِ اللّٰهِ أَفْوَاجًا فَسَبِّحْ	کے دین میں فوج در فوج داخل ہوتے
بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ	دیکھ لیا۔ تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ
إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا	تسبیح کر اور اسکی حفاظت مانگ۔ وہ رجوع
(النصر) ۱۱۰ : ۱-۳	برحمت کرنے والا ہے۔

آیات مندرجہ بالا جن میں نصرت اور کامیابی کا ذکر کیا گیا ہے۔ آپؐ کے مقصد کی تکمیل کا اثبات بھی کرتی ہیں۔ یہ آخری وحی تھی۔ جو مکہ میں نازل ہوئی۔ جبکہ آپؐ ایک لاکھ مسلمانوں کے ساتھ فریضۂ حج ادا کر رہے تھے۔ اس نظارہ سے وہ تمام پیشگوئیاں سچی ثابت ہو گئیں۔ جو آپؐ نے بواسطہ قرآن مجید اس زمانہ میں بیان فرمائی تھیں۔ جب آپ بیکس و تنہا تھے۔ اس وقت آپؐ کو وعدہ دیا گیا تھا کہ آخر الامر اسلام ہی کامیاب ہو گا۔ حضرت ابن عباسؓ نے ان آیات میں حضورؐ کی وفات کی اطلاع بھی پڑھ لی۔ اور ان کا قیاس صحیح نکلا آپؐ اس سورۃ کے بعد صرف اسی دن زندہ رہے۔ ۸ مارچ ۶۳۲ء کو آخری حج ادا کرنے کے بعد آپؐ "منا" (جائے قربانی) میں مقیم ہوئے۔ وہاں عجیب دلفریب نظارہ آپؐ کے سامنے تھا! ایک لاکھ چالیس ہزار مسلمان

جن میں مرد عورتیں بچے سب شامل تھے۔ آپؐ کے اردگرد جمع تھے۔ اتنا بڑا مجمع اور سب کے سب موحدین کسی مُشرک یا بُت پرست کا نام بھی نہ تھا۔ اور پھر یہ جماعتِ موحدین اسی مقام پر مجتمع تھی۔ جہاں اب سے بیس سال پہلے کفار نے آپؐ کو رد کیا تھا۔ اور تعمیل احکام سے انکار کیا تھا۔ اس وقت یہ آیات نازل ہوئیں " آج کے دن میں نے تمہارا دین تمہارے لئے کامل کر دیا۔ اور اپنی نعمت تم پر تمام و کمال نازل کر دی" جو خطبہ اس موقعہ پر آپؐ نے دیا۔ وہ بھی لائق غور ہے۔ آپؐ ایک اونٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اور آپؐ کے گرد مختلف قبائل کے نمائندے جمع تھے۔ آپؐ آہستہ آہستہ بولتے تھے۔ دوسرے لوگ آپؐ کی باتیں بلند آواز سے دہرا دیتے تھے۔ جستہ جستہ فقرات یہ ہیں۔

"یا معشر المسلمین! میری باتیں غور سے سنو! کیونکہ میں یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا۔ کہ آئندہ سال بھی اس موقعہ پر تمہارے درمیان موجود ہوں گا۔ جانتے ہو آج کیا دن ہے؟ آج 'یوم النحر' یعنی قربانی کا دن ہے۔ جانتے ہو کونسا مہینہ ہے؟ یہ مقدس مہینہ ہے۔ جانتے ہو کون سا مقام ہے؟ یہ مقدس شہر ہے۔ پس میں تاکید کرتا ہوں۔ کہ تم ایک دوسرے کے **نفوس، اموال، املاک اور عزت کو ویسا ہی مقدس سمجھو جیسا کہ یہ مہینہ اور یہ دن اور یہ شہر مقدس ہے۔** جو لوگ حاضر ہیں ان پر فرض ہے کہ غائبین کو میرا پیغام پہنچا دیں۔ عنقریب تم سب اس خدا کے سامنے جانے والے ہو۔ جو تمہارے اعمال کا حساب لے گا۔ **آج سود یک قلم معاف کیا جاتا ہے۔ عباس ابن عبد المطلب** کا بھی۔ اور آج ایام جاہلیت کے تمام جدال و قتال کا قصاص بھی معاف کیا جاتا ہے۔ اور خصوصاً ربیع ابنِ حارث کا۔ اے لوگو! شیطان اب تم پر تسلط حاصل کرنے سے قطعاً ناامید ہو چکا ہے۔ اور اسے مطلق امید نہیں کہ اس ملک میں آئندہ کوئی متنفس اس کی پرستش کرے گا۔ لیکن اگر تم ادنےٰ سی بات میں بھی اس کی اطاعت کرو گے۔ تو اس کے لئے بڑی خوشی کا باعث ہوگا۔ پس اپنے ایمان کے بارے میں بہت محتاط رہو۔ اے لوگو! **اپنی بیویوں پر تمہارے حقوق ہیں۔ اور تم پر ان کے حقوق ہیں۔** بلکہ وہ خدا کی امانت ہیں۔ جو تمہیں سونپی گئی ہیں۔ پس لازم ہے کہ ان کے ساتھ نہایت مہربانی کا سلوک کرو۔ اور غلاموں کو وہی کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو۔ اور وہی پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو۔ اے لوگو غور سے سنو اور یاد رکھو۔ کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ تم سب برابر ہو۔ یکساں حقوق رکھتے ہو۔ اور تم میں سے ہر ایک پر یکساں ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ تم سب ایک جماعت کے افراد ہو۔ پس مناسب نہیں کہ ایک بھائی دوسرے کی کوئی

چیز بغیر اس کی مرضی کے لے۔ اور مناسب نہیں کہ ایک بھائی دوسرے پر ظلم روا رکھے۔ **حفظِ مراتب اور حفظِ حقوق** کا بیحد خیال رکھو"۔ اس کے بعد آپؐ نے آسمان کی طرف دیکھ کر باآواز بلند فرمایا۔

"اے خدا میں نے تیرا پیغام من و عن تیرے بندوں تک پہنچا دیا" اس پر تمام وادی گونج اٹھی۔ "بیشک بیشک تو نے پہنچا دیا۔ اور پہنچانے کا حق ادا کر دیا"۔ تب آپؐ نے فرمایا" اے ربّ! میں تیری منت کرتا ہوں۔ کہ تو اس معاملہ پر گواہ رہ"۔

سبحان اللہ! کس قدر عظیم الشان مقصد تھا۔ اور پھر کیسی عظیم الشان کامیابی نصیب ہوئی!!

روحی فداک یارسول اللہ

باب ہشتم[1]

بہترین معلّم دین

مقصد مذہب پہلا شخص جس نے مذہب کا صحیح تخیل دنیا کے سامنے پیش کیا حضور اقدسؐ ہی کی ذات بابرکات تھی۔ آپؐ سے پہلے بھی مذاہب مختلفہ دنیا میں موجود تھے لیکن لوگ مذہب سے یہ مراد لیتے تھے۔ کہ وہ خدا کو خوش کرنے اور مختلف رسوم و ارکان بجالا کر یا نماز نیاز اور قربانی کے ذریعہ سے اس کے انعامات کو حاصل کرنے کا آلہ ہے۔ مسیحیت سے پہلے بت پرست دنیا میں ہر جگہ ایک مسیح موجود تھا۔ اور ابن مریم اس سلسلہ کی آخری کڑی تھا۔ وسطی ایشیاء اور مغرب کی تمام اقوام میں یہ خیال موجود تھا کہ کسی خدا کے اوتار کے خون سے گناہوں کا کفارہ ہو کر نجات ملے گی۔ آنحضرتؐ نے آکر مذہب کا بالکل نیا مفہوم دنیا کے سامنے پیش کیا۔ وہ مفہوم یہ تھا۔ کہ مذہب کا مقصد موروثی گناہ سے نجات دلانا نہیں۔ بلکہ اس کی استعداد مخفی کی نشوونما اور ترقی دینا ہے۔ جو انسان میں پہلے سے موجود ہوتی ہے۔ جس سے مراد ارتقائے انسانیت ہے۔ دنیا کی ہر شے کی طرح انسان میں بھی بعض مخفی قابلیتیں اور استعدادیں موجود ہیں۔ اور مذہب کا کام یہ ہے۔ کہ ان کو بروئے کار لائے اور احسن طریق پر ترقی دے۔ آپؐ کے خیال کے مطابق مذہب ایک نظریۂ حیات اور طریق زندگی کا نام ہے۔ تاکہ ہمارے اندر جو خوبیاں مخفی ہیں۔

---

[1] اس باب میں مصنف نے اسلام کے تعلیم کردہ کسی ضابطہ کا ذکر نہیں کیا۔ نہ رسمیات و عبادات کا ذکر کیا۔ کیونکہ یہ باتیں تو کم و بیش ہر مذہب کی جائداد مشترکہ ہیں۔ اس باب میں بہ رعایت اختصار قریباً بیس امور کا ذکر ہے۔ جو تربیت و رفعت انسانی کے لئے ازبس ضروری ہیں۔ وہاں ان امور کی طرف دوسرے مذہب نے بہت ہی کم توجہ کی۔ حالانکہ ان امور پر کما حقہ روشنی ڈالنے کے بغیر فی زمانا کوئی مذہب اس بات کا مستحق ہی نہیں کہ اسے مذہب کے نام سے موسوم کیا جائے۔

وہ نمایاں ہو جائیں۔

وہ خوبی یہ ہے۔ کہ خدا نے اپنی روح کے ذریعہ ہمارے اندر الوہیت کی آگ پھونک دی ہے۔ لیکن لطیفۂ الٰہی ہمارے ان جذبات کے پردوں میں چھپا ہوا ہے۔ جو اپنی اصلی حالت میں صفاتِ بہیمیہ سے مشابہ اور اقرب ہیں۔ جس طرح فطرت میں بدصورتی سے خوبصورتی اور شان پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ہماری صفت حیوانیت اخلاق فاضلہ کے لئے بمنزلۂ اساس و بنیاد ہوتی ہے۔ پیغمبر عربؐ پہلے نبی اور رسول اللہ تھے۔ جنہوں نے یہ راز عالی عالم پر آشکار کیا۔ ارتقائے مذکورہ بالا سے مراد ہمارے شعور و ادراک کا ارتقاء ہے۔ یعنی بہیمی شعور کا الٰہی شعور سے اتصال و وصال ہو جائے۔ یہ دراصل مذہب کا باطنی پہلو ہے۔ جو نبی کریمؐ نے ظاہر کیا اور اسی کے اظہار میں آپؐ کی عظمت مضمر ہے۔ خدا کے دوسرے انبیاء کا مقصد نبوت بھی یہی تھا۔ لیکن اس مقصد کے حصول کے لئے جو طریق کار روایات میں بیان ہوا ہے۔ وہ نہ آسان ہے اور نہ باقاعدہ۔ بلکہ بعض اوقات غیر فطری ہے۔ انہوں نے ہمیں بیش قیمت نصائح دیں۔ لیکن وہ کسی تربیت اور نظام کے ماتحت نہ تھیں۔ انہوں نے فلسفۂ اخلاق پر چند خطبے دیدیئے۔ رسوم وارکان شرعیہ کا ضابطہ مہیا کر دیا۔ اور نماز و قربانی کے چند اصول بتا دئے اور بس۔

لیکن آنحضرتؐ نے فن تشریح الاعضاء کے اِک ماہر کی طرح انسانی دماغ کا تجزیہ کر ڈالا۔ اور پاؤں سے لے کر سر تک ہر رگ اور ریشہ کا معائنہ کیا۔ آپؐ کا مقصد ہمارے فطری رجحانات کو کچل ڈالنا یا معطل کر دینا نہیں تھا۔ بلکہ آپؐ نے ان کو قابو میں رکھنے اور صحیح طور پر استعمال کرنے کا طریقہ بتایا۔ تاکہ ہم ان کی مدد سے حیوانیت کی سرحد سے نکل کر الوہیت کی سرحد میں پہنچ سکیں۔ اور ہمیں اس فطری جذبہ کے تحفظ کا طریقہ بتایا۔ جس کی بدولت ہم اپنا انفرادی وجود اس دنیا میں قائم رکھ سکتے ہیں۔ اس فطری جذبہ سے دو جذبے پیدا ہوتے ہیں۔ **غضب** اور **خواہش**۔ پھر یہی دو جذبے مختلف شعبوں میں منقسم ہو جاتے ہیں۔ جو کبھی نیکی اور کبھی بدی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر برائی کی صورت میں غضب سے دشمنی عداوت، تعصب، خشمناکی، ظلم، غیبت، دشنام دہی، بزدلی، منافقت پیدا ہوتی ہے۔ تو اسی غضب سے بھلائی کی صورت میں جرأت، دلیری، ہمت، استقلال، ضبط، رواداری، عدالت، خوش خوئی، حلم،

انکساری، اور عفو کے جذبات ظاہر ہوتے ہیں:۔

اب خواہش کے جذبہ کو لیجئے تو ارتقائی صورت میں اس سے محبت، موانست رحم، فیاضی قناعت ایثار، اعتماد، توکل علے اللہ وغیرہ ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن اسی جذبہ کے ادنےٰ پہلو سے کمینگی، خست لالچ، غرور، اسراف، رقابت حسد، بے ایمانی، شیخی اور کاہلی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ پھر ان دونوں جذبات سے متحدہ طور پر اور بہت سے جذبات ظاہر ہوتے ہیں۔ ہمارے شعور ذاتی کا اِک تیسرا پہلو بھی ہے۔ اور جب وہ صفت باقاعدہ نشوونما پاتی ہے۔ تو ہمارے شعور کے جذباتی، حسی اور نفسانی پہلوؤں پر حکومت کرتی ہے۔ اس سے مراد انسان کی عقل و دانش ہے۔ جس کی نشوونما اچھے اور برے دونوں طریقوں پر ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی مذہب نفسیات انسانی کا من کل الوجوہ احاطہ نہیں کر سکتا۔ تو اس سے وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ جس کے حصول کے لئے خدا نے مذہب کو بھیجا ہے۔

انسانی شکل میں آکر مادہ اپنے عروج کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ اور اس کی بناء پر ہی انسان میں وہ ادراک ظہور پذیر ہوتا ہے۔ جو اپنی وسعت اور ترقی کے اعتبار سے ادراک حیوانی سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ فطرت میں ہر چیز چند مقررہ قواعد کی پابندی کی بدولت اپنے منتہائے کمال کی طرف جا رہی ہے۔ اسی طرح ہماری آیندہ ترقی ہمارے شعور کے ارتقاء پر منحصر ہے۔ پس مذہب وہ قاعدہ او رطریقہ ہے جس پر کاربند ہونے سے ہم اپنے مقصد ذاتی کو حاصل کر سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ۔ دنیا اب اس قدر سمجھدار ہو گئی ہے۔ کہ ناراض خدا" اور "بیٹے کے خون سے کفارہ" کے عقیدہ کو اساسِ مذہب تسلیم نہیں کر سکتی۔ دنیا نے اس قسم کے قربانی کے بکرے بہت سے دیکھ لئے ہیں۔ مذہب کا مقصد وحید صرف یہ امر قرار دیا جا سکتا ہے۔ کہ اس کی بدولت ہمارا شعور انسانی، الٰہی شعور سے اتصال حاصل کر لے۔ اور یہی وہ نصب العین ہے۔ جس کے لئے انسان بجا طور پر اپنی جان قربان کر سکتا ہے۔ یہ انقلاب جس کی رو سے ادنےٰ اعلےٰ ہو جاتا ہے۔ یعنی نفسِ امّارہ نفس مطمئنہ میں مبدل ہو جائے۔ جادو کے زور سے رونما نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ بات تو مسلسل کوشش اور ریاضت سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اور ایسے ہادی اعظم کی پیروی سے نصیب ہو سکتی ہے۔ جو نفسیات انسانی کا ماہر ہو۔ اور خدا کے سچے نبی کا کام بھی یہی ہوتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس کے علاوہ بھی اور کوئی وجہ نزول مذہب کی ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید نے بھی اپنی افتتاحی آیات میں اپنے نزول کا مقصد یہی بیان کیا ہے۔ پس

اگر آنحضرتؐ نے دنیا کو اور انسانوں کو وہ اصول بتائے۔ جن کی مدد سے ان کی بہیمیت الوہیت میں مبدل ہو جائے تو کیا پھر آپؐ بہترین معلم مذہب نہیں ہیں؟ آپؐ نے اس مسئلہ پر نہایت وضاحت کے ساتھ تعلیم دی ہے۔ اور جذبات انسانی کے ہر پہلو پر شرح وبسط کے ساتھ گفتگو فرمائی ہے۔ اور ان پر قابو حاصل کرنے کے لئے ایسے ذرائع اور وسائل بیان فرما دیئے ہیں۔ کہ ہم ہر قسم کی بدی سے محترز رہ کر نیکی راہوں پر گامزن ہو سکتے ہیں۔ یہ تعلیم منظم طور پر کسی دوسرے مذہب میں نہیں پائی جاتی۔

بعضوں کا خیال ہے۔ کہ مذہب اس لئے آتا ہے۔ کہ انسانوں کو جنت میں داخلہ کا (ٹکٹ) پروانہ مل جائے۔ اور اس جنت کے متعلق ان کا خیال ہے۔ کہ وہ آسمانوں[1] پر یا ان کے اس طرف واقع ہے۔

---

[1] ڈین انجی اپنی جدید تصنیف "مذہب سائنس اور حقیقت" میں لکھتے ہیں:۔

"اس تحقیقات نے کہ زمین ایک محدود کائنات کا مرکز نہیں ہے۔ اور نہ ایک رکابی کی مثل ہے بلکہ ایک سیارہ ہے۔ جو لاکھوں سیاروں کی طرح سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔ کائنات کے مسیحی نقشہ کے ٹکڑے اڑا دیئے۔ اس وقت عام آدمی خواہ تعلیم یافتہ ہوں یا غیر تعلیم یافتہ یہی اعتقاد رکھتے تھے کہ کائنات بمنزلہ ایک سہ منزلہ مکان کے ہے۔ بالائی منزل میں خدا اور فرشتے رہتے ہیں۔ درمیانی منزل میں انسان اور حیوانات اور طبقۂ زیر زمین میں ارواح خبیثہ اور شیاطین۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہنوں میں جنت اور دوزخ دونوں جغرافیائی حیثیت رکھتے تھے۔

مسیحی عقاید نامہ میں یسوع کا دوزخ میں جانا۔ اور پھر صعود الی السماء کا مذکور ہوا ہے۔ اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ اور یہ بات ظاہر ہے۔ کہ مسیح کا حشر جسمانی، بالآخر اس کے صعودِ جسمانی سے مربوط ہے۔ پس جدید جغرافیۂ کائنات کی رو سے ان مسیحی عقاید پر زبردست زد پڑتی ہے۔ کلیسا نے ان عقائد کے ظاہری معنوں پر ایمان رکھنے کی تعلیم دی۔ اور اس کا ثبوت کلیسائے انگلستان کے مروّجہ عقاید سے ہو سکتا ہے۔ جس میں بیان کیا گیا ہے کہ یسوع اسی جسم، گوشت، پوست، استخوان اور خون کے ساتھ بہشت میں گیا۔ اور ہنوز وہیں بیٹھا ہوا ہے۔ عقیدہ "قلب ماہیت" کا انکار اسی بناء پر کیا گیا ہے کہ یسوع کا جسم تو بہشت میں ہے۔ اور طبعی رو سے ناممکن ہے کہ مادی شئی ایک ہی آن میں مختلف مقامات

لیکن قرآن مجید اس قسم کے تمام خام خیالات کی تردید ان الفاظ سے کرتا ہے۔ کہ بہشت ہماری اپنے رُوح کی ہی ارتقائی اور بہترین حالت کا نام ہے۔ جذبات انسانی کو الٰہی اخلاق میں منتقل کرنے سے یہاں بھی

(بقیہ صـــ) میں پائی جاسکے۔

کوپرنیکن کے اصولِ ہیئت اور جدید علوم کی رو سے اس بات کی قطعاً گنجائش نہیں کہ "جنت" کا وجود ارضی یا مقامی ثابت کیا جاسکے۔ فضاء عالم غیر محدود نظر آتی ہے۔ اور اس قدر ثوابت و سیاروں اور دیگر اجرام فلکی کے باوجود جو فضا میں منتشر ہیں۔ یہ خیال کرنا نہایت مشکل ہے۔ کہ ان میں سے کوئی سیارہ خدا کی رہائش یا جنت کے لیئے منتخب کیا گیا ہے اسی طرح طبقہ زیرین کو دوزخ قرار دینے کا اعتقاد بھی جو علم ہیئت کے سراسر منافی ہے۔ بغیر کسی دقّت کے لوگوں کے دلوں سے زائل ہو چکا ہے۔

لیکن سابق مسئلہ کے حل سے ابھی تک عمایدین کلیسا جان چرا رہے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا۔ مجھے ایک ایسے شخص کی تصنیف پر تبصرہ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ جسے عام طور پر فاضل الٰہیات تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس میں یہ عبارت پڑھی۔ کہ اب عیسائی لوگ مقامی بہشت پر ایمان رکھنے کے لیئے تیار نہیں ہیں۔ اس اعلان کو پڑھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ کہ راسخ العقیدہ علماء بھی راہ راست پر آنے لگے ہیں۔

ایک اور مشہور مصنّف فاضل دینیات نے دوران گفتگو میں کہا۔ کہ مسیح کے صعود اور اس کے بہشت میں جانے کی تفسیر استعارہ اور مثال کے رنگ میں ہو سکتی ہے۔ لیکن ہمیں تو ماننا ہی ہوگا کہ مسیح کا جسم زمین سے بہت فاصلہ پر اٹھا لیا گیا۔

میں نہایت خلوص نیت کے ساتھ یہ سوال کرتا ہوں کہ اس قسم کی باتوں سے کب تک کام چل سکتا ہے۔ کیا ابھی تک اس بات کا وقت نہیں آیا۔ کہ کلیسیاء ان سوالات پر غور کرے۔ جو سمجھدار طبقہ کی طرف سے دن رات پیش کیئے جاتے ہیں۔ اور یہ سوالات گزشتہ چار سَو سالوں سے جوں کے توں موجود ہیں۔ کیا عیسائی لوگ علم ہیئت کے فیصلہ سے اتفاق کرتے ہیں؟ یا نہیں کرتے۔

بہشت نصیب ہوتی ہے اور عقبےٰ ایں بھی کیونکہ قرآن دو جنتوں کا وعدہ کرتا ہے۔ اور اس کے برعکس دوزخیں بھی دو ہیں۔ ایک اس دنیا میں دوسری عقبےٰ ایں۔ یعنی جو انسان اخلاق بہیمیہ کو تعدیل میں لاکر اخلاق الہٰی سے متخلق ہو گیا۔ وہ یہاں ہی جنت میں تو داخل ہو گیا۔ لیکن اُس جنت کا ظہور کامل مرنے کے بعد ہو گا۔ جو گرفتارِ جذباتِ حیوانیت رہا۔ وہ دوزخ میں گیا۔

بہشت کے متعلق اسلامی عقیدہ

جدید علم کائنات کی رُو سے ڈین انجی دنیا کے مسیحی نقشہ اور جغرافیائی بہشت اور دوزخ کے عقیدہ کو رد کرنے پر مجبور ہیں۔ لیکن قرآن مجید میں ان کو وہ تعلیم ملے گی۔ جو ان کے لیے موجب اطمینان ہو گی۔ اس زمانہ میں جبکہ زمین کائنات کا مرکز تسلیم کی جاتی تھی۔ آنحضرتؐ نے دنیا کو بتایا کہ بہشت و دوزخ دو مقامات کے نام نہیں ہیں۔ بلکہ حیات بعد الممات کی دو مختلف حالتوں کے نام ہیں۔ اس سلسلہ میں قرآن فرماتا ہے۔

(بقیہ صـــ) بہر حال جواب اثبات میں ہو گا یا انکار میں۔ لفظی گورکھ دھندوں سے کسی کو تسلی نہیں ہو سکتی۔"

ڈاکٹر ٹیمپل بشپ آف مانچسٹر تو ڈین انجی سے متفق الرائے ہیں۔ وہ کہتے ہیں "صعود مسیح تو ایک تمثیلی بیان ہے۔۔۔۔۔ جہاں یہ لکھا ہے کہ یسوعؑ آسمانوں پر چڑھ گیا۔ وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ خدا کے دائیں ہاتھ پر بیٹھا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات محض استعارہ اور کنایہ ہے۔ جس کا مطلب صرف اتنا ہے۔ کہ یسوع بلحاظ قدرت و حکومت خدا سے متحد ہے۔ اگرچہ ہم اس کے حشر جسمانی کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ تاہم اس قدر کہہ دیتے ہیں کہ وہ ہر جگہ ظاہر ہو سکتا تھا۔ بلاشک کوئی مادی جگہ نہیں بلکہ ایک کیفیت روحانی کا نام ہے۔ بہشت دراصل معیت باللہ کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اور کوئی شخص اس بات کے اعتراف میں شرم محسوس نہیں کرتا۔ کہ وہ دنیاوی تعلقات سے مرتفع ہونا چاہتا ہے۔ اگرچہ یہ لفظ "رفع" اس نقشۂ کائنات سے مستعار لیا گیا ہے۔ جسے ہم تسلیم نہیں کرتے۔"

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ	اور اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت
رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا	کی طرف جلدی کرو۔ جس کی وسعت
السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (آل عمران ۳:۱۳۳)	آسمانوں اور زمین (کے برابر) ہے۔

اس آیت سے ہم کو بہشت اور دوزخ کے اسلامی عقیدہ کا سراغ ملتا ہے۔ جنت کسی خاص جگہ پر محدود نہیں ہے۔ بلکہ اسی قدر وسیع ہے۔ جس قدر آسمان و زمین اس آیت کی تفسیر میں اکثر مفسرین نے یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ کہ ہرقل کے ایک سفیر نے آنحضرت ؐ سے دریافت کیا۔ کہ اگر بہشت اس قدر وسیع ہے۔ جس قدر زمین و آسمان تو پھر دوزخ کہاں ہے؟ آپؐ نے فرمایا "سبحان اللہ! جب دن ہوتا ہے تو رات کہاں جاتی ہے"؟

پس بہشت و دوزخ عقبےٰ کی دو حالتوں کا نام ہے۔ اور عقبےٰ ہر شخص کے اعمال کے موافق ہوگی قرآن مجید سورہ الشعراء آیت ۹۰ سورہ الھمزہ آیات ۵ تا ۷ اور سورہ الرعد آیت ۲۳-۲۴ سے ظاہر ہے کہ انسان کا قلب خود ہی اس کے لئے بہشت اور دوزخ مہیا کر دیتا ہے۔

آنحضرتؐ کی تعلیم کے مطابق بہشت و دوزخ کشورِ وراء القبر کے سفر تک ارتقائی منازل کے دو مختلف نام ہیں۔ ہماری جسمانی فطرت ہم کو اس دنیا سے وابستہ کئے ہوئے ہے۔ لیکن جب ہمارا نفس مدرکہ ذاتی رفعت حاصل کرے گا۔ تو پھر وہ اپنی عملی قوت کی بدولت ایک ایسے عنصر میں ملبوس ہو جائے گا جسے عربی زبان میں نور کہتے ہیں۔ اور یہ نور اس کو کائنات کی مختلف منازل طے کراتا ہوا آگے لے جائے گا۔ یہ بہشت کا اسلامی تخیل ہے۔ اور اسلامی دوزخ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اول الذکر ہمارے قواعد کی بار آور حالت کا نام ہے۔ اور آخر الذکر ان کی معطل حالت کا۔ قرآن مجید فرماتا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا	"وہ کامیاب رہا جس نے اسے پاک
وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا	کیا۔ اور وہ نامراد رہا جس نے اسے
(الشمس ۹۱: ۹-۱۰)	دفن کیا"

یہ بحث تفصیل کا محتاج ہے۔ لیکن اس توضیح کے قبل میں بعض اشیاء کی کیفیت ارتقاء کا بیان کرنا چاہتا ہوں۔ عالم نباتات میں حرکت نہیں پائی جاتی، لیکن عالم حیوانات میں یہ صفت بوجہ شعور حیوانی موجود ہوجاتی ہے۔ اسی ادراک کی بدولت جسم انسان میں ذہنی اور روحانی پرواز کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ اس رعایت سے اگرادراک حیوانی نباتات کے مقابل لطیف جسم کو چاہتا ہے۔ توانسانی ادراک کیلئے تو حیوانات کے اجسام سے بھی بدرجہا زیادہ لطیف جسم چاہیئے تھا۔ جوکہ انسان کو ملا۔ اسی طرح ہمارا نفسِ مدرکہ جب ارتقائی منازلِ عالم روحانیات طے کرنے لگے گا۔ تواس کی نقل وحرکت کے لئے موجودہ حالت سے بھی زیادہ الطف جسم ملنا چاہیئے۔ جہاں اس کی مخفی اور خلقی قواء کا ظہور کامل ہو۔ اس جسم کو نور سے تیار کیا جائیگا ہاں یہ ظہور کامل بھی بتدریج ہوگا۔

قرآن کی سات بہشتیں دراصل یہی سات منازل رفعت ہیں۔ اگرایک سمجھدار آدمی ارتقاء کے اصولوں کو صحیح سمجھتا ہے۔ خواہ مذہبًا یا عملی طور پر۔ اور میرے نزدیک یہ دونوں امرایک ہی ہیں۔ تو مرنے کے بعد روح انسانی کے ارتقاء سے کس طرح انکار کرسکتا ہے؟ اگرابتدائی نوری ذرات ہرلحظہ ترقی کرتے کرتے آخر شعور انسانی میں متشکل ہوتے رہتے ہیں۔ تاکہ ان کی قوائے مخفیہ بروئے کار آجائیں۔ تو یہ سلسلہ اس قاعدہ کی رُو سے موت کے بعد بھی جاری رہنا چاہیئے۔ اگر زمانۂ حیات میں ان کی بعض قواء بروئے کار نہیں آسکیں۔ تو بعدالموت ان کا ظہور ہونا چاہیئے۔ تخم کے لئے لازمی ہے۔ کہ وہ اپنی مخفی استعداد کو ظاہر کرے یعنی درخت بن کر ثمر لائے۔ لیکن اس کی ترقی یہیں ختم نہیں ہوجاتی۔ وہ ثمر انجام کار غذا کی شکل میں جاکر جزوبدن انسان ہوتا ہے۔ اسی طرح انسانی دماغ میں بھی بہت سی استعدادیں مخفی ہوتی ہیں۔ اور بعضوں میں وہ استعدادیں بروئے کار نہیں آتیں۔ لیکن ہم میں سے ہر فرد کے لئے کوئی وقت اور مقام ان قواء کو بروئے کار لانے کے لئے ملنا ضروری ہے۔ علاوہ بریں' انسانی دماغ کا ایک باطنی اور مخفی پہلو بھی ہے۔ جو ابھی تک کسی فرد میں پورے طور پر ظاہر نہیں ہوسکا۔ وقتاً فوقتاً اس کی ہلکی سی جھلک بعض تربیت یافتہ نفوس میں دکھائی دے جاتی ہے۔ مثلاً قوت کاشفہ یا دیگرامور باطنی اور باطنیات جو انبیاء کو حاصل ہوتے ہیں۔ جدید تحقیقات کی رو سے اس باطنی قوت کے بعض پہلو مثلاً کشف خواب' رویاء الہام اپنے خیالات کو دوسرے کے دل میں ارتقاء کرنا حالتِ وجد' غیب بینی' غیبی آوازوں کا سننا روحانی سیر' پیش بینی۔

پیشگوئی وغیرہ مغربی علم و یقین میں آتے جاتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کو یہ تمام باتیں آج سے نہیں۔ بلکہ ابتداء اسلام ہی سے معلوم ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے۔ کہ کوئی ان دماغی قوتوں کو بوجہ احسن ابھی تک ظاہر نہیں کر سکا ہے۔ یہ دوسری بات ہے۔ کہ یسوع صاحب کے پیرو انھیں جو چاہیں تسلیم کریں یہ کہہ دیں کہ وہ تمام ارتقائی منازل طے کر چکے تھے۔ اور انسانیت کے منتہائے کمال کو پہنچ چکے تھے۔ لیکن ان کے الفاظ اور اعمال ان دعاوی کی خاطر خواہ تردید کر رہے ہیں۔ درخت انجیر والے واقعہ سے انھوں نے ثابت کر دیا کہ ان کو ذرہ بھر علم غیب نہ تھا۔ اس کے علاوہ اور بہت سی باتوں کے علوم سے انہوں نے صاف انکار کیا۔ مثلاً انہیں اس بات کا علم نہ تھا کہ قیامت کب آئے گی۔ ڈین کارلائل آنجہانی لکھتے ہیں۔ کہ "یسوع کو ان دماغی امراض کے متعلق جنہیں اس وقت تصرف شیطانی سمجھتے تھے۔ اپنے ہمعصروں سے زیادہ علم نہ تھا۔ ایسا ہی اپنے معاصرین کی طرح وہ زبور یا تورات کے مصنفین کا صحیح علم نہ رکھتے تھے۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ یسوع نے اپنے دوبارہ آنے کے متعلق بعض قیاسات ایسے ظاہر کئے تھے۔ جن کی تصدیق ابھی تک نہیں ہوئی ہے۔" اس اقتباس میں یسوع کے اس علم کا مذکور ہے۔ جو انسانی دسترس کے ماتحت حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن میں تو یہاں اس علم کا ذکر کرتا ہوں جو مخفی حواس کے ذریعے سے حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ حواس شاذ و نادر ہی یہاں حرکت میں آتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں لازم ہے۔ کہ اس مرتبہ عالیہ کو حاصل کریں۔ جہاں پہنچ کر یہ حواس مخفی مستقل طور پر ظاہر ہو جائیں گے۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہماری ارضی طبیعت ان حواس کو ابھرنے یا کام کرنے نہیں دیتی۔ اس لئے وہ پس پردہ رہتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات روحانی انتشار دجوش میں وہ پردہ تھوڑی دیر کے لیے ہم سے ہٹ جاتا ہے۔ اور ہم کو غیر معمولی طور پر کشف حقائق ہو جاتا ہے۔ پس ہمیں اس غیر معمولی طور کو اپنے معمول میں لے آنا چاہیئے کوئی انسانی منطق مذکورہ بالا علمی تحقیقات کی روشنی میں آیندہ ترقی کے امکان سے انکار نہیں کر سکتی۔ لیکن اس ترقی کے دونوں ہی پہلو ہیں۔ روشن اور تاریک۔ روشن پہلو کا نام مذہب نے بہشت رکھا ہے۔ اور تاریک پہلو کا نام دوزخ رکھا ہے۔ پس بہشت یا دوزخ انسان کی ترقی یا تنزل کی دو روحانی حالتیں ہیں۔ اب ہم ان مصطلحات مروجہ کی تشریح کرتے ہیں۔ جن کی بناء پر زمانہ وسطی کی جہالت نے بہشت اور دوزخ کا نقشہ تیار کیا تھا۔

سر آرتھر کانن ڈائل کو اس بات کے کہنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ میں اپنے تجربہ کی بناء پر بہشت و دوزخ کا وجود ثابت کر سکتا ہوں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اس وقت ہزارہا ارواح ہمارے سروں پر منڈلا رہی ہیں۔ قرآنی مفہوم کے مطابق بہشت و دوزخ میں ایمان لانا اصول ارتقاء کا ایک لازمی منطقی نتیجہ ہے۔ اسی لئے انھیں علمی حقائق کے طور پر قبول کر لینا چاہیئے۔

اب میں اس طریق کی بابت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ جو قرآن شریف نے بہشت کو تخلیق کرنے کے متعلق بتایا ہے۔ اثیری ذرات سے لے کر دماغ انسانی تک ارتقاء کی ہزاروں ہی منازل ہیں۔ بڑی بھی اور چھوٹی بھی۔ اور ہر بڑی منزل میں سات چھوٹی منازل مضمر ہیں۔ ہر منزل کے ختم کو عرف عام میں موت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور موت دراصل ان اجزاء کے منتشر ہونے کا نام ہے۔ جو ایک خاص منزل تک پہنچنے کے لیئے مرکب ہوئے تھے۔ اس منزل کے ختم ہونے پر ارتقائی ترقی میں کچھ دن کے لئے روک ہو جاتی ہے۔ مختلف حالات میں یہ تعطل ترقی کا زمانہ بھی مختلف ہوتا ہے۔ اس زمانہ کو مسلمانوں میں "برزخ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ بہرحال اس برزخ کے ختم ہونے پر روح انسانی دوسرے نظام ترکیبی میں داخل ہوتی ہے۔ تاکہ آیندہ ترقی کر سکے۔ جب برف پگھل کر پانی ہوتا ہے۔ یا پانی بخار بن کر اڑتا ہے۔ اور حرارت اس میں مخفی ہو جاتی ہے۔ تو ہمیں ان مادی اشیاء میں بھی برزخی حالت نظر آتی ہے۔ پانی کے ایک حالت سے دوسری حالت میں جانے کے بعد حرارت اپنا فعل کچھ عرصہ کے لئے چھوڑ دیتی ہے۔ "برزخ" کے لغوی معنی "تعطیل" کے ہیں۔

ہر منزل میں ترقی کُن جوہر میں دو باتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک تو سابقہ منزل کے لوازمات جو اب لطیف تر حالت میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ دوسرے بعض نئی خاصیتیں جو موجودہ حالت کو سابقہ حالت سے متمیز کرتی ہیں۔ اور اس منزل جدید میں ترقی کرنے کا انحصار ان آخرالذکر خواص کی تربیت اور نشوونما پر ہوتا ہے۔ جب جوہر ترقی کسی نئی منزل میں داخل ہوتا ہے۔ تو سابقہ عیوب سے بالکل پاک ہو جاتا ہے اور خاصہ متمیزہ ہی ساری آیندہ ترقیات کی بنیاد بن جاتا ہے۔ آگے چل کر پھر کوئی نیا خواص اس میں پیدا ہو جاتا ہے۔ جو آیندہ ترقی کی بنیاد ہوتا ہے۔ درخت کی تمثیل اس جگہ مفید مطلب ہوگی۔ اس کا بیج پھل بننے سے پہلے مختلف حالات سے گزرتا ہے۔ مثلاً تنہ، شاخ، پھول اس کے بعد پھل لگتا ہے۔ پتیوں

میں شاخوں کا عنصر موجود ہے۔ لیکن اس کے علاوہ کچھ نئی چیز بھی شامل ہوتی ہے۔ تب پھول آتا ہے۔ اسی طرح پھول میں پتی کا عنصر موجود ہوتا ہے۔ لیکن اس میں کچھ نئی چیز بھی شامل ہوتی ہے۔ تب وہ پھول پھل کی شکل میں تبدیل ہوتا ہے۔ لیکن واضح ہو کہ پھول میں پتی کا عنصر تو موجود ہوتا ہے۔ لیکن تنہ یا شاخ کا کوئی عنصر بظاہر نہیں ہوتا۔ پھل میں پھول کی خوشبو تو ضرور رہوتی ہے۔ لیکن اس میں تغذیہ کی قوت ایسی ہوتی ہے۔ جو پھول میں موجود نہ تھی۔ اور پھل میں منازل گذشتہ یعنی شاخ اور پتہ وغیرہ کی کوئی خاصیت نہیں ہوتی۔ فی الجملہ ترقی کن جوہر ہر ارتقائی منزل میں نئی پیدا شدہ چیز کی پرورش کرتا ہے۔ جو اس کو سابقہ ادنےٰ حالت سے متمیز کرتا ہے۔ اور اعلےٰ منزل پر پہنچ کر ادنےٰ حالت کے تمام خواص ترک کر دیتا ہے۔ بلکہ ادنےٰ حالت کے جوہر تو منزل اعلےٰ میں پہنچ کر ترقی سے خارج ہو جاتے ہیں۔ یہ اصول ارتقاء کے ہر نظام میں پایا جاتا ہے۔ اور حیات انسانی پر بھی حاوی ہے۔ مثلاً جسمانیات سے حیوان میں ایک شعور پیدا ہوتا ہے۔ یہ شعور ہی حیوانی جذبات کا مولد ہو جاتا ہے۔ لیکن جسم انسانی میں ترقی کنان وجود کو صرف اسی قدر خواص خواصہائے ماسبق سے لینے ہیں جو آیندہ حیات کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ کیونکہ آیندہ ترقی انسان تمام تر نفس مدرکہ کی تربیت پر منحصر ہے۔ لیکن ترقی کن جوہر جب جسد خاکی سے جدا ہوتا ہے۔ تو ارضی فطرت کا کوئی عنصر اپنے ساتھ نہیں رکھتا۔ کیونکہ فطرت مذکورہ اگرچہ ہمارے حیات موجودہ کے لئے ضروری ہے۔ لیکن حیات بعد الموت کے لئے ضرر رساں ہوگی۔ خصوصاً اگر وہ غیر تعدیلی حالت میں رہی ہو کیونکہ اس صورت میں اس میں بدی کی طرف میلان بہرکیف باقی رہے گا۔ اور موت کے بعد ہماری ترقی صرف اسی میلان طبعی کے زائل کرنے پر منحصر ہے۔ لیکن یہ کام بغیر خدا کی مدد کے انجام نہیں پاسکتا۔ اسی لئے اسلام نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے۔ کہ خدا سے مسلسل دعا کرو۔ تاکہ بدی کی طرف میلان طبع نہ ہونے پائے۔ اب قرآن مجید کی اس آیت کا مطلب واضح ہو جائے گا۔ جو دوبارہ لکھی جاتی ہے۔ "گناہوں سے بچنے اور اس باغ کو حاصل کرنے کے لئے خدا کی طرف دوڑ، جس کی وسعت آسمان اور زمین کے برابر ہے"۔

خدا کی ذات ہمارے واسطے نمونہ ہے

آنحضرتؐ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ آپؐ نے وہ سانچہ بھی مہیا کر دیا جس میں ہمیں اپنے جذبات وغیرہ کو ڈال کر درست کرنا ہے۔ یعنی آپؐ نے وہ نصب العین بھی ہمارے سامنے رکھ دیا۔ جس تک ہمیں اپنے طبیعی جذبات کو پہنچانا چاہیئے۔ سنا کرتے تھے کہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا ہے۔ لیکن یہ بات انسانوں کے لئے معمہ سے کم نہ تھی۔ آپؐ نے اپنے متبعین کو یہ حکم دے کر کہ "اپنے آپ کو صفاتِ الٰہیہ سے متصف کرو۔ اور اپنے میں اللہ تعالیٰ کے سے اخلاق پیدا کرو" اس معمہ کو حل فرما دیا۔ گویا انسان کی حیاتِ ارضی کا مقصد' ان لفظوں میں بیان کر دیا۔ روحانی طور پر ہم لوگ خدا کی صورت پر بنائے گئے ہیں۔ اور ہمیں اس کا رنگ بھی اختیار کرنا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے۔ کہ ہم کو اس کا عرفان بھی حسب استطاعت انسانی حاصل ہو جائے۔ یہ دعویٰ کہ کوئی انسان خدا کو جان سکتا ہے۔ یا یہ کہ خدا ہمارے احاطہ شعور میں آنے کے قابل ہے غلط ہے۔ ہم خدا کے متعلق بہت ہی کم علم رکھتے ہیں۔ اور اس قلت معلومات کی وجہ ہی سے اس قدر مذاہب مختلفہ دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ جو سب کے سب خدا کے متعلق باہم دگر اختلاف رکھتے ہیں ظاہر ہے کہ خدا کے متعلق نامکمل معلومات سے کام نہیں چل سکتا۔ اگر ہم اس کے رنگ میں رنگین ہونا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کے متعلق کچھ نہ کچھ یا تھوڑی بہت معلومات بھی ہونی چاہیئے۔ آنحضرتؐ اس معاملہ میں بھی تمام انبیاء میں ممتاز ہیں۔ کیونکہ خدا کے متعلق یعنی اس کی صفات کے متعلق جس قدر وضاحت آپؐ نے فرمائی۔ دنیا میں کسی شخص نے نہیں کی۔

قرآن فرماتا ہے کہ خدا کو پورے طور پر کوئی شخص نہیں جان سکتا۔ لیکن اس میں بعض خدائی صفات کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے۔ کہ ہم لوگ اپنے اندر وہ صفات پیدا کر سکیں۔ قرآن میں خدا کی ننانوے صفات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ مگر خدا کی صفات یہیں ختم نہیں ہوتیں۔ اس کے صفات تو لا انتہا ہیں۔ لیکن یہ تعداد اس لئے معین کی گئی۔ کہ انسان کے لئے ان کا اتباع ممکن ہے۔ ہمارے لئے اپنے اندر ادراکِ الٰہیہ پیدا کرنا ضروری ہے۔ اور یہ ننانوے صفات اس ادراک کی شیوٗن مختلفہ ہیں۔ پس آنحضرتؐ نے دنیا کے سامنے خدا کے وہ صفات پیش کئے جو امکانی طور پر انسانی دماغ میں آسکتے ہیں۔ ان صفات بیان کردہ قرآن کی

صداقت پر ساری کائنات گواہ ہے۔ یہ نقشۂ مخلاق الٰہی ان پاکیزہ اور محبوب صفات پر مشتمل ہے۔ جو انسانوں میں بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔ **یہودیوں کا تخیّل اِلٰہ** اسلامی تخیل الٰہ سے بالکل مختلف ہے انہوں نے خدا کو نا مہربان اور کینہ توز فرض کر رکھا تھا۔ جو نہایت سخت گیر حاکم تھا۔ اور اپنے برگزیدہ لوگوں کے دشمنوں کا جانی دشمن۔ دوسری اقوام کا تخیل الٰہ یہود کے تخیل سے بہتر نہ تھا۔ ان کی تعلیمات کے مطابق سوختنی قربانی اور خون حیوانات ہی سے خدا کے دل و دماغ کو تسکین ہوتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ یسوع نے ان تخیلات کی خرابیوں کو بڑی حد تک دور کیا۔ چنانچہ انہوں نے خدا کو اپنا باپ کہ کر لوگوں کو سمجھایا۔ کہ خدا اور انسان کا تعلق باپ اور بیٹے کا سا ہے۔ لیکن۔۔۔۔ کلسیاء کے کارکنوں نے بہت جلد اس کی تعلیم کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ محبت کرنے والے خدا کو نفرت کرنے والا خدا بنا دیا گیا۔ جو کسی قصور یا خطا کو معاف کر نہیں سکتا۔ گویا وہی پرانا یہود کے خدا۔ "آسمانی باپ" کو بت پرستوں کے خدا کا جامہ پہنا دیا گیا۔ جوزیوس (جیوپیٹر) کی طرح اپنے بیٹے کو دوسروں کے گناہوں کا کفارہ بنانے کی غرض سے بے گناہ قتل کر دیتا ہے۔ اس تخیلِ الوہیت سے نہ صرف یسوع کے پیغام کی ساری خوبی ملیامیٹ ہو گئی۔ بلکہ اس نے "ابوتِ الٰہیہ" کے متعلق نہایت ہی ناگوار تخیل پیش کر دیا۔ یعنی باپ ہو کر بھی خدا اس قدر بیدرد ہے کہ اپنے بیٹے کو دوسروں کے عوض موت کے گھاٹ اتارتا ہے۔

جو نقشۂ صفاتِ ربانی آنحضرتؐ نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ وہ دیگر سابق تخیلات سے اپنی خوبی میں بہت ہی بڑھ چڑھ کر ہے۔ مثلاً محمدؐ (روحی فداہ) کا خدا وہ اللہ ہے۔ جو ربّ ہے رحمان ہے رحیم ہے۔ اور مالکِ یوم الدین ہے۔ یہ چار صفات قرآن مجید کی پہلی ہی سورت (فاتحہ) میں بیان ہوئی ہیں۔ اور باقی ماندہ جمیع اوصافِ الٰہی مندرجہ قرآن ان صفات کی شاخیں ہیں گویا سب صفات ان چار میں مضمر ہیں۔ آنحضرتؐ کا خدا وہ ربّ ہے۔ جو چیزوں کو پیدا کرتا ہے۔ اور ان میں مختلف استعدادیں رکھ دیتا ہے۔ اور ان کی پرورش اس طریقہ پر کرتا ہے۔ کہ وہ اشیاء نشو و نما کے مختلف منازل طے کر کے درجہ کمال کو پہنچ جائیں۔ اور یہ منازل خود اسی نے مقرر فرمائی ہیں۔ تاکہ اس کی ہر مخلوق ارتقاء پذیر ہو سکے وہ رحمٰن ہے۔ جس نے محض اپنی مہربانی کی وجہ سے اپنے بندوں کے لئے وہ اشیاء مہیا فرما دی ہیں۔ جن کی انہیں ہر دم ضرورت ہے۔ اور تمام برکات ان کو محض اس کی مہربانی سے حاصل ہوتی ہیں

ان کا خدا پر کوئی داعیہ نہیں کوئی حق نہیں۔ وہ رحیم ہے۔ جو اپنی مہربانی کی وجہ سے بندوں کو ان کے نیک اعمال پر بزارگنا انعام دیتا ہے۔ اور وہ انعام زیادہ تر ہماری مخفی قوتوں کو بروئے کار لانے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن اگر اس کے بندے اپنی نشو ونماء میں غلط راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔ تو وہ انہیں سزا نہیں دیتا۔ کیونکہ وہ نہ توججوں اور مفتیوں یا قاضیوں کی طرح قانون کا پابند ہے۔ اور نہ وہ "کلیسیاء کا خدا ہے۔ وہ اپنے قوانین کا خود مالک ہے۔ اور اس لئے مالک یوم الدین ہے۔ وہ اکثر وبیشتر اپنے بندوں کے قصوروں کو معاف کر دیا کرتا ہے۔ اور جب وہ دیکھتا ہے۔ کہ اب صرف سزا ہی سے خاطی انسان کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ تو وہ سزا بھی دیتا ہے۔ لیکن اس کا منشاء اس سزا ہی سے بھی وہی اصلاح اور بہبودی مخلوقات ہوتا ہے۔ اس لئے اسے مالک یوم الدین کہا گیا ہے۔

ان چاروں صفات حسنہ پر غور کیجیئے۔ اور آپ دیکھیں گے۔ کہ کائنات کا ہر ذرہ' اپنی تخلیق نشوونما اور ترقی اور پرورش کی بناء پر ان صفات پر شہادت دے رہا ہے۔ کاش ہم ان چاروں صفات میں اپنے خدا کی اتباع کریں! اگر ایسا ہو تو اس کی مرضی جیسی کہ آسمان پر پوری ہوتی ہے۔ زمین پر بھی پوری ہونے لگے۔ اس کے طریقے تو سب کے لئے یکساں ہیں۔ اس کی عنایات ہر شخص کے لئے عام ہیں اگر دنیاوی بادشاہ' رب۔ رحمٰن۔ رحیم اور مالک یوم الدین کے طریق پر حکومت کرنے لگیں تو وہ بادشاہت جس کی آرزو تمام عمر یسوع کو رہی آج اس دنیا میں قائم ہو جائے۔ جس طرح آنحضرتؐ کے زمانہ میں ہو گئی تھی۔

ہمارے اخلاق حسنہ دراصل صفاتِ الٰہیہ کا عکس ہیں

ان قضایا کی رو سے دنیا کو پہلے پہل اس بات کا علم ہوا تھا۔ کہ ایمان باللہ کے معنی دراصل ان حسنات پر ایمان لانے کے ہیں۔ جو اس (رب) کے نام سے متعلق ہیں۔ اور ہمارے اخلاق فاضلہ انہیں صفات کے آثار واظلال ہیں۔ یہ وہ صداقت ہے۔ جو حال ہی میں مغربی دنیا کو معلوم ہوئی ہے۔ اسلامی عبادت دراصل اپنے مزاج اور طبیعت کو الٰہی صفات کے سانچوں میں ڈھالنے کا نام ہے۔ اسی لئے

خدا کی کتاب میں، از سرتاپا شروع سے آخر تک خدا ہی کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ اور باقی ماندہ بیانات اسی مقصد عالیہ کی تائید میں مندرج ہوئے ہیں۔ اس زاویۂ نگاہ سے ہم قرآن کے مطالب کو سات امور پر تقسیم کر سکتے ہیں۔ جن میں

(۱) "اللہ" بمنزلۂ مرکز قرار دیا جا سکتا ہے۔

(۲) تذکرۂ صفات باری یا ان حالات کا تذکرہ جن کے ماتحت وہ اپنی صفات کا اظہار کرتا ہے۔

(۳) کائنات کے شیئون مختلفہ جو انہی صفات مختلفہ کا مظہر ہیں۔

(۴) مذکورہ بالا صفات سے انسانی اعمال کی مطابقت جس کا نام عبادت نیکی حسنات اتقا یا پاکیزگی یا نامطابقت یا اختلاف جس کا نام بدی بُرائی یا گناہ ہے۔

(۵) اس قانون کی تشریح جس پر کاربند ہونے سے ہم لوگ ان صفات الہیۃ سے مطابقت حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اغلاط سے بچنے کے طریق پہچان سکتے ہیں۔

(۶) ان اشخاص کا تذکرہ جنہوں نے صفاتِ الہیۃ کو اعلےٰ طریق پر اپنے اندر جذب کر کے اپنی زندگی کو الہٰی صفات کے مطابق بنا لیا۔ یا ان کا جنہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اول الذکر لوگ انبیاء، شہداء، صدیق، اور صلحا کہلاتے ہیں۔ ان کے مخالف شیاطین یا اخوان شیاطین یعنی گنہگار یا فاسق و فاجر۔

(۷) تذکرۂ حیات بعد الممات اور یہ تذکرہ بھی اصول مذکورہ کی تشریح و اظہار ہی کی خاطر کیا گیا۔ "جن لوگوں نے اپنے آپ کو الہٰی صفات سے متصف کر لیا ہے۔ وہ اس خوشگوار مقام میں رہیں گے جسے "بہشت" کہتے ہیں۔ اور جن لوگوں میں کمی رہ گئی ہو گی۔ انھیں کچھ عرصہ تک اصلاح کے جس مقام میں رہنا ہو گا۔ اسے عرف عام میں دوزخ کہتے ہیں۔ اسلام میں "ابدی دوزخ" پر اعتقاد رکھنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید کا نزول محض اس لئے ہوا۔ کہ ہم کو خدا اور اس کی راہوں کا علم ہو جائے۔ اور ان سنن الہیۃ پر کاربند ہونے کا راستہ سمجھ میں آجائے۔ اگر فروتنی کے ساتھ خدا کے ہم قدم ہو کر زندگی بسر کرنا بہترین طریق حیات ہے۔ اور ایک دہریہ بھی اس کے خلاف نہیں کر سکتا کیونکہ وہ بھی قوانین فطرت ہی کی پابندی کرتا ہے۔ اور قوانین فطرت سنن الہیۃ کی ہی مختلف صورتیں ہیں

تو وحی والہام کی غرض وغایت صرف یہی ہونی چاہیئے۔ کہ ہمیں "سنت اللہ" کا علم ہو جائے۔ قطع نظر اس امر سے کہ ماسوائے قرآن جمیع کتب مقدسہ محرف ہو چکی ہیں۔ اگر ہم ان کی صحت کو تسلیم بھی کریں۔ تو بھی یہ کتابیں اب ہمارے مفید مطلب نہیں ہیں۔ کیونکہ "صحیفہ فطرت" میں جو صفاتِ الٰہیہ مرقوم نظر آتی ہیں۔ ان کا تذکرہ ان کتب سابقہ میں موجود نہیں۔ پس اگر قرآن میں سراسر خدا اور اس کی سُنت یعنی اس کی ان راہوں کا بیان ہے۔ جن پر نظامِ عالم چل رہا ہے۔ اور ایسا ہی ان ہدایتوں کا مذکور ہے۔ جن پر کاربند ہونے سے ہم لوگ بھی اس سُنتِ الٰہیہ پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔ تو کیا قرآن مجید کا یہ دعوی قابل تسلیم نہیں ہے۔ کہ وہ واحد کتاب زیر سما ہے۔ جو الہام کے مقصد کو بطرز احسن پورا کرتی ہے"؟

"آستانۂ صداقت اسلام" از مصنف کتاب ہذا

اسلامی نماز اور اس کی غرض

ہر شخص کو جو اخلاق حسنہ سے متصف ہونا چاہتا ہے۔ ضروری ہے کہ وہ اس طرح زندگی بسر کرے کہ صفاتِ الٰہیہ کا عکس، اس کی زندگی سے نمایاں ہو۔ کیونکہ اخلاق حسنہ صفات الٰہیہ سے ہی براہ راست تعلق رکھتے ہیں۔ ہم کو اپنے دلوں کا جائزہ لینا چاہیئے۔ اور اپنے طرز عمل کو دن میں کئی مرتبہ جانچنا چاہیے۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ہمارا طریق کار سنت اللہ سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں۔ اس لیے حضرت محمدؐ نے ہمیں نمازِ پنجگانہ کی تاکید فرمائی تھی کیونکہ نماز اس چشمۂ رواں کی مانند ہے۔ جو دن میں کئی بار کسی کے مکان کے پاس سے گزرے۔ جس میں وہ نہا کر اپنے آپ کو پاکیزہ کر لے۔ اور شادابی حاصل کرلے۔ اسی طرح نماز بھی دل کو شاداب اور پاک کرتی ہے۔ اور اسلامی نماز کا تخیل اور اس کے الفاظ دونوں ہی مسلمانوں کے لیے ایک خوش آیند امر ہیں۔ اور اس لحاظ سے مسجد آباد اور دیگر معابد مقابلۃً کم رونق نظر آتے ہیں۔ صرف مسیحی دنیا ہی کو اسبات کی شکایت نہیں۔ کہ گرجے خالی پڑے رہتے ہیں۔ دیگر مذاہب کے تمام معابد کا یہی حال ہے۔ لیکن مساجد کبھی خالی نہیں پائی جاتیں۔ اور یہ بھی واضح ہو کہ مسلمانوں کو دن میں پانچ مرتبہ مساجد میں آنا پڑتا ہے۔ جبکہ دوسرے مذاہب میں خدا کی یاد آٹھویں دن کی جاتی ہے۔ اسقف اعظم کنٹربری نے اس بات کا سبب کسی حد تک معلوم کیا ہے۔ کہ آخر لوگ گرجوں کی طرف سے کیوں اسقدر

غافل ہوتے جاتے ہیں۔ گزشتہ چرچ کانگریس میں انہوں نے پادریوں کو نصیحت کی۔ کہ کلیسائی مواعظ وخطبات کی نوعیت کو بہتر بنائیں۔ تاکہ سامعین جوق در جوق ان سے مستفید ہونے کے لیے آئیں۔ شاید سینما سے یہ کام بہتر نکل سکے۔ اور عجب نہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد سینما ہی ان مواعظ وخطبوں کا قائم مقام بھی ہو جائے۔ لیکن اسلامی نماز میں دلچسپی کا راز یہ ہے۔ کہ مسلمان اپنی ہر نماز میں اپنی موجودہ ضروریات خدا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور ان الفاظ کی روشنی میں اپنے اعمال کا جائزہ لیتا ہے۔ وہ ہر نماز میں خدا کے بعض صفات کو پیش نظر رکھتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس نے گزشتہ نماز سے لے کر اس دم ان صفات کو اپنی زندگی میں منعکس کیا یا نہیں۔ بقول لارڈ ہیڈلے اس خیال کو سامنے رکھ کر ایک مسلمان پانچ نہیں پچاس نمازیں بھی ادا کرے تو تھوڑی ہیں۔ اپنی نمازوں میں ایک مومن اپنے کاروبار اور طرز معاشرت کا جائزہ بھی لیتا ہے۔ ہر نماز میں وہ خدا کے ان چار ناموں کی تلاوت کرتا ہے۔ رب رحمٰن۔ رحیم اور مالک یوم الدین، یہ صفات اس کے اخلاق سے بلاواسطہ نسبت رکھتے ہیں۔ ہر صفت اس کو محاسبۂ نفس کا موقعہ دیتی ہے۔ کہ وہ خدا کی بادشاہت میں رہنے کے قابل ہے یا نہیں۔ لیکن اس موقعہ پر میں تعلقات ومعاملات انسانی کے کاروباری پہلو کو لوں گا۔ کیونکہ عموماً لوگ اسی وجہ سے اپنی نمازوں سے غافل ہو جاتے ہیں۔ ہمیں کامیابی کے لئے ہر کاروبار میں تین چیزوں کی ضرورت ہے (۱) استعداد (۲) مواد (۳) ہمت افزائی۔ ان تین چیزوں کے ہونے پر ہی حقیقی کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ نماز میں ایک مسلمان کو اس بات کا یقین دلایا جاتا ہے کہ رب العٰلمین نے اس کی امداد کے لئے ہر شئے مہیا کر دی ہے۔ اور خود اس کی ذات میں کامیاب ہونے کے لئے حیرت انگیز قابلیت اور استعداد ودیعت کر دی ہے۔ یہ استعداد اس کام کے سلسلہ میں بروئے کار آ جائے گی ایسی ہی کسی مقصد میں کامیابی کی لیاقت بھی اس میں دکھلائی گئی ہے۔ اور اگر اس کام میں اسے کسی چیز کی ضرورت ہے۔ تو خدا نے رحمٰن کی حیثیت سے ایسی ضروریات بھی موجود کر رکھی ہیں۔ کیونکہ یہی اس لفظ کا مطلب ہے۔ انسان کا کام یہ ہے۔ کہ اپنے مفید مطلب اشیاء کو تلاش کرے۔ لیکن واضح ہو کہ خدا کی یہ نعماء انہی لوگوں کے لئے کارآمد ہو سکتی ہیں۔ جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ یہ اس کا تقاضائے رحیمیت ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ اس کے انعامات بے شمار ہیں۔ لیکن وہ اسی وقت ملتے ہیں۔ جب ہم

سرگرم عمل ہوتے ہیں۔ اگر اس رحمان نے ہماری ضروریات کی چیزیں ساری مہیا کر رکھی ہیں۔ تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں۔ کہ وہ ہر شخص کے لئے وقف ہیں۔ صرف وہی لوگ ان سے متمتع ہو سکتے ہیں۔ جو پہلے خود کوشش کرتے ہیں۔ اور وہ مالک یوم الدین بھی ہے۔ پس اگر ہم اس کی چیزوں کا غلط استعمال کریں گے۔ تو وہ ہمیں سزا بھی دے سکتا ہے۔ انصاف کیجئے۔ ہمارے کاروبار کی ترقی کے لئے نماز سے بڑھ کر کوئی اور محرک ہو سکتا ہے؟ کیا اس اطمینان اور ایقان سے بڑھ کر اور کوئی چیز ہو سکتی ہے۔ جو نماز میں اس کائنات کے حاکم کی جانب سے ملتا ہے۔ جس کی وجہ سے ہمارے اندر قوت عمل کی ایسی روح پیدا ہو سکتی ہے۔ جس سے ہفتوں کا کام دنوں میں انجام پا سکتا ہے۔ اور ہمارے اندر ایسی قوت فکر پیدا ہو سکتی ہے۔ جس کی مدد سے ہمارے کاموں میں سہولت اور صفائی آجائے گی۔ میں نے اس جگہ اسلامی نماز کے لئے پہلے ہی فقرہ کے مطالب بیان کئے ہیں۔ اسی سے دوسروں کو قیاس کر لیجئے۔ اس کے ہر لفظ میں زندگی اور آب زندگی بھرا ہوا ہے۔ ہماری اخلاقی زندگی سے قطع نظر کر کے روزمرہ کی زندگی میں بے شمار مواقع ایسے آتے ہیں۔ جب کہ ہم متفکر اور پریشان ہو جاتے ہیں۔ اور امداد کے طالب ہوتے ہیں۔ دنیا ہماری مدد کے لئے نہ آئی۔ اور نہ آئے گی۔ مگر خدا آیا ہے۔ آئے گا۔ اسلامی نماز امداد الٰہی کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ اور انسان کو اعتماد علے النفس کا سبق بھی سکھاتی ہے۔ یسوع نے سچ کہا تھا۔ "انسان صرف روٹی ہی سے نہیں جیتا۔ بلکہ ہر لفظ سے جو خدا کے منہ سے نکلتا ہے"۔ آنحضرت ﷺ نے نماز سکھلا کر اور اسے وقتاً فوقتاً ادا کرنے سے ان کے قول کو ایک صداقت عظمیٰ ثابت کر دکھایا۔

آغاز کلام و کار پر اسلامی مقولہ

آنحضرت ﷺ نے ہمیں وہ بے نظیر طریق عمل بتایا ہے۔ جو دیگر طریقہ ہائے کار سے جو اوروں نے ہماری ہدایت کے لئے تجویز کئے ہیں۔ تاثیر اور افادہ میں بہت بڑھ چڑھ کر ہے۔ آپؐ نے ہدایت کی ہے کہ ہر کام شروع کرنے سے پہلے "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کہہ لیا کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ میں اس کام کو یا اس بات کو اس خدا کا نام لے کر شروع کرتا ہوں۔ جو رحمٰن اور رحیم ہے۔ یعنی وہ خدا ایسا ہے۔ جس نے اپنی مہربانی سے بغیر ہمارے کسی استحقاق کے ہماری ضروریات ہمارے لئے مہیا کر دی ہیں

اور اگر ہم کوئی نیک کام کریں گے تو وہ ہمیں انعامات کثیرہ عطا کرے گا۔ میں نے ابھی بیان کیا ہے۔ کہ یہ دو اسمائے حسنہ ہم کو کامیابی کے لئے وسائل ضروریہ کی افراط کا یقین دلاتے ہیں۔ لیکن اگر ہم اس کلمۂ خیر کی مزاولت کریں گے۔ تو ہمارے اندر تو دا نہی صفات کا عکس پیدا ہو جائے گا۔ کیونکہ حقیقی پاکیزگی یہ ہے۔ کہ ہمارے اعمال زندگی سے صفات الٰہیہ کا جلوہ ظاہر ہو۔ مسلمان پر فرض ہے۔ کہ وہ دوسروں کے ساتھ رحمانیت اور رحیمیت کا برتاؤ کرے۔ اس کو دوسروں کی ضروریات کا خیال رکھنا چاہیئے خواہ وہ مستحق توجہ ہوں یا نہ ہوں۔ اسے دوسروں کی مدد از خود بغیر ان کی درخواست کے کرنی چاہیئے۔ اور اگر دوسرے اس کی خدمت کریں تو پھر اسے حق الخدمت سے بدرجہا زیادہ انعام دینا چاہیئے۔ آنحضرتؐ نے اس مختصر کلمہ میں پورے اسلام کو جمع کر دیا ہے۔ پس اگر ہم دوسروں کے ساتھ اس رنگ کا برتاؤ کریں گے تو دنیا ہی میں جنت کا نظارہ پیش نظر ہو سکتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا تھا کہ "خدا اور اپنے پڑوسی سے محبت رکھو"۔ یہ بھی اک عمدہ اصول زندگی ہے۔ لیکن آنحضرتؐ نے یہ فرما کر "کیا تم خدا سے محبت رکھنا چاہتے ہو؟ اگر ایسا ہے۔ تو اس کے بندوں سے محبت کرو"۔ اس اصول سے بہتر اصول پیش کیا ہے اور اس کے بعد آپؐ نے ہمیں خدا سے محبت کرنے کا طریق بھی بتایا ہے۔ اسی لئے ہم کو حکم دیا۔ کہ ہر کام کے آغاز میں "بسم اللہ" کہہ لیا کریں۔ خواہ وہ کام ذاتی ہو۔ خاندان سے متعلق ہو یا دوسروں سے۔

اسلامی طریق تحیّت

اس کے علاوہ آپؐ نے باہم دگر اسلام کا کلمہ بھی اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے مقرر فرمایا ہے۔ آپؐ نے فرمایا "جب تم دوسروں سے ملو تو کہو اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ" یعنی تم پر سلامتی (منجانب اللہ) نازل ہو۔ "السلام" جیسا کہ قرآن میں مرقوم ہے۔ خدا تعالٰے کا بھی اک نام ہے۔ تو اس کا باطنی مفہوم یہ ہوا "کہ سلامتی کا خدا تمہارا نگہبان ہے" پس تم بھی دنیا میں سلامتی قائم رکھو۔ کیا اچھا ہو اگر ہم اپنے اپنے عقاید کی خوبیوں کی تعریف کرنے کی بجائے۔ زندگی کے ان چھوٹے چھوٹے سنہری اصولوں پر غور کریں۔ بیشک دوسروں سے محبت کرنا مذہب کا خاص مقصد ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ہادیانِ عالم میں سے کس مقدس شخص نے اس اصول محبت کو عملی جامہ پہنایا ہے؟ آپؐ فرماتے ہیں "کیا تم اپنے خدا سے محبت کرنا چاہتے ہو؟ اگر ایسا ہے تو اس کے

بندوں سے محبت کرو۔" گویا یہ فرما کر آپؐ نے اس اصول کو قریب الفہم بنا دیا۔ کیونکہ خدا کو پیار کرنے سے پہلے پیار کرنے کا طریقہ بھی تو معلوم ہونا چاہیئے۔ علاوہ بریں خدا کسی کی محبت کا محتاج بھی نہیں۔ آپؐ نے ہمیں رحیم و کریم ہونے کی تاکید بھی فرمائی ہے۔ اور آپؐ کی یہ خواہش بھی ہے۔ کہ ہم جس سے ملیں تو اس سے صلح قائم رکھیں۔ دن میں پانچ بار اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور دیکھیں کہ ان اصولوں پر کہاں تک کاربند ہوئے ؟ کس حد تک دوسروں کے ساتھ رحم اور محبت کا برتاؤ کیا۔ کس حد تک دنیا میں صلح اور امن قائم کیا۔ اگر ایسا نہیں کیا تو ادعائے اسلام بیکار ہے۔

اسلام خدا اور بندہ کے مابین کسی واسطہ کو جائز نہیں رکھتا

آنحضرتؐ نے پہلی دفعہ دنیا کو یہ تعلیم دی۔ کہ خالق اور مخلوق کے درمیان کوئی واسطہ ضروری نہیں ہے۔ ہر شخص براہِ راست خدا تعالیٰ سے دعا کر سکتا ہے۔ اور اس صداقت کو قرآن نے ذہن نشین کیا ہے۔ قرآن ان لاتعداد نعماء کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جو اس عالم کون میں خدا نے ہمارے لئے مہیا کی ہیں۔ اور یہ اشیاء ہم کو بغیر کسی درمیانی واسطہ کے حاصل ہو رہی ہیں۔ ہم انھیں اپنی ذاتی کوشش سے حاصل کر سکتے ہیں۔ تاکہ ہماری ضروریات رفع ہو سکیں۔ ہاں یہ ضروری ہے۔ کہ کوئی شخص ان نعما کا طریق استعمال ہمیں سمجھا دے۔ اور جب یہ بات ہماری سمجھ میں آجاتی ہے۔ تو پھر ہمیں کسی دوسرے کی احتیاج نہیں رہتی۔ "فطرت" بہر کیف خالق فطرت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ لیکن اس خالق کی سُنت سے آگاہی دینے کے لئے ایک شخص ضرور درکار ہے۔ تاکہ وہ ہمیں یہ بتائے کہ ہم اس تک کیونکر پہنچ سکتے ہیں۔ خدا کا دروازہ ہر شخص کے لئے کھلا ہوا ہے۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا	"اور جو لوگ ہمارے لئے محنت اٹھاتے
فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ	ہیں، ہم یقیناً انہیں اپنے راستوں پر
سُبُلَنَا ط (العنکبوت ۲۹: ۶۹)	چلائیں گے۔"

اور فرمایا۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ	"اور جب میرے بندے تجھ سے میرے

عَنِّىْ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ	متعلق پوچھیں تو میں قریب ہوں
دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ	میں دعا کرنے والے کی دعا کو جب
فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِىْ	وہ مجھے پکارتا ہے قبول کرتا ہوں پس
وَلْيُؤْمِنُوْا بِىْ لَعَلَّهُمْ	چاہیئے کہ میری فرمانبرداری کریں اور چاہیئے
يَرْشُدُوْنَ (البقرہ) ۲:۱۸۶	کہ مجھ پر ایمان لائیں تاکہ ہدایت پائیں"۔

ایک نبی یا رسول نمونہ بیشک ہوتا ہے۔ ہادی اور راہنما' اور معلم بھی ہوتا ہے۔ لیکن "واسطہ" نہیں ہوتا "واسطہ" پر تکیہ کرنے سے ذمہ داری کا احساس کم ہوجاتا ہے۔ بلکہ اپنی ذات پر بھروسہ کرنے کی صفت زائل ہوجاتی ہے۔ توحید باری تعالےٰ پر ایمان لانے کا ایک مقصد تو یہی ہے کہ ہمارے اندر استقلال مزاج اور آزاد فیصلہ کرنے کی صفات پیدا ہوجائیں۔ تاکہ ہم آزادی کے ساتھ سرگرم عمل ہوسکیں۔ تو کیا کسی "واسطہ" پر تکیہ کرنے سے ہمارے اندر یہ صفات حسنہ پیدا ہوسکتی ہیں۔ اعتقاد علےٰ الوسائط تو دراصل بت پرستی کا بقیۃ السیف ہے۔ ازمنۂ قدیم میں ہر ملک اور ہر قوم میں "واسطہ" قرار دیا گیا تھا۔ اور یہی اعتقاد آہستہ آہستہ توحید پرستی کے ہر شعبہ میں داخل ہوگیا۔ اور کوئی آسمانی مذہب اس نقص سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اور نہ صرف نبی یا بانیٔ مذہب ہی کو واسطہ قرار دے دیا گیا۔ بلکہ ہر نیک آدمی کو واسطہ سمجھنے کی عادت پڑگئی۔ چنانچہ مسیحیت میں یسوع ہی واسطہ قرار نہیں دیا گیا۔ بلکہ اس کے بعد مریم۔ پطرس پوپوں اور دوسرے عمایدینِ کلیسیا کو بھی اسی فہرست میں داخل کرلیا گیا۔ اس جذبۂ تقدیس افراد کا مضرت رساں اثر جو کچھ یورپ پر ہوا ہے۔ اس کے بیان کی ضرورت نہیں ہے ۔ وہ تو اظہر من الشمس ہے۔ چند صدی پیشتر انگلستان بربریت اور جہالت کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اس کی ترقی کی تاریخ اسی وقت سے شروع ہوتی ہے۔ جبکہ اس کے افراد نے پادریوں کے اقتدار پر پہلی ضرب لگائی۔ اور پارلیمنٹ کی بدولت ان کے پنجے سے رہائی نصیب ہوئی۔ پس اندریں حالات کیا یہ رسول عربی کا انسانیت پر احسان عظیم نہیں ہے۔ کہ آپؐ نے یہ فرما کر کہ خدا اور مخلوق کے درمیان کوئی واسطہ نہیں۔ دنیا کو اس لعنت سے آزادی عطا کی ؟ اسلام میں کوئی جماعت پادریوں کی قائم مقام نہیں ہے ہر شخص خود ہی اپنا مذہبی رہنما بھی ہے ؛

آپؐ ہی پہلے نبی ہیں۔ جنہوں نے اس خیال کی جڑھ پر کلہاڑا رکھ دیا۔ کہ دنیا میں صرف کوئی خاص قوم خدا کی محبوب ہے۔ اور وہی نجات کی مستحق ہے۔ قرآن کریم نے یہ فرما کر دنیا کو امن کا پیغام سنا دیا۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ	"جو ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے
هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ	اور عیسائی اور صابی جو کوئی بھی اللہ
مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ	اور پیچھے آنے والے دن پر ایمان لاتا
الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا	ہے اور اچھے کام کرتا ہے تو ان کیلئے
فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ	ان کا بدلہ اپنے رب کے ہاں ہے اور
رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ	ان کو کوئی ڈر نہیں اور نہ وہ غمگین
وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ	ہوں گے۔"

(البقرہ ۲:۶۲)

قرآن کی اس آیت کا۔ جو دراصل پیغام امن ہے۔ کیونکہ اس کی بناء پر جملہ امتیازات ملی و قومی باطل ہو جاتے ہیں۔ مرقس کی انجیل باب ۱۶ آیت ۱۵-۱۶ کی عبارت سے مقابلہ کیجئے۔ جس میں مرقوم ہے کہ "تم جا کر تمام قوموں میں منادی کر دو۔ اور انجیل کا پیغام ہر شخص کو سنا دو۔ جو شخص ایمان لا کر بپتسمہ پائیگا وہ نجات کا حقدار ہوگا۔ مگر جو ایمان نہیں لائے گا۔ وہ دوزخ میں ڈالا جائے گا" کہاں بپتسمہ کی تحدید اور کہاں ایمان کی صلائے عام؟ عقیدۂ اتہانسی اس کے تخویف آمیز کلمات۔ غالباً اسی عبارت کے آخری جزو کی صدائے بازگشت ہیں۔ جو آج تک بھی گرجوں میں دہرائے جاتے ہیں۔ جن کی وجہ سے پادریوں نے محکمۂ احتساب کے دوران قیام میں بیگناہ لوگوں پر ہزاروں طرح کے ظلم و ستم نہایت اطمینان کے ساتھ روا رکھے۔ لیکن لوگوں کو اب اس ظالمانہ عقیدہ کے عیوب کا احساس ہو گیا ہے اور کوشش کی جا رہی ہے۔ کہ وہ تخویف آمیز کلمات عیسائی دعائے نماز میں سے حذف کر دیئے جائیں کیا دنیا نبی کریمؐ کی شکر گزار نہ ہوگی۔ جنہوں نے سب سے پہلے اس عیب کو عالم پر آشکارا کیا؟ آپؐ نے فرمایا کہ نجات زید یا بکر پر ایمان لانے سے نہیں ہو سکتی۔ بلکہ صحیح عقاید رکھنے سے۔ اور اس کے بعد

اعمال حسنہ بجا لانے سے کیونکہ محض اعتقاد یا ایمان خدا کی نظر میں لاشے ہے نبی پر ایمان لانے کے معنیٰ یہ ہیں۔ کہ اس پیغام پر ایمان لایا جائے جو وہ خدا کی طرف سے لایا ہے۔ یعنی احکام الٰہی کی پابندی کی جائے۔ جو اس نے بتلائی۔

توحید خالص

یہ امر ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ کہ آنحضرتؐ ہی وہ مقدس انسان ہیں جنہوں نے خالص توحید کا پیغام دنیا کے سامنے پیش کیا۔ آپؐ نے اس خدا کی عبادت کا حکم دیا جو نہ کسی سے پیدا ہوا۔ اور نہ کوئی اس سے پیدا ہوا۔ اور نہ کوئی اس کا شریک ہے۔ آپؐ سے پہلے دنیا میں ہر شے معبود انسان تھی۔ سورج، چاند، آسمان، زمین، ستارے، دریا، درخت، پتھر غرضیکہ جمیع مظاہر کائنات انسان کا معبود تھے۔ آپؐ نے بیک جنبشِ لب ان تمام خود ساختہ معبودوں کو درجۂ الوہیت سے ہمیشہ کے لئے ساقط فرما دیا۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ

(الاخلاص) ۱۱۲: ۱-۴

"کہہ اللہ (تعالیٰ) ایک ہے۔ اللہ (تعالیٰ) بے نیاز ہے۔ نہ اس کا کوئی بیٹا ہے۔ اور نہ وہ کسی کا بیٹا ہے۔ اور اس کا کوئی ہمسر نہیں"

مقصد توحید

آپؐ نے توحید پر اس لئے زور نہیں دیا کہ آپؐ کا خدا خروج کے بیان کردہ خدا کی طرح حاسد یا کینہ توز ہے (خروج ۲۰: ۵) وہ تو ان ادنے جذبات سے کہیں ارفع اور اعلےٰ ہے۔ اگر کل دنیا مشرک ہو جائے تو اس کے جلال میں ذرہ بھر کمی نہیں آسکتی۔ اور اگر کل دنیا موحد ہو جائے۔ تو اس میں ذرہ بھر اضافہ نہیں ہو سکتا۔[۱] بلکہ اس میں انسان ہی کا فائدہ ہے۔ جو آنحضرتؐ نے کامل توحید پر اعتقاد رکھنے کا حکم دیا۔[۲] انسان اس دنیا میں خدا کا خلیفہ ہے[۳] اور یہ منصب اس لئے عنایت ہوا۔ کہ مقصد تخلیق عالم پورا ہو چکے۔ اور چونکہ مقصد مذکور بعض مقررہ طریقوں پر کاربند ہونے سے حاصل ہو سکتا ہے اور وہ طریقے اسماء وصفات الٰہیہ کے اظلال ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ انسان کے افعال و اعمال سے ان اسمائے مذکورہ کی شان جلوہ گر ہو۔ توحید حقیقی تو ہم میں اس وقت جلوہ گر ہوگی۔ جب خدا تعالےٰ کی

لہ ۳۱: ۱۲ ۔ ۲ه ۳۱: ۱۲ ۔ ۳ه ۲: ۳۰

صفات ہمارا منقول علیہ ہوں۔ جیسا وہ ہے۔ ویسا ہی ہونے کی ہم کوشش کریں۔ چنانچہ قرآن میں جو

صِبْغَةَ اللّٰهِ (البقرہ) ۲: ۱۳۸

مندرج ہے۔ اس کا یہی مفہوم ہے۔ یعنی ہمارا مذہب یہ ہونا چاہیے۔ کہ ہم صبغۃ اللہ (خدا کے رنگ) میں رنگین ہو جائیں۔ یعنی ہمیں اس دنیا میں اسی طرح رہنا چاہیئے۔ جس طرح خدا اس دنیا میں عامل اور موثر ہے۔ ہم بھی اس کے ساتھ اس دنیا کے کاموں میں شریک ہیں۔ گو کہ ہمارا حصہ نہایت ہی قلیل ہے۔ پس توحید کی تعلیم دے کر نبی کریمؐ نے ہمارے اندر مذہب کی ایک خاص آگ بھڑکائی ہے اس لحاظ سے مذہب صرف حیات بعد الموت کی بہبودی کا نام نہیں۔ بلکہ وہ ایسی تجویز اور شاہراہ عمل ہے جس پر کاربند ہو کر اس دنیا میں ہم لوگ مشیت آلہی کے معاون بن سکتے ہیں۔ مذہب کی اس جدید تعبیر نے عبادت الٰہی کا مفہوم بالکل ہی بدل دیا ہے۔ اس کی رو سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کی حمد و ثناء کے معنی صرف یہی نہیں۔ کہ چند غزلیں یا گیت یا بھجن خوش الحانی کے ساتھ گا بجالی جائیں۔ یا چند مقررہ اوضاع کے ساتھ نمازیں پڑھ لی جائیں۔ بلکہ ہمیں ان استعدادوں اور قابلیتوں کو بروئے کار لانا چاہیئے جو اس خدا نے ہمارے اندر اور ہماری خدمت گذار دیگر اشیاء میں ودیعت فرمادی ہیں۔ خدا نے قرآن میں پہلا حکم ہی یہ دیا ہے۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا	"اے لوگو! اپنے رب کی عبادت
رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ	کرو۔ جس نے تمہیں پیدا کیا اور
وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ	انھیں جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ	متقی ہو جاؤ۔"
الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ	"وہ جس نے زمین کو تمہارے لئے
فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً	فرش بنایا اور آسمان کو عمارت
وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً	اور اوپر سے پانی اوتارا پھر اس
فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ	کے ساتھ تمہارے لئے پھلوں
رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا	سے رزق نکالا۔ پس تم اللہ

لِلّٰہِ اَنۡدَادًا (البقرہ ۲:۲۱-۲۲) کے ہمسر نہ ٹھہراؤ۔"

عبادت کا کوئی اور مفہوم مثلاً خدا کو کسی طرح خوش کرنا یا اس کی مہربانی حاصل کرنا وغیرہ منجر بشرک ہے۔ اس نیت کا نتیجہ بارہا شرک ہی نکل چکا ہے۔

خدا ادراکِ انسانی سے بالا ہے

اسی طرح آپؐ نے پہلی مرتبہ صاف الفاظ میں دنیا کو بتا دیا کہ "خدا کی ذات ادراکِ انسانی سے بالا ہے وہ ذی جذبات نہیں ہے۔ انسانوں کی سی کوئی بات اس میں نہیں پائی جاتی۔ خدا تعالیٰ خوشی یا رنج کے جذبات سے متاثر نہیں ہوتا۔ وہ کسی شے (مادی یا ارضی) سے مشابہ نہیں ہے۔[۱] اس کی خوشی یہ ہے کہ اس کے عطا کردہ قواء جسمانی و دماغی کی پورے طور پر تربیت کریں۔ اور ان کو بطریقِ احسن استعمال میں لائیں۔ اسی طرح اس کی ناراضگی کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان قواء کو معطل کر دیں۔ یا بداعمالیوں کے باعث اس کی عطا کردہ استعداد کو زائل کر دیں۔ بالمقابل عیسائیوں نے مسیح میں خدا کو دیکھ کر اسے حدود مشخصہ میں نہ صرف محدود ہی کر دیا۔ بلکہ اسے انسانی جذبات سے بھی متکیف کیا۔

استعدادِ انسانی اور معصومیتِ فطرتِ انسانی

استعدادِ انسانی کے متعلق دنیا میں بہت سے غلط خیالات رائج تھے۔ بدی کو انسان کی طینت کا جزء لاینفک سمجھا جاتا تھا۔ اگر مسیحیت نے یہ تعلیم دی۔ کہ گناہ اور بدی دونوں انسانیت کا سرمایۂ امتیاز ہیں۔ تو دوسرے مذاہب نے یہ بتایا کہ حیاتِ انسانی سرتاپا مصائب اور طغیان سے مملو ہے۔ اور نجات کے لئے موت یا ہلاکت ہی ایک رستہ ہے۔ ہندو بزرگوں نے اس امر کو تیاگ میں دیکھا ہے۔ آنحضرتؐ نے سب سے پہلے دنیا کو بتایا۔ کہ طینت انسانی بالقوہ کامل ہے۔ اور یہ وہ صداقت ہے۔ جس پر موجودہ علم الحیوٰۃ گواہ ہے۔ اور یہ کہ وہ بروقت پیدائش ہر طرح گناہ سے پاک ہوتا ہے۔[۲] گناہ تو بقول حضورؐ اک امر اکتسابی ہے۔ طبعی یا ورثی امر نہیں۔ بقول قرآن انسانی فطرت غیر محدود ترقی کی استعداد رکھتی ہے۔ ہاں اس میں بدی کی طرف جانے کا میلان بھی ضرور موجود ہے۔ انسان اعلےٰ علیین تک پرواز کر سکتا ہے۔ لیکن اسفل السافلین میں بھی گر سکتا ہے۔ وہ محتاج ہدایت

---

[۱] (۶:۱۰۳) [۲] (۹۵:۴)

ہے۔ جس پر چل کر وہ لامحدود رفعت کو حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ آپؐ کے تعلیم کردہ مذہب نے بلندی کی طرف جانے کی ہدایت کی۔ اور پستی کی طرف مائل ہونے سے روکا۔ اس حقیقت پر تو آج واقعات نے مہر تصدیق لگادی۔ لیکن جس مقدس ہستی نے کل پیشینیہ مذاہب کے مقبولہ عقائد کے برخلاف اس حوصلہ افزا شاہراہ ترقی پر انسان کو ڈالا۔ اگر وہ خدا کا نبی نہ تھا تو پھر نہ معلوم نبوت کی کیا حقیقت ہے؟

مسئلۂ خیر و شر نیکی اور بدی کا مسئلہ اکثر لوگوں کے لئے لاینحل ثابت ہوا ہے۔ اور اس کو غلط طور پر سمجھنے کی وجہ سے نہ صرف فلسفۂ اخلاق ہی میں اختلاف آرا رونما ہوا۔ بلکہ طبائع انسانی پر بھی نہایت خراب اثر پڑا۔ اس مسئلہ کے غلط حل سے ذمہ داری کا احساس کم ہو گیا۔ مثلاً کلیسوی عقیدہ موروثی گناہ جو کہ انسان کو ورثہ میں ملا۔ اور وہ اس سے کفارہ کے بغیر نجات نہیں پا سکتا۔ انسان کو لاشے اور بیکار محض بنا دیا۔ جب وہ اس طرح ارتکاب شر پر مجبور ہے تو اس سے کسی نیکی کی امید ہی کیسے ہو سکتی ہے۔ آپؐ نے اس مسئلہ کو بھی صاف کر دیا۔ آپؐ نے تعلیم فرمائی۔ کہ خدا سرچشمۂ خیر ہے۔ پھر اس خالق کا بنایا ہوا انسان کس طرح طبعاً بدکار ہو سکتا ہے چنانچہ قرآن شریف نے فرمایا ہے۔ "جو کچھ تیرے رب کی طرف سے ہے۔ وہ اچھا ہی ہے۔" آپؐ نے فرمایا کہ طبیعت انسانی پاکیزہ بھی ہے اور کامل بھی۔" بدی بذاتِ خود کوئی چیز نہیں ہے۔ اشیاء کے غلط استعمال کا نام "شر" یا "بدی" ہے۔ افیون یا سنکھیا جب اس مقصد کے لئے استعمال ہوں۔ جس کے لئے وہ پیدا کی گئی ہیں۔ تو اچھی چیزیں ہیں۔ لیکن ان کا غلط استعمال ان کو برا بنا دیتا ہے۔ خدا کی بہترین نعماء میں سے کوئی لے لو۔ ہر ایک کا غلط یا ضرورت سے زیادہ استعمال ان کو مضرت رساں بنا دیتا ہے۔ مثلاً آگ کس قدر مفید اور آرام دہ ہے لیکن اگر اسے احتیاط کے ساتھ استعمال نہ کیا جائے۔ تو پھر انسان کے لئے قیامت صغریٰ سے کم نہیں۔ پانی جیسی مفید چیز کو بکثرت پینے سے مرضِ استسقاء پیدا ہو جاتا ہے۔ اور غذا بکثرت کھانے سے ضعف معدہ رونما ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے صدہا امراض اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

دنیا میں ہر شے کے لئے ایک اندازہ مقرر ہے۔ اس کے استعمال کا معین محل و موقع ہے اگر ہم مقررہ حدود سے متجاوز ہوں۔ یا اشیاء کا استعمال بے محل اور بے وقت نہ کریں۔ تو ان کی خوبی سے

عیب سے مبدّل ہو جائے گی۔ مسہل یا ملین اور قابض یا ممسک ہر دوا دویہ مفید انسان ہیں۔ اور اگر صحیح طور پر استعمال کی جائیں تو زندگی بخش ثابت ہوتی ہیں۔ لیکن خلاف محل استعمال کرنے سے باعثِ ہلاکت بن جاتی ہیں۔ غرضکہ مقررہ اندازہ میں ہر شے اچھی ہے۔ جب اندازہ سے تجاوز کرے گی بُری ہو جائے گی۔ قرآن مجید نے اسی زرّیں اصول کو جو کائنات میں جاری ہے ان الفاظ میں ذہن نشین کرایا ہے۔

اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ	"رحمٰن نے قرآن سکھایا، انسان
خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ	کو پیدا کیا، اسے بولنا سکھایا سورج
الْبَيَانَ اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ	اور چاند حساب کے نیچے ہیں اور
بِحُسْبَانٍ وَّالنَّجْمُ	بوٹیاں اور درخت سجدے
وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ	کرتے ہیں، اور آسمان کو
وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ	بلند کیا، اور میزان کو قائم کیا
الْمِيْزَانَ اَلَّا تَطْغَوْا فِى	تاکہ تم میزان میں سرکشی نہ کرو،
الْمِيْزَانِ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ	اور وزن کو انصاف سے قائم
بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا	کرو، اور تول میں کمی نہ کرو"۔
الْمِيْزَانَ (الرحمٰن) ۵۵: ۱-۹	

اخوتِ نسلِ انسانی

انسان فطرتاً مدنی الطبع ہے۔ حالتِ تجرد سے مسرور نہیں ہو سکتا ہمارے اندر صدہا خواہشات پائی جاتی ہیں۔ اور چونکہ انفرادی کوششوں سے ان کو پورا نہیں کر سکتے۔ لہٰذا جماعت کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اور ہمیں باہمد گر ضروریات کا خیال رکھنا ضرور ہے۔ ہم کو دوسروں کی خدمت کرنی چاہیئے۔ تاکہ دوسرے ہماری خدمت کریں۔ لیکن نفسانیت و خودغرضی کی وجہ سے ہر شخص دوسروں ہی سے خدمت لینی چاہتا ہے۔ اسی وجہ سے دنیا میں مصائب و آلام کا دروازہ کھلتا ہے۔ جور و تعدی ظلم و ستم، جرم و خطا جنگ و جدل۔ یہ تمام باتیں اسی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ کہ لوگ دوسروں کے حقوق کی

نگہداشت نہیں کرتے۔ اور ذاتی اغراض کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ حالانکہ ہمیں دوسروں کے لئے ایثار کرنا لازمی ہے۔ مگر صفتِ ایثار پیدا کرنے کیلئے جذبۂ اخوتِ انسانی کی تربیت ضروری ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لحاظ سے آنحضرتؐ اس بات کے حقدار ہیں۔ کہ آپؐ کو طبیبِ روحانی کا لقب دیا جائے۔ کیونکہ آپؐ نے صفتِ ایثار پیدا کرنے کا طریق بوجوہ احسن دنیا کو بتا دیا۔ آپؐ نے اخوت انسانی کے اصولوں کو واضح کیا۔ اور اپنی حیاتِ مبارکہ ہی میں انکو اپنے اردگرد قائم بھی فرمادیا۔ اور عربوں کی تمام برائیوں کا علاج صرف اسی بات سے کر دیا۔

آپؐ نے سب سے اول دنیا کو ان وسیع النظر عالمگیر اخوت کے اصولوں کی تعلیم دی جن کی بدولت انجام کار دنیا میں امن قائم ہوگا۔ یسوع صاحب کو بھی یہ خواہش تھی مگر وہ دل کی دل ہی میں رہی۔ کیونکہ مسیحیت کی تاریخ میں کسی جگہ عالمگیر اخوت کی روح جلوہ فرما نہیں ملتی۔ لیکن اسلام نے اس اخوت کی بناء ڈالی جس میں کالے اور گورے شریف اور اعلےٰ طبقے والے مسکین اور چھوٹے درجے والے۔ مالدار اور مفلس سب کے سب ایک سلک میں منسلک ہو گئے۔ آج دنیا عالمگیر مساوات کی خواہشمند ہے۔ لیکن اگر کبھی یہ خواہش پوری ہوئی تو اسلام کے اصولوں پر کاربند ہونے سے ہوگی۔ اس ضمن میں اسلامی تخیل الوہیت کی طرف اشارہ کرنا خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ اسلام سے پہلے مختص بالقوم اور مختص بالمکان خدا کی پرستش ہوتی تھی۔ نسلِ انسانی کی ہر ایک شاخ و قبیلہ کا خدا جدا جدا تھا۔ اگر یہود کا خدا ملک شام میں معبود تھا۔ تو یزدان ملک ایران میں یہود خدائے ابراہیمؑ اور خدائے یعقوبؑ کو پکارتے تھے۔ لیکن قرآن کا خدا "رب العالمین" ہے۔ دونوں جہانوں کا خدا ہے۔ یعنی ایسا خدا جو ساری کائنات کی پرورش کرتا ہے۔ اور ربوبیت عامہ میں بین الناس کوئی امتیاز روا نہیں رکھتا۔ دنیا صلح کے لئے چلا رہی ہے۔ اور صلح بہت دور ہے۔ جنگ عظیم ختم ہوگئی۔ لیکن ایک عظیم تر جنگ کی بنیاد ڈال گئی۔ خدا جانے یہ جنگ کس وقت شروع ہو جائے۔ اور دنیا کا بیڑہ غرق ہو جائے۔ لیکن اگر آپ ہمدردی کے صحیح جذبات کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور مختلف الخیال طبقات انسانی میں روح اخوت کا نظارہ دیکھنے کے متمنی ہیں۔ تو حج کے دن مکہ معظمہ جایئے۔ اور یہ روح پرور منظر معائنہ کر لیجئے۔ تمام امتیازات اور اختلافات یکقلم دور کر دیئے جاتے ہیں۔ مختلف درجات کے لوگ حاکم اور محکوم خادم اور مخدوم سب ایک ہی لباس میں ملبوس ہوتے ہیں۔ جو لوگ ایک دوسرے سے ناآشنائے محض ہوتے ہیں۔ وہ بلحاظ تفاوتِ سن ایک

دوسرے کو ماں باپ بھائی بہن یا بیٹا بیٹی ہی کہہ کر خطاب کرتے ہیں۔ ہر شخص دوسروں کی خدمت کرتا ہے اور پھر صلہ کا متمنی نہیں ہوتا۔ ہر شخص اپنا مال دوسروں کے لئے صرف کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ اور اگر اس کے مال سے دوسروں کو فائدہ پہنچ جائے۔ تو بیحد خوش ہوتا ہے خود غرضی کے جذبات ایسے موقعوں پر کارفرما ہو ہی نہیں سکتے۔ اخوتِ انسانی کا یہ منظر مکّہ معظمہ میں تقریبًا پانچ ماہ تک مسلسل جاری رہتا ہے اور اسی لئے مکّہ کو بَلَدِ الْاَمِيْن (۹۵ : ۳) کہا گیا ہے۔ افسوس کہ ہمارے زمانہ میں خود غرض لوگوں نے اس شہر کو مندرجہ بالا خوبی سے محروم کر دیا ہے اور آپس ہی میں مصروف پیکار رہتے ہیں۔ کسی زمانہ میں لوگ اس خیال سے وہاں جایا کرتے تھے۔ کہ تمام علائق دنیوی سے آزاد ہو کر یکسوئی قلب کے ساتھ اپنا وقت صرف کریں۔ لیکن اب[1] تو وہاں جانا بھی دشوار ہے۔ سوال یہ ہے۔ کہ اس خرابی کا ذمّہ دار کون ہے؟ اسلامی دنیا کی راحتِ قلبی کے اس پہلو کو کس نے حزن وملال سے مبدّل کر دیا ہے؟ یہ سوال کچھ مشکل نہیں ہے۔ علی اور ابن سعود یقینًا اس خرابی کے ذمّہ دار نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ تو وہ آلات ہیں۔ جو صورت حالات سے پیدا ہوئے ہیں۔ اور اس فساد کی ذمّہ داری یقینًا ان لوگوں کے سر ہے جو اپنی ملوکیت پرستانہ خواہشات کو پورا کرنے کے لئے مکّہ کو اپنے زیر لانا چاہتے ہیں۔ اور اسے اپنی بساط سیاست کا اک ضروری مُہرا بنانا چاہتے ہیں۔ اور حج کو اپنی غلطی کی وجہ سے سیاسی اہمیت دے رہے ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں۔ کہ جب تک مکّہ ان کے زیر اثر نہ آجائے۔ اس وقت تک ان کی جوع الارض تسکینِ کامل نہیں پاسکتی اسی لئے یہ لوگ حج کو سیاسی اجتماع سمجھتے ہیں۔ لیکن لارڈ ہیڈلے اپنی ذاتی تجربات کی بناء پر ان تمام دروغ بافیوں کا پول کھول سکتے ہیں۔ ارباب سیاست مدّتوں سے خلافت اور حج کو اپنی راہ میں سنگ گراں خیال کر رہے ہیں۔ ایک کو تو انہوں نے اپنے زعم باطل میں مٹا دیا ہے۔ دوسرے کے مٹانے کی تجاویز سوچ رہے ہیں۔

یہ خیالات عام طور پر مسلمانوں کے احساساتِ قلبی کا آئینہ ہیں۔ بعض لوگ برطانوی حکومت کو مسلم

---

[1] مصنف نے اگست ۱۹۲۵ء میں کتاب شروع کی اور اخیر اکتوبر ۱۹۲۵ء میں ختم کر دی۔ یہاں اس وقت کے عرب کا نقشہ ہے۔

حکومت خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ مسلمان برطانی رعایا کا جزو اعظم ہیں۔ اگر حکومت سمجھدار ہے۔ تو اسے مسلمانوں کے جذبات کا احترام کرنا چاہیئے۔ ہم بجا طور پر یہ توقع رکھتے ہیں۔ کہ وہ ہماری جائز تکالیف کا مداوا کریگی۔ ہم ہرگز نہیں چاہتے۔ کہ وہ مکہ کے معاملہ میں دخل انداز ہوں۔ اور ہم جانتے ہیں۔ کہ بغیر ایسی مداخلت کے جس سے کسی کے احساسات ذرہ بھر بھی مجروح ہوں۔ یہ شہر اپنی سابقہ حالت پر واپس آسکتا ہے۔

اصول عالمگیریت

آنحضرتؐ بجا طور پر مساوات عالمگیر کے بانی مبانی ہیں۔ آپؐ ہی نے سب سے پہلے دنیا کو بتایا کہ ہر مذہب ابتداءً خدا ہی کی طرف سے آیا تھا۔ ہر نبی خدا ہی کی طرف سے مبعوث ہوا تھا۔ ہر قوم اور ہر ملک میں خدا کی طرف سے بشیر و نذیر آئے۔ اور آپؐ نے دیگر مذاہب کے انبیاء کی عزت کرنی تمام مسلمانوں پر فرض کر دی۔ بروئے تعلیم قرآن مسلمان پیغمبرؐ اور دیگر انبیاء میں کوئی تفریق نہیں کر سکتے۔ آپؐ نے تعلیم دی۔ کہ تمام انبیاء خدا کی طرف سے ایک ہی مذہب لائے تھے اور ایک ہی صداقت کی تعلیم دی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ صداقت مشکوک ہوگئی۔ آیندہ نسلوں نے اس میں اپنے اپنے خیالات کی آمیزش کر دی۔ یہ وہ حقیقت ہے کہ جسے تقریبًا تمام مذاہب دیگر کے محققین نے تسلیم کرلیا۔ اس طرح وہ صداقت ملوث ہو کر رہ گئی۔ اور اختلاف بین المذاہب رونما ہوگئے۔ لیکن ابتداءً سب انبیاء ایک ہی سچائی کو خدا کی طرف سے لائے تھے۔ سب نے ایک ہی سرچشمہ سے پانی پیا تھا۔ اور اگر کائنات ایک ہی خدا کی بنائی ہوئی ہے۔ تو اس کے خلاف ہو بھی کس طرح سکتا تھا؟ کس طرح ممکن تھا کہ خدا ایک قوم کو اسباب برکت دیتا اور دیگر اقوام کو تاریکی میں چھوڑ دیتا؟ اس کی شان ربوبیت کا تقاضا ہی یہ ہونا چاہیئے۔ کہ وہ تمام لوگوں کی ربوبیت یکساں طور پر کرے۔ خصوصًا اس زمانہ میں جبکہ وسائل آمد و رفت و مخابرت محدود تھے۔ اور اس وجہ سے ایک قوم دوسرے کو کسی طرح کا فائدہ نہیں پہنچا سکتی تھی۔ کیونکہ وہ ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلک رہتی تھی۔ اسی وجہ سے ہر قوم کو جداگانہ طور پر مذہبی الہام عطا کیا گیا تھا[۱]۔

لیکن موجودہ نظام تمدن کی رو سے اقوام عالم باہم دگر قریب ہوگئی ہیں۔ تمدن اور مذاہب مختلفہ اب باہم دگر ملتے جاتے ہیں۔ لیکن ہر مذہب کے کثیر التعداد ماننے والے اپنے اصولوں پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہیں۔ کل انسانوں کا کسی ایک مسلک پر عامل ہونا بھی ممکن نہیں ہے۔ پس اندریں حالات کیا یہ بات

---

[۱] ۳ : ۸۴ - ۳۵ : ۲۴

دنیا کے لئے مفید نہ ہوگی۔ کہ تمام مذاہب کو منجانب اللہ تسلیم کر لیا جائے۔ اور قرار واقعی ان کا احترام کیا جائے۔ اس اصول کی بناء پر مفاہمت باہمی کا دروازہ کھل جائے گا۔ اور تنگ نظری کافور ہو جائے گی اور وہ تعصب مذہبی جس کی وجہ سے ایک قوم دوسری قوم کے خلاف بہت جلد مشتعل ہو جاتی ہے۔ بڑی حد تک کم ہو جائے گا۔ اور ہم فراخ دلی سے ایک دوسرے کے مذہبی نقطۂ خیال کو سمجھنے اور اس پر غور کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ صلح اور امن قائم کرنے کے لئے یہ اصول بہت ضروری ہے۔ اور اسی لئے آنحضرت ؐ نے ہم آہنگی پیدا کرنے کی غرض سے اس کی تلقین فرمائی۔ اور آج آپؐ کا یہ تلقین کردہ اصول ایک صداقت بن گیا ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی تھی۔ کہ اس اصول کو قبولِ عام کی سند دلانے کے لئے کوئی خدا کا رسول صاف الفاظ میں بیان کر دیتا پس یہ کام آپؐ نے حسبِ دلخواہ انجام دے دیا مذہب ہی اتحادِ اقوام میں بڑی حد تک معاون ہو سکتا ہے۔ اور اس کا اصلی مقصد بھی مختلف الخیال انسانی طبقات میں ہم آہنگی اور یک رنگی ہی پیدا کرنا ہونا چاہیئے۔ اور ان باتوں کی جس قدر ضرورت آج کل ہے۔ اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ پس کیا آپؐ نے دنیا کو ایک صحیح اور سچا پیغام نہیں دیا۔ اور کیا آپؐ خدا کے سچے نبی نہیں ہیں؟ یہ امر نہ بھولنا چاہیئے کہ دنیا اس پیغامِ ہم آہنگی سے ناآشنا ہی نہ تھی۔ بلکہ ہر ایک دوسرے کے مذہب کو خدا کی طرف سے نہ سمجھتا تھا۔ میرے نزدیک تو صرف یہ ایک پیغام ہی آپؐ کے دعویٰ رسالت پر مہرِ صداقت ثبت کرتا ہے:۔

معصومیتِ انبیاء

آپؐ نے اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھایا۔ اور جمیع انبیاء کو معصوم قرار دیا ان کے معترضین کے مقابلہ میں سینہ سپر ہوئے ہیں۔ ان پر جس قدر اعتراضات کئے گئے ہیں۔ سب کی تکذیب فرمائی ہے۔ ایک بڑی مصیبت یہ ہے۔ کہ لوگ دوسروں کے بزرگوں میں نقص دکھلانے سے یہ سمجھتے ہیں۔ کہ اس تنقیص سے اپنے بزرگوں کی تعظیم میں اضافہ ہوگا۔ اس معاملہ میں مسیحی علماء اور مشنری سب سے آگے ہیں وہ تو اپنے مقبولہ انبیاء پر بھی اعتراض کرنے سے باز نہیں آتے اور میں ان کی ذہنیت کا اندازہ کرنے سے قطعاً قاصر ہوں۔ ایک طرف تو وہ بہت سے بزرگانِ یہود کو نبی تسلیم کرتے ہیں۔ دوسری طرف ان کے عیوب اور بدکاریوں کو مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ یعنی جو لوگ بقول بائیبل خداوند کی راہوں پر چلتے تھے۔ ان کے اعتراضات کا نشانہ بنتے ہیں۔ اب ان مشنریوں کے

خدا کے متعلق کیا خیال کیا جائے۔ جس نے ایسے ناپاک لوگوں کو نبوت کے لئے منتخب کیا۔ اور ان کو ہمارے لئے نمونہ بنا کر بھیجا، لیکن ان "بدنام کنندگان جماعتِ انبیاء" کی نیت صاف ظاہر ہے۔ ان کی رائے ناقص میں، ابن مریم کی الوہیت قائم کرنے کے لئے دوسروں کی تردید و تکذیب و توہین نہایت ضروری تھی۔ خدا کی محبت کے اس عجیب پہلو (کہ اس نے دنیا کو اس قدر پیار کیا کہ اہلِ دنیا کے بچانے کے لئے اپنے اکلوتے بیٹے کا خون بہا دیا) کے اظہار کی اشاعت کے لئے پاک خدا کے ان بدنام کرنے والوں نے کسی نبی کو اپنی تفنگِ زبان سے داغی کئے بغیر نہ چھوڑا۔

لیکن نبیٔ آخر زمان تمام انبیاء کی عصمت کو دوبارہ دنیا میں قائم کرنے کے لئے مبعوث ہوئے۔ آپؐ نے اعلان کر دیا۔ کہ جملہ انبیاء راستباز اور معصوم تھے۔ پھر آپؐ نے فرداً فرداً خصوصاً ان کی تعریف فرمائی۔ جن پر ناپاک حملے وارد ہو چکے تھے۔ جن کی بناء پر جملہ اعتراضات ہباءً منثورا ہو گئے۔ اگرچہ بائیبل میں ابراہیمؑ اور یوسفؑ پر دروغگوئی کا الزام لگایا گیا تھا۔ لیکن آپؐ نے ان کو صدیق کہا۔ لوطؑ کے چال چلن پر دھبہ لگایا گیا تھا۔ لیکن آپؐ نے ان کی پاکی کا اعلان کیا۔ اور یسوع پر جس قدر آپؐ کا احسان ہے۔ وہ تو بیان سے باہر ہے۔ یہود کی رائے میں ان کی پیدائش کے متعلق جس قدر الزامات تھے۔ سب کو یکقلم دور کر دیا۔ وہ تو استثناء ۲۳: ۲ کی رو سے یسوع کے دعویٰ کا ابطال کرتے تھے۔ لیکن قرآن نے انکو "روحٌ منہ"[1] کا لقب دیا۔ ان کی والدہ مطہرہ کو صدیقہؓ کے نام سے موسوم کیا۔ اور ان دونوں کو مسّ شیطان سے مبرّا بیان کیا۔ اس طرح ان کا واقعۂ ولادت اور ان کی ماں کا چال چلن الزامات سے بری ہو گیا۔ خدا کی شان ہے۔ کہ نبی کریمؐ نے ان مقدسین کی صفائی میں جو الفاظ استعمال فرمائے وہ ان پادریوں کے نزدیک مسیحؑ کی الوہیت کا موجب بن گئے۔

کامل مذہبی رواداری

آپؐ نے سب سے پہلے دنیا میں یہ اصول قائم کیا۔ کہ دین کے معاملات میں کسی پر جبر نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس پر عمل کر کے بھی دکھا دیا۔ مذہبی معاملات میں اختلافاتِ آراء کا احترام کیا گیا۔ اور آزادیٔ ضمیر کی توسیع و اشاعت کی گئی۔ انفرادی رائے کا ہر شخص کو حق دیا گیا۔ اور آپؐ نے فرمایا۔ کہ ہر شخص اپنے معتقداتِ مذہبی کا خود خدا کے سامنے جوابدہ ہوگا۔

---

[1] (۴: ۱۷۱)

یہ معاملہ بندہ اور خدا کے درمیان منحصر ہے۔ مسیحیت نے تو مذہبی جور و تعدّی کے بدترین نمونے پیش کئے اختلاف رائے سے خون کے دریا بہا دیئے۔ اس لئے اس معاملہ میں اصلاح کی ضرورت تھی۔ اور آپؐ نے اس کمی کو پورا فرما دیا۔ تاریخ اسلام میں کسی گلیلیو اور کسی لیتھیر کے ستائے جانے کا تذکرہ نہیں مل سکتا۔ بدعت کی مذمت ضرور کی گئی ہے۔ لیکن کسی فرقہ یا جماعت مبتدعین کو زندہ آگ میں نہیں ڈالا گیا۔ اگر **ڈین انجی** اب سے چند صدی پہلے پیدا ہوئے ہوتے۔ تو یقیناً الحاد کے الزام میں ان کو بھی زندہ در آتش کر دیا گیا ہوتا۔ لیکن نبی کریمؐ فرماتے ہیں۔ کہ کسی شخص کو دوسرے کی مذہبی زندگی میں دخل دینے کا حق حاصل نہیں ہے۔ اور نہ کوئی کسی کو ضمیر کی آزادی کی بناء پر مستوجب سزا قرار دے سکتا ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے۔ کہ کسی شخص کو غلط عقاید کی وجہ سے اس دنیا میں کوئی سزا نہیں دی جا سکتی۔ یہ بات آخرت پر موقوف ہے۔ اس زندگی میں تو صرف اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔ عقاید کا معاملہ آخرت میں طے ہوگا۔ اس طرح آپؐ نے ایسی مذہبی رواداری کا اصول قائم فرمایا۔ جس کی نظیر ماقبل اسلام میں نہیں مل سکتی۔ اور آج بھی اگر ان معاملات میں کلیسا، کی رائے کو وقت دی جائے۔ مثلاً عقیدۂ اتھانیسی اس تو یہ رواداری آج بھی اصلی مسیحی اسپرٹ کے خلاف اور اس کے متقل ہے۔ آپؐ نے اصولِ رواداری پر عمل کر کے بھی دکھا دیا۔ جس طرح آپؐ نے مسلمانوں کے نفوس اور اموال کی حفاظت کی اسی طرح غیر مسلموں کے۔ اور ان کو اپنے عقاید پر قائم رہنے کی کامل آزادی تھی۔ عیسائیوں کو بھی آپؐ نے بڑی مراعات عطا فرمائیں۔ سیّد امیر علی لکھتے ہیں:

"دنیا میں مسلمانوں سے بڑھ کر کسی مذہبی جماعت فاتحین نے غیر مذاہب کو مراعات عطا نہیں کیں۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے نجران کے نصاریٰ کو مندرجہ ذیل دستاویز عنایت فرمائی تھی۔" نجران اور اس کے قرب جوار کے عیسائیوں کو خدا تعالیٰ کی حفاظت اور اس کے رسولؐ کی نیک نیتی کا وعدہ بہ این الفاظ دیا جاتا ہے کہ ان کے نفوس اموال اور عقاید سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائے گا۔ اور ان کے مذہبی مراسم میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے گی۔ اور ان کے حقوق اور مراعات میں کمی نہ کی جائے گی۔ کسی اُسقف یا راہب کو اس کی جائے مقررہ سے برطرف نہ کیا جائے گا۔ اور ان کی پوزیشن اور عزت برقرار رہے گی۔ کوئی صورت یا صلیب نہ توڑی جائے گی۔ نہ ان پر کوئی دوسرا ظلم کرے گا۔ اور نہ وہ کسی پر ظلم کر سکیں گے۔ ایام جاہلیت کا طریق قصاص موقوف کیا جاتا ہے۔ ان سے عُشر نہ لیا جائے گا۔ نہ ان کو سامان رسد مہیا کرنا پڑے گا۔"

مجوسیوں کو بھی اسی طرح کا اقرار نامہ عطا کیا گیا۔ آپؐ نے ان کے پیرِ مغاں فرخ ابن شخصان کو جو خط لکھا تھا۔ اس کے چند فقرے اس جگہ نقل کرتا ہوں۔ محمد رسول اللہ کی طرف سے سلمان فارسی کے بھائی فرخ ابن شخصان اور اس کے عیال کو یہ دستاویز ہمیشہ فائدہ اٹھانے کی غرض سے دی جاتی ہے۔ خواہ اس کی اولاد اسلام لائے یا مذہب اجداد پر قائم رہے۔ یہ دستاویز اس بات کی ضمانت ہے کہ اسکو اور اس کی اولاد کو خدا کی حفاظت میں رکھا جائے گا۔ اور ان کے اموال و املاک کی حفاظت کی جائے گی خواہ کوہی ہوں یا میدانی۔ ان کو چراگاہوں اور کنوؤں کے استعمال کی اجازت ہوگی۔ ان پر کسی قسم کا ظلم روا نہ رکھا جائے گا۔ اور جس مسلمان کی نظر سے یہ خط گزرے۔ اس پر مجوسیوں کی حفاظت فرض ہے۔ اُسے لازم ہے۔ کہ دوسروں کو ان پر ظلم کرنے کا موقعہ نہ دے۔ اور نہ ان کو زبان یا ہاتھ سے آزار پہنچائے۔ وہ اپنے معابد اور املاک پر بدستور قابض رہیں گے۔ قیمتی ملبوسات کے استعمال کی آزادی ہوگی۔ مکانات کی تعمیر اور رسوم مذہبی کی ادائیگی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کی جائے گی۔ اور تمام غیر مسلموں سے بڑھ کر ان کے ساتھ حسن سلوک روا رکھا جائے گا۔

اسلام میں مسلم اور ذمی (اسلامی حکومت کے تحت جو غیر مسلم رعایا) دونوں شریعت کی نگاہ میں یکساں ہیں۔ حضرت علیؓ نے کہا ہے۔ کہ "ذمی کا خون مسلمان کے خون سے کم نہیں"۔ رواداری کی یہ روح اسلامی حکومت کے عروج میں ہر جگہ جلوہ فرما تھی۔ خلیفہ اوّل کے زمانہ میں خالد ابن ولید نے جو اُن کے سپہ سالار تھے۔ ایک اعلان شائع کیا۔ جس کی رو سے تمام نصاریٰ کے نفوس اور املاک کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اور یہ کہ ان لوگوں کو تہواروں کے زمانہ میں صلیبیں نکالنے اور ناقوس بجانے کی اجازت ہوگی۔ خلیفۂ وقت نے بھی اس اعلان پر اپنی مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔ فتح مصر کے بعد حضرت فاروقِ اعظمؓ نے ان املاک کو بہ احتیاط برقرار رکھا جو معابد سے متعلق تھیں۔ اور نصاریٰ کے مذہبی علماء کو جو وظائف دیئے جاتے تھے۔ وہ بھی برقرار رکھے۔ خلیفۂ سوم کے زمانہ میں اُسقف مرو نے جو خط اُسقفِ فارس کو بھیجا تھا۔ اس میں اسلامی رواداری کی روح پر بعید اظہار تشکر و امتنان کیا تھا۔ خلیفۂ چہارم نے بھی ایران کے ایک مجوسی معبد کے سردار کو دستاویز لکھ کر بھیجی تھی۔ جس کا مضمون یہ ہے:۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط۔ امیر المومنین علی ابن ابی طالب کی طرف سے بہرام ابن

نژاد اس مجوسی کو یہ دستاویز عطا کی جاتی ہے۔ جو اپنی جماعت کا مسلمہ پیشوا ہے۔ نیز اس کا اثر اس کی اولاد اور احفاد میں بھی باقی رہے گا۔ میں تمہارے نفوس، املاک، ازواج اور احفاد کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں۔ خدا اور اس کے رسولؐ کی طرف سے بھی حفاظت جان و مال کا وعدہ کرتا ہوں۔ میں نے ان مسلمانوں کو بھی جو سرحدوں پر جہاد فی سبیل اللہ میں مصروف ہیں۔ اسی قسم کا فرمان بھیج دیا ہے۔ کہ وہ تمام مجوسیوں کی حفاظت کریں۔ اور ان کے ساتھ مہربانی کا سلوک کریں۔ اور کسی کو ان پر ظلم نہ کرنے دیں۔ جو ٹیکس تم سے وصول کیا جاتا تھا۔ اسے منسوخ کرتا ہوں۔ اور تمہارے مویشی بھی کلیتہً آزاد کئے گئے۔ اب ان میں سے کوئی جانور وصول نہ کیا جائے گا۔ تم لوگ اپنے معابد اور ان سے متعلق جائداد کے خود مختار ہو۔ اور تم کو مالکانہ تصرف کا حق دیا جاتا ہے۔ اور تم میں جو یہ رسم ہے۔ کہ ہر مجوسی ایک درہم سالانہ اپنے گاؤں کے مذہبی پیشوا کی نذر کرے۔ اس کو بھی برقرار رکھا جائے گا۔ چونکہ میں نے آنحضرتؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے۔ کہ جو لوگ مختلف العقاید والدین کی اولاد ہیں۔ وہ میراث کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ اس لئے اس قسم کے لوگوں کی جائدادیں میرے حکم سے مذہبی پیشواؤں کو ملیں گی۔ میں نے یہ باتیں تمہیں اس وقت لکھیں جبکہ مجھے تمہارے مرتبہ اور وجاہت دینی سے پوری واقفیت ہو گئی۔ اور یہ بھی تحقیق ہوا۔ کہ تمہارے اس مرتبہ پر قائم رہنے سے تمہاری قوم کا بھلا ہو گا۔ اور یہ کہ تم اپنی قوم کے بہی خواہ اور مشیر کار ہو۔ اور تمام مسلمین اور مسلمات پر فرض ہے۔ کہ وہ تمہاری اور تمہارے ہم قوموں کی حفاظت کریں۔ اور تمہاری رسوم مروجہ کو برقرار رکھیں۔ اور تمہارے اوپر کسی قسم کی قیود عاید نہ کریں۔ تمہارے عیوب سے چشم پوشی کریں۔ اور تمہارے بڑوں کے ساتھ حسن سلوک روا رکھیں۔ اور تم سے کبھی کسی قسم کا تاوان طلب نہ کریں۔ اور تمہیں تبدیل مذہب پر مجبور نہ کریں۔ کیونکہ قرآن مجید فرماتا ہے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ	"دین میں کوئی زبردستی (منوانا) نہیں
قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ	ہدایت (کی راہ) گمراہی سے واضح ہو چکی
الْغَيِّ (البقرہ) ۲: ۲۵۶	ہے"

آنحضرتؐ کے زمانۂ مبارکہ میں بعض مسیحی علماء مذہبی گفتگو کے لئے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپؐ نے از راہ مہمان نوازی ان لوگوں کو مسجد نبوی کے متصل مکانات میں ٹھہرایا۔ اور جب اتوار کا

دن آیا۔ جس دن عیسائی عبادت کرتے ہیں۔ تو انہیں گرجا کی تلاش ہوئی۔ ایک مسلمان کو عبادت کے لیے مسجد کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ساری زمین اس کے لیئے پاک کر دی گئی ہے۔ وہ جہاں چاہے نماز پڑھ سکتا ہے۔ لیکن بیچارے پادری مشکل میں پھنس گئے کہ عبادت کرنے کہاں جائیں۔ اس موقعہ پر آپؐ نے ان کی مشکل کو اپنی مسجد ان کی عبادت کے لیئے پیش کر کے دور فرمادیا۔ اسی رواداری کی وجہ سے اسلام میں مذہبی دل آزاری کا نشان نہیں ملتا۔ خیال فرمائیے نبی کریمؐ نے کس قدر کشادہ دلی کا ثبوت دیا! وہ مسجد جس میں خدائے واحد صَمَدٌ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ کی عبادت ہوتی تھی۔ اسے ان لوگوں کو استعمال کے لیئے دیدیا۔ جو یہ عقیدہ رکھتے تھے۔ کہ خدا کے اولاد بھی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر منگانانے حال ہی میں ایک چارٹر کا پتہ لگایا ہے۔ جو مکتفی ثانی خلیفہ بغداد نے نسطوری کلیسیاء کے عمائدین کو عطا کیا تھا۔ اس میں یہ بھی تحریر تھا" تمہارے ہم مشربوں کے جان و مال کی حفاظت کی جائے گی۔ اور تمہاری اجتماعی بہبودی کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جائے گا۔ تمہارے گرجوں کا احترام کیا جائے گا۔ اور طریق تدفین میں مداخلت نہ کی جائے گی۔ اور یہ تمام مراعات خلفائے راشدین کی تقلید میں عطا کی جاتی ہیں"

علاوہ بریں ان کے مذہبی مناقشات اور شرعی معاملات میں خلیفہ مذکور ازراہِ کرم ثالث بالخیر بننا گوارا کرلیتا تھا۔ اور اسی لیئے تاکہ حق بحقدار رسد، اور کسی پر ظلم نہ ہونے پائے۔ اور گمراہ کو راہِ راست مل جائے۔ نیز ان کے مذہبی امور کی بھی نگرانی کی جاتی تھی۔ اور ان کے جذبات مذہبی کا پورا احترام رکھا جاتا تھا۔

اس ضمن میں ڈاکٹر منگانا رقمطراز ہے۔ "اس بات کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی جاتی رہی ہے۔ کہ جس زمانہ میں اسلام کو لکھو کہا عیسائی رعایا کی جان و مال کا اختیار حاصل تھا۔ اس وقت اسلام اور مسیحیت کے دفتری تعلقات پر روشنی ڈالنے والی کوئی مستند دستاویز ہاتھ آجائے۔ ممکن ہے۔ اکا دکا عیسائی کسی مسلمان کے ظلم کا نشانہ بن گیا ہو۔ لیکن اس قسم کی نظیر اسلامی قانون سے خلاف ورزی سمجھی جائے گی۔ کیونکہ اسلام کا دفتری رجحان، تو دستاویز زیر نظر میں بوضاحت تمام بیان کر دیا گیا ہے۔ اور اس سے بیشک یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ کہ مسیحیت آزاری کے داغ سے اسلام کا دامن داغدار نہیں ہے۔ یہ چارٹر ایک عباسی خلیفہ کے دربار سے جاری ہوا تھا۔ جسے کئی سو سال گزر گئے۔ کیا اس بیسویں صدی

عیسوی میں کوئی یورو پین حاکم مثلاً شاہِ انگلستان ۔ ملکۂ ہالینڈ یا صدر جمہوریہ فرانس اس سے بڑھ کر رواداری کا مظاہرہ کر سکتا ہے ؟ یہ فرمان بارھویں صدی میں لکھا گیا تھا۔ لیکن اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ۔ ہم نے اس قسم کی تحریر کا حکم خلفائے راشدین اور خلفائے عباسیہ کے نقوش قدم پر چل کر دیا ہے ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آغازِ اسلام سے اس وقت تک سارے خلفاء عیسائیوں کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کرتے چلے آئے ہیں۔ اور اس کا ثبوت نسطوری اسقف اشوع یہب ثالث (۶۵۰-۶۶۰ء) کی تحریر کے اس قابل یادگار فقرہ سے ملتا ہے۔ اہلِ عرب جن کو اس وقت خدا نے دنیا کی حکومت عطا فرمائی ہے ۔ عیسائی مذہب اور اہلِ مذہب دونوں کو کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچاتے ۔ بلکہ وہ ان پر کرم کرتے ہیں ۔ اور عیسائی علماء کا احترام کرتے ہیں۔ اور گرجوں کی امداد کرتے ہیں۔"

اسی طرح ہندوستان میں بھی مسلمان بادشاہوں نے ہندو منادر کی نگہداشت کے لئے جائدادیں اور املاک عطا کیں۔ اور ریاست حیدرآباد (دکن) میں آج بھی ہنود نصاریٰ اور مجوسیوں کو مالی امداد دی جاتی ہے ۔ ریاست بھوپال میں بھی یہی ہوتا ہے۔ بقول سید امیر علی مرحوم آج بھی یورپ میں بہت سی حکومتیں ایسی ہیں ۔ جن کو اس معاملہ میں اسلامی اصول حکومت کو اپنے واسطے نمونہ بنانا چاہیئے ۔

یوں ہمارے مخالفین جو چاہیں کہیں اور جتنی چاہیں مخالفت کریں۔ لیکن تاریخی واقعات کا انکار ان کی طاقت سے باہر ہے ۔ ریاستہائے بلقان کا وجود ہی اس الزام کی تردید ہے ۔ کہ اسلامی حکومت کا طریق عمل یہ رہا ہے ۔ کہ ایک ہاتھ میں قرآن دوسرے میں تلوار۔ ان جماعتوں کے زندہ سلامت باقی رہنے سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے ۔ کہ اسلامی حکومتوں میں غیر مسلموں کی جان اور مال دونوں محفوظ ہیں۔ ہندوستان کی مثال لے لیجئے۔ یہاں پر قریب ایک ہزار سال تک زبردست اسلامی حکومت قائم رہی۔ لیکن تیس کروڑ باشندوں میں سے دو تہائی سے زیادہ اب بھی غیر مسلم ہیں۔ اور یہ سات آٹھ کروڑ مسلمان زیادہ تر ان مغلوں، پٹھانوں بلوچیوں، عربوں، اور سیدوں کی اولاد ہیں۔ جو یہاں آکر سکونت پذیر ہو گئے تھے ۔ یہ تاریخی واقعات ہیں۔ اور ان کے ہوتے ہوئے اس دعوے کے ثبوت کے لئے کسی دوسری شہادت کی ضرورت نہیں ہے ۔ کہ جس ملک میں بھی مسلمانوں نے حکومت کی ۔ وہاں "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو" کے اصول پر عمل کیا ہے ۔ آج عام طور پر تہذیب اور وسعت قلبی کا زمانہ ہے ۔ اور اس لئے ہم لوگ رواداری

کو محمود جانتے ہیں۔ لیکن آنحضرت تو اس زمانہ میں اس پر عمل فرمایا۔ جبکہ مذہبی دل آزاری یا ضمیر کی خاطر دوسروں کو ستانا۔ یہ باتیں حقائق مذہب یقین کی جاتی تھیں۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ انبیائے یہود کا اسوہ پیش نظر تھا۔ اور دیگر انبیاء نے اس معاملہ میں خاموشی اختیار کی ہوئی تھی۔ لیکن اگر مذہبی رواداری انسانیت کے لئے موزوں مذہب کا ایک جزو لازمی ہے۔ تو یقیناً یہ بات بھی آپ کے عدیم المثال ہادی مذہب ہونے پر اک دلیل ہے۔

تلوار کا صحیح استعمال

نبی کریم ہی پہلے معلم ہیں۔ جنہوں نے دنیا کو تلوار کا صحیح استعمال بتایا۔ دینی اور دنیوی دونوں تاریخیں یہی بتاتی ہیں۔ کہ تلوار انسان کے لئے ناگزیر ہے ہنود اور یہود دونوں کے بزرگوں نے اسے استعمال کیا ہے۔ کیونکہ ہنود اور یہود دونوں کی شرائع میں صلح اور امن پر زیادہ زور نہیں دیا گیا ہے۔ "صلح کے شہزادہ" نے بھی یہی کہا۔ کہ "میں امن قائم کرنے نہیں آیا بلکہ تلوار چلانے" وہ شریعت اور انبیاء کے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس کے مذہب کے قوانین اس بات کی اجازت دیتے ہیں۔ اور خود اس مذہب کے انبیاء نے تلوار چلائی۔ اور اگر موافق حالات اسے نصیب ہو جاتے۔ تو وہ خود بھی تلوار چلاتا۔ لیکن افسوس کہ نہ ہوئے۔ اور اگر اس نے پطرس کو تلوار چلانے سے باز رکھا۔ تو محض اس لئے کہ اس کا وقت بگڑا ہوا تھا۔ اور اس موقعہ پر کوئی فائدہ مرتب نہ ہوتا۔ ہاں جو کام اس سے نہ ہو سکا۔ وہ اس کے پیروؤں نے بوجوہ احسن انجام دیا۔ اس کے الفاظ بھی غضب کے سچے ثابت ہوئے۔ آج سے پہلے تو مسیحیین نے ایک دوسرے کے گلے کاٹنے میں تلوار اور آگ کو بدرجۂ اتم استعمال کیا۔ لیکن آج مسیحی یورپ کی دولت اور حکومت اور لیاقت کا ایک بہت بڑا حصہ اسی بات میں صرف ہو رہا ہے۔ کہ دنیا میں تلوار چلانے اور مصائب پھیلانے کے مؤثر ترین ذرائع دریافت کئے جائیں۔ اور یہ خواہش شمشیر زنی کسی مستحسن مقصد کے لئے نہیں بلکہ محض ملوکانہ اقتدار کی توسیع کے لئے۔

میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں۔ کہ بعض اوقات تلوار چلانا۔ اعلےٰ ترین فرائض انسانی میں داخل ہو جاتا ہے۔ جس وقت مذہبی آزادی معرض خطر میں ہو یا کسی مظلوم جماعت کی حق تلفی ہو رہی ہو۔ تو ہم اس وقت بے تعلق تماشائیوں کی طرح نہیں کھڑے ہو سکتے۔ انسانی زندگی میں بعض اوقات ایسی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جب تلوار کا استعمال لازمۂ حیات بن جاتا ہے۔ لیکن چونکہ اس کو غلط طریق پر بھی استعمال کیا گیا ہے

اس لئے خدا کے نبی کا یہ بھی اک ضروری کام تھا۔ کہ لوگوں کو اس کا صحیح طریق استعمال بتادے۔

یسوع صاحب تو تلوار چلانے کے لئے آمادہ ہی تھے۔ لیکن آنحضرتؐ کو مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔ آپؐ نے مفصلہ ذیل تین صورتوں میں تلوار چلانے کی اجازت دی ہے۔

(۱) خدا تعالےٰ کی عبادت گاہوں کو بچانے کے لئے خواہ وہ عیسائیوں کی ہوں یا یہود کی۔ ہنود کی ہوں یا مسلمانوں کی (الحج ۲۲ : ۴۰)

(۲) ضمیر کی آزادی قائم کرنے کے لئے۔ قرآنی تعلیمات کی رُو سے ہر شخص کو اپنا مذہب اختیار کرنے کی آزادی ہے۔ اور کسی کو اپنا عقیدہ دوسرے سے بزور شمشیر منوانے کی اجازت نہیں ہے۔ اور اگر کوئی شخص ایسا کرے۔ تو مسلمانوں پر اس سے جنگ کرنا فرض ہے۔ خواہ اس فعل کا مرتکب مسلمان ہی کیوں نہ ہو (البقرہ ۲ : ۱۹۰-۱۹۳)

(۳) حفاظت ذاتِ خویش کے لئے (الحج ۲۲ : ۳۹)

لیکن اگر ظالم صلح کے لئے خواہش ظاہر کرے۔ تو فوراً جنگ بند کر دی جائے (البقرہ ۲ : ۱۹۳)

دنیا کے دوسرے انبیا اور خصوصاً انبیاء یہود نے بعض اوقات حالت اشتباہ میں بھی تلوار چلائی لیکن آنحضرتؐ نے ہمیشہ حق و صداقت ہی کی خاطر ایسا کیا۔ لیکن مغربی لوگوں کے خیالات اسلام کی طرف سے اس قدر خراب ہوگئے ہیں۔ کہ وہ کسی کی بات سننا پسند ہی نہیں کرتے۔ ہر سہ امور بالا پر غور کیا جائے۔ کیا ان کے ہونے پر تلوار کا استعمال ضروریات زندگی سے نہیں؟ دنیا اس تعلیم کی محتاج تھی۔ جس احتیاج کو آنحضرتؐ نے پورا کیا۔

مساوات بین الناس و رفعتِ درجۂ نسواں

خالص توحید باری تعالےٰ پر اعتقاد رکھنے سے دو صداقتیں دنیا میں قائم ہوئیں۔

(۱) مساوات بین الناس اور (۲) افضلیت انسان بر جمیع مخلوقات۔ پہلی کی بناء پر جمہوریت کے اصولوں کی ابتداء ہوئی۔ اور دوسری کی بناء پر سائنٹیفک تحقیقات کو تحریک ہوئی۔ اسلام میں جمہوری روح کا وجود ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ لیکن اس جگہ میں ان برکات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ جو نبی کریمؐ کی معرفت عورتوں پر نازل ہوئیں۔

اسلام سے پہلے عورتوں کے ساتھ چوپایوں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔ اور کسی مذہب یا تہذیب نے اُسے

پیدائشی حقوق عطا نہیں کئے تھے۔ ایک طرح کی مجسمہ بدی خیال کی جاتی تھی۔ لیکن ایسی بدی جو انسان کے لئے ناگزیر تھی۔ مسیحیت کے ہاتھوں صنف لطیف کی تذلیل و توہین حد کمال کو پہنچ گئی تھی۔ کتاب پیدائش کے فسانہ سے جس میں عورت نے مرد کو ترغیب گناہ دی۔ اور کلیسیائی عقیدہ کے بنیادی اصول کی وجہ سے جو اس فسانہ پر قائم ہوئے۔ اس کی عزت کو بیحد نقصان پہنچا۔

عورت کے مرتبہ کے لحاظ سے اسلام اور مسیحیت میں بُعد المشرقین ہے۔ اگر اسلام نے عورت کو مرد کے برابر درجہ دیا ہے۔ تو مسیحیت نے اس وقت جبکہ وہ رومی تہذیب کے زیر سایہ ترقی کر رہی تھی۔ اسے پھر پستی کے غار میں دھکیل دیا تھا۔ رومی تہذیب نے عورت کو بلند کرنے کی کوشش شروع کی تھی۔ کہ مسیحیت کا طوفان سلطنت رومہ پر بادل کی طرح چھا گیا۔ اور بیچاری عورت اس کی گرد میں غائب ہو گئی۔ جو لوگ عیسائی پادریوں کی زبان سے کچھ اور ہی روایات سن چکے ہیں۔ ان کو اس واقعہ کی صحت پر کسی قدر مشکل سے یقین تو آجائے گا۔ لیکن اگر یسوع صاحب نے خود عورت کی بہبودی کے لئے کچھ نہ کیا۔ اگر ان شاگردوں نے ان کی حالت زار پر توجہ نہ کی۔ حالانکہ ان کے متعلق یہ خیال ہے۔ کہ وہ لوگ روح قدس سے معمور تھے۔ اگر مسیحی حکومتوں نے تا ایندم طبقۂ نسوان کے ساتھ کوئی انصاف نہیں کیا۔ حتےٰ کہ خود خواتین نے اپنی آزادی کے لئے جدوجہد شروع کی۔ تو کوئی پادری کس طرح اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ مسیحیت نے عورت کو کسی قسم کی عزت بخشی؟

یہودی شریعت نے عورت پر کوئی لطف و کرم روا نہیں رکھا۔ کتاب پیدائش کے اس الٰہی حکم نے کہ "تیری مرضی خاوند کے ماتحت ہوگی۔ اور وہ تیرے اوپر حکومت کرے گا۔" عورت کو ایک طرح سے ظرفِ خانگی کے درجہ پر پہنچا دیا۔ چنانچہ یہودی جماعت میں اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہ تھی۔ بالمقابل جناب مسیح حسب اعلانِ خود شریعت موسوی کی تخریب کے لئے نہیں آئے تھے۔ بلکہ تکمیل کے لئے۔ اور جب کبھی شریعت میں ان کو کوئی عیب نظر پڑا تو فوراً انہوں نے اس کا اعلان کر دیا۔ اور حتےٰ الوسع اصلاح کر دی۔ لیکن عورت کی حالتِ زار کی اصلاح کا خیال کبھی ان کے دل میں پیدا نہیں ہوا۔ حالانکہ ان کی قوم کا طرزِ عمل عورت کے لئے بیحد مضرت رساں تھا۔ لیکن انہوں نے ان خیالات کی اصلاح کی طرف توجہ نہ فرمائی۔

اگر مسیحیت نے خدائے مصلوب اور منجیٔ مصلوب و ندبوح کا عقیدہ قدیمی بت پرستوں سے مستعار لیا۔ اور اگر یسوع کی زندگی میں اس افسوس ناک واقعہ کی وجہ سے اس عقیدہ کو فروغ حاصل ہو گیا۔ تو پیدائش

کے فسانۂ گناہِ آدم نے ان دونوں کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ باہم ملا دیا۔ اس کی وجہ سے ہبوطِ آدم کا فسانہ شہرت پذیر ہو کر نسلِ انسانی کے ہبوط کا سبب بنا۔ یہ وہ عقیدہ یا نظریہ ہے۔ جو جدید تحقیقات کی رو سے یہودیوں کو مطلق معلوم نہ تھا۔ بلکہ پولوسی لٹریچر کے مصنفین کی قوتِ ایجاد کا رہین منت ہے۔ تاکہ بت پرستوں کے اس عقیدہ کو تقویت پہنچائی جائے۔ کہ انسان کی نجات خدا کے خون سے ہوتی ہے۔ اور اس طرح عیسویت ان میں ہر دلعزیز ہو جائے۔ یہ مقصد تو بہر حال پورا ہو گیا۔ لیکن اس سے عورت کو کوئی فائدہ نہ پہنچ سکا۔ بلکہ انسانی تخریب کا سارا الزام اس کے سر تھوپ دیا گیا۔ بقول پالوس "آدم نہیں بہکا بلکہ عورت بہک گئی۔ اس لئے مجرمہ قرار پائی"۔ پس ان لوگوں کی نظروں میں جو اس قسم کے فقرات کو وحی آسمانی تصور کرتے تھے۔ اور ہبوطِ آدم کو اک حقیقت ثابتہ یقین کرتے تھے۔ عورت کس طرح لائقِ احترام قرار پا سکتی تھی؟ یہی باعث ہے کہ مشائخ کلیسیاء اور عمائدین ملت عیسوی عورت کو موردِ ظلم وستم بناتے رہے۔ اور اس فعل میں وہ محض پولوس کا اتباع کرتے تھے۔ اور بات بھی سچ ہے۔ کیونکہ عورت کو اس قدر ذلیل سمجھنا مروجہ عقاید عیسوی کا لازمی نتیجہ ہے۔ جس سے مفر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ٹرٹولین کے قول سے اس پر شہادت مل سکتی ہے۔ وہ کہتا ہے "عورتو! کیا تم جانتی ہو کہ تم کون ہو؟ تم حوا کی جانشین ہو۔ اور تمہاری ہر بہن بلحاظ خصلت حوا ہی ہے۔ حوا کا جرم تم میں بھی موجود ہے۔ اور تم شیطان کا دروازہ ہو۔ تم شریعت الٰہی سے روگردانی کرنے والوں کی پیشوا ہو۔ تم نے خدا کی صورت کو برباد کر دیا۔ اور درختِ حیات کا راز فاش کر دیا"

موجودہ مسیحی متکلمین اگرچہ ٹرٹولین کے الفاظ میں زمانہ وسطیٰ کی وحشت اور بیحیائی کا رنگ ضرور پاتے ہیں۔ لیکن وہ اس امر سے انکار نہیں کر سکتے کہ اس "مقدس باپ" کے خیالات خود ساختہ نہیں ہیں بلکہ مسیحی عقاید کا منطقی نتیجہ صریح ہیں۔ اگر گناہ موروثی ہے۔ اور اس کی پاداش عذاب دائمی ہے۔ تو یہ مصیبت عورت ہی کی ڈالی ہوئی ہے۔ اسی نے انسانی مصائب کا دروازہ کھولا تھا۔ وہ "شیطان کا آلۂ کار" ہے۔ اور "ایسا بچھو ہے۔ جو ہر وقت ڈنک مارنے کے لئے تیار ہے"۔ بلکہ "زہریلی ناگن" ہے۔ اور "اژدہے کا غصہ" ہے۔

یہ وہ خطابات ہیں۔ جو مشائخ الکلیسیاء مثلاً سینٹ برنارڈ۔ سینٹ انتھونی۔ سینٹ جیروم پولوس اور سینٹ سایپرین وغیرہم نے عورت کو عطا فرمائے ہیں۔ حضرت پولوس میری رائے میں اس

عزت افزائی کے اصلی اور حقیقی محرک ہیں۔ چونکہ ہائی پریسٹ کی بیٹی نے ایک وقت پولوس کی درخواست رد کر دی تھی۔ اس لئے گمان یہی گزرتا ہے۔ کہ عورت کو اس طرح ذلیل کرنے میں اس کے جذباتِ نفسانی اور خواہشات ذاتی کارفرما ہوئے۔ بہرحال کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اگر یسوع کا مذہب وہ مذہب ہے۔ جس میں موروثی گناہ کا عقیدہ جزوِ اعظم ہے۔ تو پھر کفارہ اور الوہیت یسوع کا عقیدہ اس کا نتیجہ صریح ہے۔ اور عورت کے حق میں جو کچھ ان بزرگوں نے ارشاد فرمایا ہے۔ وہ سب بجا اور درست ہے۔ تہذیب جدید اس عقیدہ کو پسند نہ کرے۔ لیکن عورت کی نجات اسی میں ہے۔ کہ اس عقیدہ کی غلطی کو عالم آشکارا کیا جائے۔ پس کیا آنحضرت صلعم طبقۂ اناث کے حق میں "رحمتِ کبریٰ" نہیں ہیں۔ جنہوں نے اس قسم کے جملہ غلط خیالات کی تردید فرمائی۔ اور "فطری گناہ" سے بیزاری ظاہر فرمائی۔ آپؐ نے اعلان فرمادیا کہ "ہر مولود معصوم ہوتا ہے"۔ اور واقعہ ترغیب آدم میں حوا مغویہ نہ تھی۔ بلکہ آدم اور حوا دونوں ہی دھوکہ کھا گئے۔ یعنی شیطان کے فریب میں آ گئے۔

جس وقت کلیسیاء اس بری طرح عورت کی تذلیل کر رہی تھی۔ اور دیگر مذاہب بھی اس کی طرف سے آنکھ پھیرے ہوئے تھے۔ آنحضرت صلعم نے آکر اسے ہمیشہ کے لئے بچا لیا۔ اور اسے اس قدر بلند مرتبہ عنایت کیا جو کبھی اس کے خیال میں بھی نہیں آیا ہوگا۔ یعنی اس کا مرتبہ اس قدر بلند کر دیا کہ اس معاملہ میں اب اسے مزید کوشش کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

مسیحی فضلا تو یہ کہتے تھے۔ کہ عورت مرد کے لئے بنائی گئی ہے۔ مرد عورت کے لئے نہیں بنایا گیا۔ آپؐ نے دنیا کو بتا دیا کہ عورت مرد کا نصف اولیٰ ہے۔ اور یہ بات اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرمائی۔ جس میں بتایا گیا ہے۔ کہ مرد اور عورت دونوں ایک ہی "نفس" سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے بالکل یکساں ہیں۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا	"اے لوگو! اپنے رب کا تقوے اختیار کرو، جس
رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم	نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا۔ اور اسی
مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ	سے اس کا جوڑا پیدا کیا۔ اور ان دونوں سے
مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا	بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔ اور
رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً	اللہ کے (حقوق کی) جس کے ذریعہ سے

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا (النسآء) ۴ : ۱	تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو، اور رحموں کی نگہداشت کرو اللہ تم پر نگہبان ہے۔"

قرآن نے عورت کا نام محصنہ رکھا ہے۔ جس کے معنی نہ تو آلہ شیطان ہیں۔ اور نہ اس کا دروازہ بلکہ شیطان کے خلاف ایک مضبوط قلعہ یا نیکی کا منارۃ النور جو انسان کو تباہ ہوتے سے بچاتا ہے۔ بائبل کہتی ہے۔" تو خاوند کی طرف خواہش کریگی اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔" لیکن آنحضرتؐ فرماتے ہیں۔ عورت تمہارے گھر کی ملکہ ہے۔ پولوس کا قول ہے۔" عورت کا لازم ہے۔ کہ خاموشی کے ساتھ باتیں سنے، کیونکہ میں نہیں چاہتا۔ کہ عورت برسر اقتدار ہو یا اختیارات اور حکومت حاصل کرے۔ چپ چاپ مرد کی محکوم رہے۔" لیکن قرآن شریف اس کے خیالات کی بایں الفاظ تردید کرتا ہے۔" عورت کو بھی مرد کیطرح حقوق حاصل ہیں یعنی جو حقوق مرد کو عورت پر ہیں۔ وہی حقوق عورت کو مرد پر ہیں۔" عورت وہ بچھو نہیں ہے۔ جو ہمیشہ ڈنک مارنے کے لئے آمادہ رہتا ہے۔ بلکہ وہ مرد کا لباس ہے جس طرح مرد عورت کا لباس ہے" (قرآن ۲ : ۱۸۷) وہ بقول مشائخ الکلیسا "آلہ بدکاری" نہیں ہے۔ بلکہ بقول قرآن ۳۰ : ۲۱ "محبت اور مودت کا چشمہ ہے۔" یسوع صاحب اپنی والدہ سے بصد شوق یہ الفاظ فرمائیں۔" اے عورت مجھے تجھ سے کیا کام ہے؟" آپ ان الفاظ کے جو چاہیں معنی کریں۔ لیکن مسیحی دنیا میں آج بھی لوگ اپنے اعمال سے ان الفاظ کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ یعنی بیٹا تو مغرب میں دولت سے کھیلتا ہے۔ اور ماں بیچاری ادنے سے ادنے مزدوری کر کے زندگی کے دن کاٹتی ہے۔ لیکن ایک مسلمان حتےّ الوسع اپنی ماں کی خدمت کرتا ہے۔ اور دل و جان سے اس کی عزت ملحوظ رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کے ہادئ برحقؐ نے اسے یقین دلایا ہے۔ کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ جیسا کہ اکثروں کا خیال ہے۔ خوشگوار شادی تو مغرب میں قسمت ہی سے ہو جاتی ہے۔ وہ ایک قسم کی لاٹری ہوتی ہے۔ جو ہزاروں میں سے ایک کو نصیب ہوتی ہے۔ لیکن اسلامی خاندانوں میں تو "بی بی" محبوب ترین دوست اور ہر نیک اثر قبول کرنے کے لیئے تیار ہوتی ہے۔ اور اس کے خلاف ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ ہمارے آقا نے فرمایا ہے۔ اور ہم پر اس کی اطاعت فرض ہے کہ خدا اور اس کی مخلوقات کی نظر میں تم مسلمانوں میں سب سے اچھا وہ ہے۔ جو اپنی بی بی اور گھر والوں کے ساتھ حسن سلوک مرعی رکھتا ہے۔ اور میں

اپنے خاندان کے ساتھ بہترین سلوک روا رکھتا ہوں۔

آپؐ کے ایک صحابی نے آپؐ سے دریافت کیا۔ ہم اپنی بی بی کے ساتھ کس قسم کا سلوک کریں؟ آپؐ نے فرمایا "جب تم کھاؤ تو اسے بھی کھلاؤ۔ اور جب تم پہنو تو اسے بھی پہناؤ۔ ہرگز اسے نہ مارو۔ اور نہ غصے میں آکر اس سے جدائی اختیار کرو" اپنی بیوی کو ہمیشہ نیک صلاح دیا کرو۔ اور اسے غلام کی طرح کبھی جسمانی سزا نہ دو" "اپنی بی بی کو مہربانی کے ساتھ تنبیہ کیا کرو" مسلمانوں پر فرض ہے۔ کہ اپنی بیوی کو نظر حقارت سے نہ دیکھے۔ اگر اس کے کسی عیب سے ناراض ہو تو اس کی کسی خوبی سے خوش بھی ہونا چاہیئے۔

جبکہ مسیحی عمائدین کلیسیاء مقام میلن میں اس مسئلہ پر گفتگو کر رہے تھے۔ کہ "عورت آسمانی بادشاہت میں داخل ہو سکتی ہے یا نہیں" اس سے پچپن تیس سال ہی کے بعد قرآن مجید نے عورت کو یہ بشارت سنائی "داخل ہو بہشت میں تم اور تمہاری بیویاں خوش خوش" (الحجر ۱۵: ۴۵-۴۶)

"جو نیک اعمال بجا لاتا ہے۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور جو ایمان لے آتا ہے۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت یقیناً وہ لوگ بہشت کے وارث ہوں گے" "جو نیک اعمال بجا لائے گا۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت اسکو ہم خوشی کی زندگی میں داخل کریں گے"

ملحوظ خاطر رہے۔ کہ قرآن نے عورت کو بلا کسی قید کے وعدۂ جنت دیا ہے۔ لیکن مسیحی علماء نے بعد گفت و شنید مذکورہ بالا کانفرنس میں اس شرط پر عورت کو جنت میں جانے دیا۔ کہ وہ جنسیت سے قطعاً معرا ہو جائے یعنی خدا اسے نہ مرد کی حالت میں رکھے گا نہ عورت کی۔ یعنی "عورت" کی حیثیت سے بہر حال عورت جنت میں نہیں جا سکتی۔ مگر قرآن شریف نے صاف الفاظ میں فرمایا۔

اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ	یقیناً مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور
وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ	مومن مرد اور مومن عورتیں اور فرمانبردار
وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَ	مرد اور فرمانبردار عورتیں اور صدق دکھانے
الصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ	والے مرد اور صدق دکھانے والی عورتیں
وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ	اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنیوالی عورتیں
وَالْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ	اور فروتنی کرنے والے مرد اور فروتنی کرنیوالی

وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ	عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور
وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ	خیرات کرنیوالی عورتیں اور روزہ رکھنے والے
وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ	مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی
وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ	شرمگاہوں کی حفاظت کرنیوالے مرد اور
كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ	اور حفاظت کرنیوالی عورتیں اور اللہ کو
اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً	بہت یاد کرنیوالے مرد اور بہت یاد کرنیوالی
وَّاَجْرًا عَظِيْمًا	عورتیں او انکے لئے اللہ نے مغفرت اور بڑا
(الاحزاب ۳۳: ۳۵)	اجر تیار کیا ہے۔"

جب ہمارے متعصب نکتہ چین اسلام پر یہ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ اس کی رُو سے عورت میں روح نہیں ہے۔ تو دراصل وہ مذہب اسلام سے ناواقفیت اور اپنی کوتاہ نظری کا ثبوت دیتے ہیں۔ اس حماقت آمیز خیال کی تردید کے لئے کسی تفصیلی تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر مرد میں روح ہے۔ تو عورت میں بھی ہے کیونکہ اسلام کی رو سے عورت اور مرد دونوں یکساں ہیں۔

تکریم و تقدیسِ نکاح آپؐ نے ضابطۂ نکاح کو ایک نئے اور معزز معنی پہنا دیئے۔ اور اسے اخلاق فاضلہ کی تربیت اور محبت کے اس تخم کی آبیاری کا ذریعہ بنا دیا۔ جو انسانی قلب میں مخفی طور پر موجود ہے (روم ۳۰: ۲۱) ایثار اور قربانی کا جذبہ دراصل تمام اعلیٰ جذبات کی بنیاد اور ان اخلاق فاضلہ کی اساس ہے۔ اور شادی سے اس میں اک قدرتی تحریک پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ کیفیت ایثار علانیہ پیدا ہو جاتی ہے۔ شادی کے بعد میاں بی بی محض ایک دوسرے کے لئے اور بال بچوں کے لئے جیتے ہیں۔ اور ان کی آسائش کی خاطر ہر طرح کا ایثار کرتے ہیں۔ پس متاہل زندگی سے وسعتِ قلب اور افزائشِ احساس پیدا ہوتی ہے۔ ہم دوسروں کے لئے وہی کرتے ہیں۔ جو کچھ ہم اپنے لئے کرتے ہیں۔ اور خاندان کے افراد جس قدر زیادہ ہوتے جاتے ہیں۔ اسی قدر ہمیں اس قسم کی اخلاقی تربیت حاصل کرنے کا زیادہ موقع ملتا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ تعدّدِ ازدواج اگر اسلامی اصولوں کے ماتحت ملحوظ رکھا جائے۔ تو اس مقصد میں بہت کچھ امداد کر سکتا ہے۔ اگرچہ اس کے ساتھ دشواریاں بھی لگی ہوئی ہیں۔ کیونکہ ایک انسان کے لئے

یہ بات بہت ہی مشکل ہے کہ وہ کئی بیویوں سے یکساں محبت قائم رکھ سکے۔ اور اگر کوئی شخص اس پر قادر ہو سکے تو وہ غیر معمولی قابلیت کا انسان ہو گا۔ لیکن اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ تو پھر قرآنی تعلیمات کی رو سے گنہ گار بھی ہو گا۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے فرمانا ہے۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا • "اور اگر تمہیں خوف ہو کہ عدل نہیں کر سکو گے

فَوَاحِدَةً" (النساء ۴:۳) تو ایک ہی پر اکتفا کرو۔"

اس پہلو سے بھی آنحضرتؐ ایک بہترین نمونہ نظر آتے ہیں۔ کیونکہ آپؐ کی کوئی بیوی دوسری بیوی کے ساتھ طرفداری کی شاکی نہیں ہوئی۔ آپؐ سب بیویوں کے ساتھ یکساں سلوک فرماتے تھے۔ اور آپؐ کا متعدد عورتوں سے شادی کرنا نفسانی خواہشات کی بناء پر ہرگز نہ تھا۔ کیونکہ آپؐ کی زندگی بیحد مجاہدانہ اور زاہدانہ تھی اس میں برانگیختگی جذبات کا موقعہ ہی نہ تھا۔ جب آپؐ نے نوجوانی یعنی پچیس سال کی عمر میں پہلی شادی کی۔ تو ایک بیوہ سے کی تھی۔ جس کی عمر چالیس سال کی تھی۔ اور جب تک وہ زندہ رہیں۔ آپؐ نے دوسری شادی نہیں کی۔ یعنی باون سال کی عمر تک ایک بیوی پر اکتفا کیا۔ ان کی وفات کے بعد آپؐ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے شادی کی۔ اس زمانہ میں آپؐ کو دشمنوں سے جنگوں میں مشغول ہونا پڑا۔ جن کی بناء پر آپؐ کے صحابہؓ کم ہو گئے۔ اور ان کی بیوائیں بیکس رہ گئیں۔ جن کو پناہ کی سخت ضرورت تھی۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے، تعدادِ ازدواج کا اصول قائم کیا گیا۔ اور اکثر بیوائیں جو آپؐ کے نکاح میں آئیں سن کہولت کو پہنچ چکی تھیں۔ جنہیں تعلقاتِ زناشوئی کی کوئی احتیاج باقی نہیں رہی تھی۔ غرضکہ ان شادیوں سے احتظاظِ نفس مدِنظر نہ تھا۔ بلکہ اس کی وجہ سے آپؐ کو اس بات کے ثابت کرنے کا موقعہ ملا۔ کہ جو عورت کشش ظاہری نہ رکھتی ہو اسے بھی خاوند پر یکساں حقوق حاصل ہیں۔ خواہ اس خاوند کے پاس دوسری حسین ازواج بھی کیوں نہ موجود ہوں۔

تعددِ ازدواج

وحدتِ ازدواج مسیحی اصول نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ چند صدی پیشتر مسیحی ممالک میں "تعددِ ازدواج" معمول بہ تھا۔ اور نہ صرف عامۃ الناس میں بلکہ پادریوں میں بھی اس کا رواج تھا۔ اس کے علاوہ ہر مذہب اور ہر تمدن نے اس کی اجازت دی ہے۔ یسوع صاحب کسی شریعت کے بانی تو تھے نہیں۔ اس لئے انہوں نے اس کے متعلق کوئی بات نہیں بتائی۔ بلکہ موسوی شریعت پر

عمل پیرا تھے۔ بنی اسرائیل کی شریعتِ مروجہ میں "تعدد ازدواج" جائز تھا۔ اور اس حد تک کہ ناظرین کو تعجب ہوگا بعض اوقات ان میں ایک ایک آدمی کے پاس پانچ پانچ سو عورتیں ہوتی تھیں۔ یسوع صاحب نے بھی اپنی قوم کی اس برائی کی اصلاح ضروری نہ خیال کی۔ اور ان کی زندگی میں تعدد ازدواج پر بکثرت عمل ہوتا رہا۔ پہلا شخص جس نے "وحدت ازدواج" کو قانون ملکی بنایا۔ وہ جسٹنین قیصر روم تھا۔ لیکن بہت سی رومی حسنات کی طرح یہ خوبی بھی۔ مسیحیت کے اثرات کی تندر ہوگئی۔

اسلام دنیا کی تمام برائیوں کی اصلاح کے لئے آیا تھا۔ اس لئے اس نے "تعدد ازدواج" کی طرف بھی توجہ کی۔ اس پر قیود عاید کیں۔ اور عام حالات میں تقریباً محال بنا دیا۔ "تعدد ازدواج" بھی بعض حالات میں خالی از فائدہ نہیں ہے۔ مثلاً جس گھر میں بچہ نہ ہو۔ وہ قبرستان سے بھی بدتر ہے۔ یہ بھی ممکن ہے۔ کہ پہلی عورت سے سالہا سال تک کوئی اولاد نہ ہو۔ اور اگر اس لاولدی کی ذمہ داری عورت پر ہے۔ تو پھر سوائے دوسری شادی کے اور کچھ علاج نہیں ہو سکتا۔ اور ہندوستان میں تو خود پہلی بیوی کی تحریک سے دوسری شادی عمل میں آتی ہے۔ پس اسلام میں اس "تعدد ازدواج" کی اجازت صرف انہی ناگزیر حالات میں دی جاتی ہے۔ بعض اوقات مثلاً بحالت و بعد انقضائے جنگ عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں "تعددِ ازدواج" عین مطابق ضروریات ثابت ہوگا۔ تاکہ دوسری خوفناک برائیاں پیدا نہ ہوں چنانچہ جب بحالات جنگ مدینہ میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہوگئی۔ تو آنحضرت صلعم کو خدا تعالیٰ کی طرف سے امت کے لئے تعددِ ازدواج پر قیود کے ماتحت عمل درآمد کرنے کی اجازت عطا ہوئی۔ میل شہوانی بہرکیف ایک فطری جذبہ ہے۔ اور اس کو زائل نہیں کیا جا سکتا۔ جذبات کو روکنا بھی صحت کے لئے مضر ہے۔ اور تجرد کی زندگی سے طرح طرح کی اخلاقی کمزوریاں پیدا ہوتی ہیں۔ از روئے فطرت مرد اور عورت دونوں نکاح کے ماتحت مقاربت کے مستحق ہیں۔ لیکن مرد عورت کا غیر منضبط اختلاط تمدن کے حق میں سم قاتل ہے۔ پس ان حالاتِ خاصہ میں تعددِ ازدواج کے سوا اور کوئی صورت متصور نہیں ہو سکتی۔ ہم اس کی ترویج و اشاعت کے حامی نہیں ہیں۔ محض ضرورت کے وقت اس کی اجازت دی جاتی ہے۔

جنگ عظیم کے بعد سے یورپ میں بھی یہی صورت حال پیدا ہوگئی ہے۔ عورتوں کی تعداد مردوں سے بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ تجرد زندگی غیر فطری ہے۔ اور اگر "گناہ" انسانی ترقی میں کسی شے کے حائل ہونے کا نام ہے

تو یہ حالت بھی گناہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یورپ تعدداز دواج سے بالکل پاک صاف ہو چکا ہے؟ شادی اپنی اصلی شکل میں تو مرد و عورت کے تعلق باہمی کا نام ہے۔ اور آیندہ نسل کی پرورش اور تحقیق ابوت کی ضرورت سے اس کو ایک شانِ تقدس حاصل ہو جاتی ہے۔ اگر اسے "تعلق باہمی" کے زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے۔ تو یورپ سے بڑھ کر کوئی "خطہ" تعدداز دواج" پر عامل نہیں ملے گا۔ مسلمان تو شاذ و نادر ہی اس پر عمل کرتے ہیں اور وہ بھی شرعی طور پر اور جائز طریق سے۔ لیکن یورپ والے رات دن بے محابا اس پر عامل ہیں۔ ستم ظریفی بحث تو یہ ہے کہ سابق الذکر طریقہ جائز بھی ہے۔ اور بلحاظ نتائج خوشگوار بھی۔ مگر یورپ میں جرم اور مذموم خیال کیا جاتا ہے۔ اور آخر الذکر صورت ناجائز بھی ہے۔ اور سرچشمہ بیحیائی بھی مگر مستحسن اور معصوم خیال کیا جاتا ہے حالانکہ "قانون" وہ ہے۔ جو جذبات سے بالاتر ہو اور اسکا مطمع نظر صرف بہبود انسانی ہو۔ دنیا میں دو برائیاں شروع سے لاعلاج چلی آتی ہیں۔ مرد کا جذباتِ مذمومہ سے مغلوب ہو کر حیوانیت کا جامہ پہن لینا اور عورت کا اس کے جذبات کے سامنے ہتھیار ڈال دینا۔ ان دونوں باتوں کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ اولاد حرامی کہلاتی ہے۔ اور عورت ذلت و رسوائی کا شکار ہو جاتی ہے۔ کیا مذہب یا تمدن نے اس دوگنہ عذاب سے بچنے کی کوئی سبیل نکالی ہے؟ مگر اسلامی ممالک اس لعنت سے آزاد ہیں۔ آخر ایسے بچوں کو جن سے ان کے والدین نے ان کی ولادت سے قبل ان کے دنیا میں آنے کے متعلق کوئی مشورہ ہی نہیں کیا تھا۔ حقوق وراثت اور اختیار نام والدین سے کیوں محروم رکھا جائے؟ وہ کیوں داغ ولد الحرامی کے نیچے آئیں؟ انگلستان نے مجبور ہو کر ان "طفلانِ زائیدہ بدوران جنگ" کو بمنزلۂ اولاد صحیح النسب تسلیم کیا۔ اور اس طرح تعدداز دواج کی درپردہ حمایت کی۔ لیکن یہ سب عارضی ہنگامہ سے زیادہ وقیع نہ تھا۔ انسانی ہمدردی کی بدولت ایسے بچوں اور ماؤں کے لئے تربیت اور پرورش گاہیں قائم کی گئیں۔ تاکہ یہ لوگ تباہ اور برباد ہونے سے محفوظ رہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مدبرین ملک اور مقتدایان دین نے اس داغ رسوائی کے مٹانے کی کونسی تدبیر کی جوان بدبختوں کے ناصیۂ حال پر ثبت ہو چکا ہے؟ اگر ان عورتوں کو جائز طور پر بشکل زوج ثانیہ مردوں کے حبالۂ نکاح میں آنے کی اجازت مل جاتی۔ تو کیا ان تمام مصائب کا سدباب نہ ہو سکتا تھا؟

اسلام سے پہلے تعدّد از دواج کی رسم بلا قیود جاری تھی۔ اور تعداد ازواج مقرر نہ تھی۔ مرد حسب خواہش جس قدر چاہتا عورتیں رکھ سکتا تھا۔ لیکن اسلام نے بحالت مجبوری اس بات کی اجازت تو دے دی۔

لیکن ازواج کی تعداد معین کر دی۔ زندگی میں بعض صورتیں ایسی بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ کہ بغیر دوسری شادی کئے ایک انسان بچ نہیں سکتا۔ اسلام میں گناہ کا مفہوم اپنے اندر بہت وسعت رکھتا ہے اور مختلف زوایائے نگاہ سے اس امر کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ چنانچہ انہی میں سے ایک پہلو حفظانِ صحت کا بھی ہے۔ متاہل زندگی میں بعض مواقع ایسے آجاتے ہیں۔ جب زن و شوہر قیام صحت کی خاطر مقاربت نہیں کر سکتے۔ مثلاً عورتیں ہر ماہ تقریباً ایک ہفتہ کے لیٔے معذور ہو جاتی ہیں۔ ایام حمل اور زمانۂ رضاعت وغیرہ میں بھی مجبوریاں لاحق حال ہو جاتی ہیں۔ ان حالات میں زچّہ اور بچّہ دونوں کی حفاظت وصحت کی وجہ سے زن و شوہر کو ایک دوسرے سے جدا رہنا ضروری ہے۔ اگرچہ آنحضرت ؐ نے اس طویل عرصہ تک محترز رہنے کے لیٔے بعض اصول مثلاً روزہ رکھنا بتائے ہیں۔ لیکن آپؐ نہیں چاہتے تھے۔ کہ بدکاری کے لیٔے ذرا سا موقعہ بھی مل سکے۔ پس آپؐ نے اس کو بہتر سمجھا۔ کہ مرد دوسری شادی کر کے جائز طور پر اپنی ضروریات کو پورا کر لے۔ اگر ہم اس اصول کی پابندی کریں۔ تو زیادہ سے زیادہ چار عورتوں کی ضرورت ہو سکتی ہے۔

مساوات بین الرّجال والنّساء کے حامی شاید یہ عذر پیش کریں گے۔ کہ پھر ایک عورت کو بھی کئی مردوں سے شادی کی اجازت ملنی چاہیٔے۔ لیکن قطع نظر اس امر سے کہ معذوریاں عورتوں کو لاحق حال ہوتی ہیں نہ مردوں کو' اس فعل کی اباحت پر اور اعتراض بھی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ہر مولود کے والدین کی تشخیص ایک ضروری بات ہے۔ تاکہ تربیت اطفال کی ذمّہ داری جائز شخص پر عاید ہو سکے۔ علاوہ ازیں بچّے کی پرورش جس شفقت کو چاہتی ہے۔ اس کے لیٔے ضروری ہے۔ کہ اس کے ماں اور باپ کی تشخیص ہو سکے۔ لیکن یہ بات اس صورت میں متحقق نہیں ہو سکتی۔ تو اہ ایک مرد کی کئی عورتیں ہوں۔ بچّہ کی تشخیص تو آسانی سے ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے باپ کی تشخیص کے لئے ضروری ہے کہ عورت کے خاوند بہت نہ ہوں۔ علاوہ بریں ایک عورت کے اگر کئی خاوند ہوں۔ تو امراض خبیثہ مخصوصۂ نساء میں وہ پہلے گرفتار ہو گی۔ چنانچہ کوہ ہمالیہ کے کوہستانی علاقوں کی عورتیں جن میں یہ رسم جاری ہے۔ اس قسم کی مختلف بیماریوں میں مبتلا رہتی ہیں۔ اور اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ اس قسم کی شرمناک بیماریاں عورتوں ہی سے شروع ہوتی ہے وہی سب سے پہلے ان امراض کا شکار ہوتی ہیں۔ اور یہ مصیبت ایک عورت کے مردوں سے مقاربت کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ پس اندریں حالات اس رسم کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

انسدادِ غلامی

دنیا میں یکے بعد دیگرے مختلف مذاہب پیدا ہوئے۔ مختلف تہذیبوں کا دور قائم ہوا۔ لیکن عورتوں کی طرح غلام طبقہ بھی حالت کس مپرسی ہی میں رہا۔ نبی کریمؐ ہی نے سب سے پہلے ان پر ترس کھایا آپؐ نے اسیری جنگ کے علاوہ اور ہر طرح کی غلامی کا بھی انسداد فرمایا۔ اور اسیران جنگ کی بہبودی کے لئے بہت سے عمدہ قوانین بنا دیئے۔ اور ان کے ساتھ حسن سلوک کے ایسے اصول وضع فرمائے کہ ان کی بدولت ان کی حالت مردانِ آزاد کے قریب قریب ہی آ گئی۔ حد یہ ہے کہ اسلام میں بہت سے غلام ایسے ہوئے ہیں۔ جنہوں نے آج غلامی کی تو کل بادشاہت حاصل کی۔

شراب خوری اور قمار بازی

منجملہ اصلاحات مختلفہ شرابنوشی اور قمار بازی کے انسداد کی وجہ سے بھی آپؐ کا احسان دنیا پر تا قیامت رہے گا۔ یہ دونوں لعنتیں آج بھی مغربی دنیا پر مسلّط ہیں۔ اور یورپی اقوام تنگ آ کر ان کے خلاف حتے الوسع کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن آپؐ نے ان باتوں کے عیوب کو اس وقت دیکھ لیا تھا۔ جب کوئی ان کو برا نہ سمجھتا تھا۔ اور یسوعؑ نے تو شراب کا معجزہ بھی دکھایا تھا۔ لہٰذا آنحضرتؐ کی دوربینی کی بدولت آج دنیا کی آبادی کا چوتھائی حصہ اس لعنت سے پاک ہے۔

علم و منطق کی عزّت

آپؐ پہلے معلمِ مذہب ہیں جنہوں نے مذہب اور سائنس کو ایک دوسرے کا مددگار بنا دیا۔ آپؐ نے معتقداتِ تحکمانہ کا قلع قمع کر دیا۔ اور صرف عقل کو مذہبی صداقت کا معیار مقرر فرمایا۔ آپؐ کی تعلیمات میں کوئی بات ایسی نہیں جو خلاف عقل سلیم ہو۔

آپؐ نے تحصیل علوم و فنون کو عبادت سے بھی بہتر قرار دیا ہے۔ آپؐ کے نزدیک کائنات عالم میں تفکر و تدبّر کرنا۔ تاکہ مختلف مظاہر فطرت کو انسان کا خادم بنایا جا سکے۔ الٰہی عظمت کے اظہار کا بہترین ذریعہ قرار پایا ہے آپؐ نے اکتسابِ علوم کے لئے اپنی جماعت کے افراد میں وہ تحریک پیدا کر دی۔ کہ آپؐ کی وفات سے سو سال بعد اسلامی دنیا میں علوم و فنون کے دریا بہنے لگے۔ قبلِ اسلام انسان آگ پانی ہوا یا دیگر جمیع مظاہر فطرت کو اپنا معبود سمجھتا تھا۔ لیکن آپؐ نے یہ تعلیم دی کہ جمیع کائنات کی چیزیں انسان کی خدمت گذار ہیں۔ اور وہ اشرف المخلوقات ہے آپؐ کی اس تعلیم سے تمام دنیا کے دیوی دیوتا۔ انسان کے خادم قرار پا گئے۔ اس سلسلہ میں آپؐ کے ارشادات سنیئے۔

احترامِ عقل و حکمت

حضورؐ فرماتے ہیں: علماء کی باتیں کو غور سے سننا۔ اور حکمت آمیز اقوال کی ترویج کرنا ریاضت مذہبی سے بدرجہا بہتر ہے۔ ایک عالم انسان کی دوات کی روشنائی خون شہید سے افضل ہے۔" "جو شخص طلب علم کے لئے اپنا وطن چھوڑتا ہے۔ وہ خدا کے راستہ پر چلتا ہے۔" "طلب علم ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔" "علم حاصل کرو۔ خواہ چین ہی میں کیوں نہ ملے۔" "علم حاصل کرو۔ کیونکہ اس کی بدولت نیکی اور بدی میں تمیز کرنے کی لیاقت پیدا ہوتی ہے۔ **علم** جنت کے راستہ میں مشعل کا کام دیتا ہے۔ راحت قلبی کا سامان مہیا کرتا ہے۔ مصیبت میں ڈھارس بندھاتا ہے۔ دشمنوں کے مقابلہ میں سپر کا کام دیتا ہے۔ اور دوستوں میں ایک خوبی اور زیور ہے۔"

عالمگیر مذہب

دنیا میں متعدد مذاہب پائے جاتے ہیں۔ اور ہر شخص اپنے ہی مذہب کو منجانب اللہ تصور کرتا ہے۔ اور اسی لئے اس کو تمام دنیا کے لئے ضروری قرار دیتا ہے۔ اور عیسائی مشنری تو اس معاملہ میں سب سے چار قدم آگے رہتا ہے۔

کسی مذہب کا شانِ عالمگیری سے متصف ہونا عقلاً ممکن ہے۔ خصوصاً اس زمانہ میں جبکہ بوجہ فراوانیٔ اسبابِ مخابرت و مراسلت اہالی ارض باہم دگر قریب تر ہو گئے ہیں۔ لیکن مذاہب میں اختلاف عقاید بکثرت موجود ہیں۔ اور وہی مذہب عالمگیر ہو سکتا ہے۔ جو جملہ اختلافات کو مٹا کر ان میں ایک شان اتحاد پیدا کرے اور ہر امر اختلافی کا تصفیہ کر دے۔ اور جو عقاید پیش کرے۔ ان کی خوبی اور ضرورت دونوں کو بدلائل عقلیہ ذہن نشین کر دے۔ اور جن کو مردود قرار دے ان کی بطالت **بھی** مبرہن کر دے۔ اس ضمن میں ان چند اختلافی مسائل کا ذکر خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ جن کی وجہ سے مختلف فرقے رونما ہو گئے ہیں۔ ابتداءً عقیدہ باری تعالےٰ کو لیجئے۔ بعض مذاہب میں اس کو مرکزی حیثیت دی گئی ہے۔ اور بعض میں اس کا ذکر بھی ضروری نہیں سمجھا گیا۔ مثلاً بدھ اور کنفیوشش دونوں نے فلسفہ اخلاق ہی کی تعلیم دی۔ اور خدا کا ذکر مطلق نہیں کیا۔ علاوہ بریں خدا پرستوں میں بعض تو اس کی عبادت اس طرز پر کرتے ہیں۔ جو خود اس نے بذریعہ وحی بتا دی ہے۔ اور بعض یہ یقین رکھتے ہیں کہ بذاتِ خود طریق عبادت دریافت کرنا اور پھر اس پر عامل ہونا مناسب ہے۔ یعنی یہ لوگ وحی و الہام کو ضروری نہیں سمجھتے صرف اپنے مجلّیٰ اور تربیت یافتہ ضمائر کو ہدایت کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ ہندوستان میں برھمو سماج اس کی زندہ مثال ہے۔ علاوہ بریں "اہلکتاب" بھی دو طبقات میں منقسم ہیں۔ ایک تو وہ جو یہ یقین کرتے ہیں۔

کہ روح جسم سے جدا ہونے کے بعد دوبارہ دنیا میں نہیں آتی۔ دوسرے وہ جو یہ سمجھتے ہیں۔ کہ جملہ ارواح مقید بالارض ہیں۔ اور ایک جسم سے نکلنے کے بعد دوسرے جسم سے متعلق ہو جاتی ہیں۔ اس عقیدہ کو تناسخ ارواح کہتے ہیں۔ ان باتوں کے علاوہ دیگر حقائق کے متعلق بھی بے حد اختلافِ آراء موجود ہے۔ پس عالمگیر مذہب وہ ہو سکتا ہے جو سب طرح کے لوگوں کی تشفی کر سکے۔ ان کے سوالات کے جوابات دے سکے۔ اور یہ بھی شرط ہے کہ وہ جوابات سب کے سب کسی معلّم مذہب ہی نے مہیا کئے ہوں۔ میں نے تمام بائیبل کو بغور پڑھا ہے۔ علی وجہ البصیرت کہہ سکتا ہوں کہ اس کے اندر عقاید مذکورہ بالا میں ایسے عقاید کی تردید کا جو اس کی تعلیمات کے خلاف ہیں۔ کوئی سامان موجود نہیں ہے۔ مثلاً بائیبل مذکورہ میں "تناسخ" کے قائلین کی تردید و تشفی کا کوئی پہلو نہیں مل سکتا جناب مسیحؑ بھی اس مسئلہ میں خاموش نظر آتے ہیں۔ پس کس طرح وہ "عالمگیر مذہب کے بانی" کہلا سکتے ہیں۔ اسی طرح دوسری کتبِ مذہب قبل از قرآن کا حال ہے۔ ہاں قرآن نے جن جن عقاید مروجہ سے اختلاف کیا۔ اس کی تردید عقلی طور پر کی۔ علاوہ ازیں ہر شخص اپنے نبی کی عزت کرتا ہے۔ اور اس سے منسوب تعلیم میں اگر کوئی نقص بھی ہو تو بھی وہ اس قدر کشش ضرور رکھتا ہے۔ کہ باوجود امکانِ اغلاط اس کے متبعین اس سے محبت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

مغربی لوگوں کا یہی حال ہے۔ لاکھوں لوگ ایسے ملیں گے۔ جو یسوع کی پاکیزہ خصائل سے وابستگی رکھتے ہیں لیکن مروجہ مسیحیت پر ایمان نہیں لا سکتے۔ عالمگیر مذہب میں اس تناقض کے رفع کرنے کے لئے مواد کا ہونا ضروری ہے۔ آنحضرتؐ نے یہ فرما کر کہ "جملہ انبیاء خدا تعالےٰ کی طرف سے آئے ہیں" اس گتھی کو سلجھا دیا۔ غرضکہ آپؐ کا پیش کردہ مذہب ہر لحاظ سے کامل اور مکمل ہے۔ وہ تمام خوبیاں اور صداقتیں جو دیگر مذاہب میں پائی جاتی ہیں۔ بیک وقت اور بیک جا اسلام میں مل سکتی ہیں۔ اسی طرح آپؐ نے انسانی فطرت کے ہر پہلو کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے اور ہر بات کے متعلق تعلیم مہیا فرما دی ہے۔ باقی ماندہ امور میں الہامی کتابیں اس لحاظ سے ناقص ہیں۔ اور یسوع کی تعلیمات سب تعلیمات سے زیادہ ناقص۔

آنحضرتؐ کو ہم لوگ کامل نبی اسی لئے کہتے ہیں۔ کہ آپؐ کی شریعت ہر پہلو اور ہر لحاظ سے کامل ہے۔

متذکرہ بالا امور کے علاوہ عالمگیر مذہب میں جب تک اخوت۔ مساوات انسانی۔ رواداری وغیرہ کی تعلیم نہ ہو۔ وہ مذہب عالمگیر کیسے ہو سکتا ہے۔ اور اسلام کے سوا ان باتوں کی تعلیم تو کیا دیگر مذاہب میں ان عالمگیر اصولوں

کے خلاف ہی مواد ملتا ہے۔

اسلام ایک قابلِ عمل مذہب ہے

اس ضمن میں اس خاص بات کا تذکرہ بھی لابد ہے۔ جس کی خاطر مذہب کو یہ وقیع درجہ حاصل ہے۔ یعنی مذہب کا اعلیٰ ترین اور اولین فرض یہ ہے۔ کہ وہ اپنے پیروؤں کے دماغوں کی آبیاری کرے۔ اور ان کی عقلوں کو منجلی اور ان کے نفسِ مُدرکہ کو ضمیرِ صادق میں مبدل کردے۔ ہمارے اندر "بہیمت" موجود ہے۔ اور ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیئے۔ کہ اس بہیمت کو ربانی رنگ دیگر صفاتِ الٰہیہ کی جلوہ گاہ بنالیں۔ بیشک ہر مذہب میں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ اصول موجود ہیں۔ لیکن نبی کریمؐ نے مختصر اور آسان راستہ بتا دیا ہے۔ جہاں دوسرے مذاہب نے اس مقصد کے حصول کے لئے زبردست ریاضت اور ترک دنیا کی تعلیم دی ہے آپؐ نے ان سب باتوں کو مذموم قرار دے کر، ہمیں اسی دنیا میں زندگی بسر کرنے کی اجازت دی ہے۔ ہاں زندگی بسر کرنے کا طریقہ ایسا بتایا ہے۔ جس سے گوہرِ مقصود ہاتھ لگ سکتا ہے۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں کہ ایک دن اپنی زندگی کا خدا کے لئے قرار دیں۔ اور کچھ دن اپنے لئے۔ بلکہ مومن کی زندگی کا ہر لمحہ خدا کی یاد میں بسر ہونا چاہیئے۔ اسی لئے آپؐ نے پنج وقتہ نماز کا حکم دیا۔ اور الفاظ دُعاوہ بتائے۔ جو ہمارے افعال واقوال کو روحانیت کا رنگ دے سکتے ہیں۔ آپؐ نے خانگی اور معاملی زندگی کو محمود قرار دیا ہے۔ بلکہ اسے اخلاق حسنہ کی تربیت گاہ یقین فرماتے ہیں۔ چونکہ ہماری زندگی میں صرف نفسانی خواہشات ہی کی بدولت ہیجان اور تلاطم برپا ہوسکتا ہے اس لئے آپؐ نے ان کو قابو میں رکھنے کے طریقے بتائے ہیں۔ یہ کہ سرے سے ان جذبات ہی کا قلع قمع کر دیا جائے پس ہمارا کام یہ ہے۔ کہ ان جذبات نفسانی کی اس طرح تربیت کریں۔ کہ ان میں روحانیت کا رنگ پیدا ہو جائے فارسی میں ایک مثل ہے۔ "دست بکار دل بیار" یعنی ہاتھوں سے کام کرو۔ اور دل میں خدا کی یاد رکھو۔ یہ مثل اسلامی تعلیمات کی بدولت ایک صداقت بن گئی ہے۔ لہٰذا پھر میں اسی بات کا اعادہ کرتا ہوں کہ اس لحاظ سے بھی آپؐ ہی کو جمیع ہادیان مذاہب پر تفوق تام حاصل ہے۔ کہ اس نظام حیات کو سب سے پہلے آپؐ ہی نے منضبط فرمایا۔

باب نہم

عقاید مذہبی کا اعلیٰ ترین شارح

ہر مذہب میں بعض باتیں ایسی ہوا کرتی ہیں۔ جنہیں عقاید خصوصی کہتے ہیں۔ مثلاً ایمان باللہ، بالملائکہ، بالوحی، بالرسالت، و نبوت، بالیوم الآخر، بالمکافات الاعمال، بعد الموت وغیرہ۔ یہ باتیں تقریباً ہر مذہب کی روح رواں سمجھی جاتی ہیں لیکن عموماً ان کو حکیمانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اسلام سے پہلے ان کو عقلی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کسی مذہب کی طرف سے نہیں کی گئی تھی۔ انھیں معجزات کی بناء پر منوایا جاتا تھا۔ یعنی دلیل یہ ہوا کرتی تھی۔ کہ "ان عقاید کو چونکہ اس شخص نے پیش کیا ہے۔ جس نے متعدد معجزات دکھائے تھے۔ لہذا انھیں مان لینا چاہیئے۔" لیکن جب آج ان معجزات ہی کی وقعت لوگوں کی نگاہوں میں نہ رہی۔ تو ان عقاید پر یقین بھی رخصت ہو گیا۔[۱] میں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ صرف یہ کہنا کافی سمجھتا ہوں۔ کہ معجزہ دکھانے والے کی زندگی میں تو معجزات موجب افزائش ایمان ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد "روایات" کی شکل میں مبدل ہو جاتے ہیں۔ اور آیندہ نسلیں انھیں وقیع نہیں خیال کرتیں۔ علاوہ بریں خدا نے ہمیں قوتِ عقل و فکر عطا فرمائی ہے

---

[۱] اگر کل کائنات کسی مقصدِ خاصہ کی حامل ہے۔ تو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ خاص واقعات (معجزات) کسی خاص غرض کے لئے ظہور پذیر ہوں۔ اور ان سے مقصد کائنات میں نقص واقع ہو۔ یہ ڈین انجی کے الفاظ کا ملخص ہے۔ ان کا مطلب یہ ہے۔ کہ دنیا میں جس قدر واقعات رونما ہوتے ہیں۔ وہ سب مقررہ قوانین کے ماتحت ہوتے ہیں۔ اور کوئی واقعہ خواہ اس سے کتنا ہی عظیم الشان مقصد کیوں نہ پورا ہوتا ہو۔ قوانین مذکورہ کے خلاف نہیں ہو سکتا اگر وہ قوانین ایک عالم الغیب اور ہمہ دان خدا کے بنائے ہوئے ہیں۔ تو یقیناً وہ ایک ہی ضابطہ اور اصول کے ماتحت کام کرتے ہوں گے۔ جس مشین کو ٹھونکنے پیٹنے کی ضرورت ہو۔ اسے عیب دار مشین کہہ سکتے ہیں۔ لیکن جو مشین کسی مقصد کو پورا نہیں کرتی۔ وہ "مشین" کہلائے جانے کی بھی مستحق نہیں ہے فطرت کی کارفرمائیوں میں جو باضابطگی اور یکسانیت سائنس کی بدولت معلوم ہوئی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ اس کائنات کے بنانے والا ایک حکیم علی الاطلاق ہے۔ جو بلحاظ وجود واحد لاشریک لہ، ہے۔

یہ عطیۂ الٰہی ہے۔ اور اس لئے اس سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اور ہمیں اس قوت کو عمل کرنے کی پوری آزادی دینی چاہیئے۔ کیونکہ ہم ہر بات پر آنکھیں بند کر کے ایمان نہیں لا سکتے۔ اور بقول قرآن۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرہ ۲: ۲۸۶) — "اللہ کسی پر کچھ لازم نہیں کرتا۔ مگر جس قدر اس کی طاقت ہو۔"

مذہب ہماری عقول کے لئے بارِ شاطر ہونا چاہیئے نہ کہ بارِ خاطر۔ قرآن شریف ایسی آیات سے بھرا پڑا ہے جن کے آخر میں اللہ تعالےٰ انسان کی توجہ ان مظاہر فطرت کی طرف مبذول کرتا ہے۔ جو مصدّق حقائق قرآنی ہیں یعنی ایک طرف تو کسی اصول کو قائم کرتا ہے۔ اور دوسری طرف اس کی تشریح میں صحیفۂ قدرت کو بطورِ دلیل پیش کرتا ہے۔ آیات ذیل ملاحظہ ہوں۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (الروم ۳۰: ۲۴) — "یقیناً اس میں ان لوگوں کے لئے نشان ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔"

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ (الروم ۳۰: ۲۱) — "یقیناً اس میں ان لوگوں کے لئے نشان ہیں جو فکر کرتے ہیں۔"

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (الروم ۳۰: ۳۷) — "یقیناً اس میں ان لوگوں کے لئے نشان ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔"

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ (الروم ۳۰: ۲۳) — "یقیناً اس میں ان لوگوں کے لئے نشان ہیں۔ جو سنتے ہیں۔"

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (النحل ۱۶: ۶۷) — "یقیناً اس میں ان لوگوں کے لئے نشان ہیں۔ جو عقل سے کام لیتے ہیں۔"

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّذَّكَّرُوْنَ (الانعام ۶: ۱۲۶) — "ہم نے باتیں ان لوگوں کے لئے کھول کر بیان کر دی ہیں جو نصیحت حاصل کرتے ہیں۔"

كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ (الاعراف ۷: ۳۲) — "اسی طرح ہم باتوں کو ان لوگوں کیلئے کھول کر بیان کرتے ہیں۔ جو علم رکھتے ہیں۔"

إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ	"رات اور دن کے اول بدل میں اور
وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ	(اس میں) جو اللہ نے آسمانوں اور زمین
وَالْأَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ	میں پیدا کیا ہے۔ ان لوگوں کے لئے نشان
يَّتَّقُوْنَ (یونس ۱۰:۶)	ہیں۔ جو تقوے سے کام لیتے ہیں"
إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ	"اس میں ہر ایک صبر کرنے والے شکر کرنے
صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (ابراھیم ۱۴:۵)	والے کے لئے نشان ہیں"

ان آیات کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ قرآن مجید اپنی صداقت کے لئے انسانوں کی عقل وفہم و دانش و علم و عرفان و قوتِ تفکر و تدبر و حافظہ اور نیکی سے اپیل کرتا ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا۔ کہ میری باتوں پر آنکھ بند کر کے ایمان لے آؤ۔ اور نہ معجزات کو ان کی دلیل ٹھہراتا ہے۔

مذکورہ بالا عقائد خصوصی کے اثبات کے لئے عقل انسانی نے یسوع کے زمانہ میں بھی تقاضا کیا تھا۔ چنانچہ ایک صدوقی جو حیات بعد الموت کا قائل نہ تھا۔ ان کے پاس آکر طالب دلیل ہوا۔ ممکن ہے کہ اس وقت عام طبائع اس پختگی کو نہ پہنچی ہوں۔ جو دلائل عقلی سے بہرہ اندوز ہونے کے لئے درکار ہے۔ اور اسی لئے جناب مسیح نے اس کو یہ جواب دیا تھا۔ اور احیائے موتے کے متعلق یہ ہے۔ کہ کیا تم نے خدا کا وہ ارشاد نہیں پڑھا۔ جس میں لکھا ہے۔ کہ "میں ابراہیم کا خدا ہوں۔ اسحاق کا خدا ہوں۔ اور یعقوب کا خدا ہوں؟ اور خدا مردوں کا نہیں بلکہ زندوں کا ہے" (متی ۲۲: ۳۱-۳۲) یعنی مرنے کے بعد اگر یہ لوگ زندہ نہ ہوتے تو خدا تعالےٰ اپنے آپ کو خدائے ابراہیم وغیرہ کہہ کر نہ پکارتا۔ لیکن اس جواب سے موجودہ لاادری یعنی متشککین کی تشفی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس میں ایک منطقی مغالطہ پوشیدہ ہے۔ یعنی یسوع کے جواب میں وہ بات بطور دلیل پیش کی گئی ہے۔ جو خود محتاج ثبوت ہے۔ ان بزرگوں کی حیات بعد الموت خود محتاج ثبوت ہے۔ پھر ان کی طرف اشارہ کرنا کیسے حیات بعد الموت کے ثبوت میں بطور دلیل پیش ہو سکتا ہے۔

بہشت و دوزخ کا عقیدہ ہر مذہب کا جزو لاینفک ہے۔ اور بغیر اس کے مذہب ایک بیفائدہ چیز ہو جائے گا۔ لیکن یہی عقیدہ اکثر الناس کے لئے موجب لغزش بھی بن جاتا ہے۔ ابتدا میں انسان مکانی دوزخ و بہشت کے عقیدہ سے بالکل مطمئن تھا۔ لیکن جب عقل کا دور شروع ہوا۔ تو وہ عقیدہ "لاادریت"

کے تحت میں آگیا۔ نظام کوپرنیکس کی بدولت مسیحی عقیدۂ جنت و دوزخ کے پرخچے اڑ گئے۔ اس کے علاوہ دوسرے پہلوؤں سے بھی مسیحیت پر اس کا اثر پڑا۔ مذہب نے عقل کو مدتوں تختۂ مشقِ ستم بنایا۔ صدیوں تک یہی حالت قائم رہی۔ کہ مذہب اور عقل کے تقاضات کو ایک دوسرے سے جدا سمجھا جائے۔ لیکن مجبوراً پادریوں کا کچھ دیر کے لئے یہ طریق بھی چلا ۔ یعنی ادعائے عقلیہ کو ادعائے مذہب کے متصل ہوتے ہی یکساں طور پر ان دونوں کو انسانی دل میں جگہ دی گئی۔ برائے چندے یہ حالت بھی قائم رہی لیکن ایک نیام میں دو تلواریں کس طرح رہ سکتی ہیں؟ کلیساء نے مجبور ہو کر مذہب اور سائنس میں تطبیق کرنی شروع کر دی۔ لیکن جھوٹ سچ کے ساتھ کس طرح گامزن ہو سکتا ہے؟ مذہب اور سائنس میں تطبیق تو ممکن ہے۔ لیکن وہاں جہاں مذہب اور سائنس امورِ حقہ کی تعلیم کریں۔ علاوہ بریں شخصی آزادی کی روز افزوں اشاعت کی وجہ سے ہر شخص کو یہ اختیار حاصل ہو گیا۔ کہ وہ اپنے خیالات بلاتوقف لومۃ لائم بیان کر دے۔ اور اس لئے مسیحیت کے خلاف عقل عقاید کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھری ہوئی نظر آنے لگیں۔ جن کو دیکھ کر ہزاروں بلکہ لاکھوں تقلیدی مسیحیوں کی عمارت ایمان متزلزل ہو گئی۔ ہاں اگر کوئی مذہب اس زد سے بچ سکتا ہے۔ اور بچا تو وہ اسلام ہے۔ کیونکہ ابتداء ہی سے اسلام اور علم و حکمت دوش بدوش چلے آ رہے ہیں۔ دوسری طرف اسلام ہی کے طفیل دنیا میں وہ عظیم الشان علمی انقلاب رونما ہوا تھا۔ جو تمدنِ جدیدہ کی بنیاد کہا جا سکتا ہے۔

علمی تحقیقات پر بھی مسلمانوں میں عقاید اسلام سے بدظنی کی وبا نہیں پھیلی۔ یعنی مسلمان اپنے عقاید سے کبھی بدظن نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ آنحضرتؐ نے پہلے ہر عقیدہ کو بدلائل عقلیہ ثابت کر دیا۔ اسکے بعد اس پر ایمان لانے کا حکم دیا۔ اگر انبیاء کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں ان باتوں پر یقین جازم پیدا کر دیں۔ جنہیں وہ بحکم ربی سکھانے پر مامور ہوئے ہیں۔ تو صرف آپؐ ہی ایسے نبی ہیں جنہوں نے کروڑوں انسانوں کو براہین عقلیہ کے ذریعہ دولت ایمان سے مالا مال کر دیا۔

قرآنی طریقِ تعلیم، انجیلی طریق سے جدا اور زمانۂ حال کی ضروریات کے موافق ہے۔ کیونکہ قرآن نے اپنی تعلیمات کے سمجھانے کے لئے وہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ جس پر عامل ہو کر موجودہ اربابِ سائنس اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ کہ اس کائنات کا خالق ایک "ذی شعور محرک یا علت اولے" ہے۔ اور اسی سبب سے اسلام میں الحاد و تشکیک کو بار آور ہونے کا موقعہ نہیں۔ مثلاً بعض احیائے موتے' قرآن اپنے ارشادات کی تصدیق کے لئے مظاہر فطرت کو پیش کرتا ہے۔ اور اس تسلسلِ حیات اور باضابطگی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جو ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ اور وہ یہ بھی بتاتا ہے۔ کہ تعطلِ

نشو نما جسے عرف عام میں "موت" کہا جاتا ہے۔ وہ معدومیت کا مترادف نہیں۔ وہ تو دراصل کسی شے کے ارتقائی منازل میں اس کے ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہونے کا نام ہے۔ اس صورت میں جوہر حیات ایک مقررہ عرصہ کے لئے جسے عربی میں "برزخ" کہتے ہیں مخفی ہو جاتا ہے۔ اور بظاہر کام کرتا نظر نہیں آتا۔ لیکن جملہ اشیاء اسی طرح مرتی ہیں۔ اور دوبارہ زندہ ہو جاتی ہیں۔ عالم نباتات کی حیات و ممات، موسموں کی تبدیلی سے بخوبی ثابت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں منکرین حیات بعد الموت کو مخاطب کر کے قرآن شریف کہتا ہے۔

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا	"کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے
ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ	(تو اٹھائے جائیں گے) یہ لوٹ کر آنا دور (از
قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ	قیاس) ہے۔ ہم جانتے ہیں جو زمین ان سے
الْاَرْضُ مِنْهُمْ وَعِنْدَنَا	کم کر دیتی ہے اور ہمارے پاس حفاظت
كِتٰبٌ حَفِيْظٌ بَلْ كَذَّبُوْا	کرنے والی کتاب ہے۔ بلکہ انہوں نے
بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ	حق کو جھٹلا دیا۔ جب وہ ان کے پاس
فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا	آیا۔ سو وہ الجھن کی حالت میں ہیں۔ تو
اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ	کیا وہ اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھتے ہم
بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا	نے اسے کس طرح بنایا اور اسے زینت دی
لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ وَالْاَرْضَ	اور اس میں کوئی خلل نہیں۔ اور زمین
مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا	کو ہم نے پھیلایا اور اس میں پہاڑ ڈالے
رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا	اور اس میں ہر قسم کی خوش نما چیزیں اگائیں
مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ	ہر ایک رجوع کرنے والے بندے کو سمجھانے
تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ	اور یاد دلانے کو اور ہم نے بادل سے
عَبْدٍ مُّنِيْبٍ وَنَزَّلْنَا	برکت والا پانی اتارا، پھر ہم نے اس
مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا	کے ساتھ باغ اگائے اور دانا جو
فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّ	کاٹا جاتا ہے۔ اور لمبی لمبی کھجوریں

حَبَّ الْحَصِيْدِ وَالنَّخْلَ	جن کا گا بھا تہ بتہ ہے ۔ بندوں
بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ	کے لئے رزق (ہے) اور اس
رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ وَ اَحْيَيْنَا	کے ساتھ ہم مردہ بستی کو زندہ
بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ	کرتے ہیں ۔ اسی طرح نکلنا
الْخُرُوْجُ (قٓ ۵۰: ۳-۱۱)	ہوگا"

جس طرح خزانی موت کے بعد اجزاء منفردہ جمع ہو کر درختوں اور ثمرات کو بہار میں زندہ کرتے ہیں۔ اسی طرح جسم انسانی کے اجزا بھی موت پر منفرد ہو کر جمع ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح قرآن لکڑی میں سے آگ نکلنے کے واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جس سے مقصود یہ بات سمجھانی ہے۔ کہ جب اشیاء ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہوتی ہیں یا نئی شکل اختیار کرتی ہیں۔ تو اس تبدیلی سے ان کی حیات کا تسلسل باطل نہیں ہوتا۔ نہ انکی کمیت وکیفیتِ حقیقی میں فرق آتا ہے۔ چنانچہ سورۂ یٰسین میں لکھا ہے۔

قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ	"کہتا ہے کون ہڈیوں کو زندہ کرے گا
رَمِيْمٌ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ	جب وہ گل چکی ہوں گی کہہ انہیں وہی
اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ	زندہ کرے گا، جس نے انہیں پہلی بار
بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُۨ	بنایا۔ اور وہ ہر پیدائش کو خوب جاننے
الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ	والا ہے۔ وہ جس نے تمہارے لئے سبز
الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ	درخت سے آگ بنائی" تو دیکھو تم اس
اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ	سے جلاتے ہو:
اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ	"کیا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا
وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ	کیا اس بات پر قادر نہیں کہ ان (انسانوں)
يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلٰى وَهُوَ	کی مثل بنا سکے، ہاں اور وہ بڑا پیدا
الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ	کرنے والا جاننے والا ہے"

(یٰسین ۳۶: ۷۸-۸۱)

ایک سبز درخت دھوپ اور چند غازات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اس لئے اسے حرارت مقیدہ بھی کہتے ہیں۔ دراصل جب آگ جلتی ہے۔ تو حرارتِ آفتاب ان دیگر اجزاء سے جدا ہو جاتی ہے۔ جن کے ساتھ وہ ترکیب پاکر لکڑی یا درخت کو پیدا کرتی ہے۔ آگ جلنے کے وقت جو شعلہ نکلتا ہے۔ اپنی شکل میں وہی حرارت آفتاب ہے۔ جس نے دوسرے اجزاء سے مل کر درخت بنا دیا تھا۔ سائنس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ لکڑی کے اجزا جب اس طرح منفرد ہو جاتے ہیں۔ تو ان کے کسی جز میں نقصان واقع نہیں ہوتا۔ جو جو اجزا جس مقدار سے ترکیب پاکر لکڑی یا درخت کو بناتے ہیں۔ وہ اسی مقدار میں آگ جلنے کے وقت جدا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح حرارتِ آفتاب کی وہ مقدار جو اس درخت کی نشو و نما میں صرف ہوئی تھی۔ اسی مقدار سے نکلتی ہے۔ جو لکڑی بنانے کے وقت خرچ ہوئی تھی۔ گویا ایک درخت کے اجزاء کی کیفیت و کمیت میں جب آگ جلنے کے وقت وہ جدا ہوتے ہیں۔ کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اسی طرح تمام موجودات ترکیب پاکر یا جدا ہونے پر جوں کی توں ہی رہتی ہیں۔ تغیر صورت سے تغیر مادی نہیں ہوا کرتا۔ ہاں صورتیں ادلتی بدلتی رہتی ہیں۔ اگر احیاء اشیاء کے معنی صرف یہ ہوئے۔ کہ ہر مرکب یا منفرد چیز کے ٹوٹ جانے پر اس کے اجزا ایک ترکیب جدید میں رونما ہو جاتے ہیں۔ تو یہ نظارہ تو ایک جاہل سے جاہل کی آنکھ بھی ہر روز صحیفۂ قدرت میں دیکھتی ہے۔ اور اس طرح اگر مرنے کے بعد انسان کے اجزا منفردہ کسی آیندہ زمانہ میں پھر متشکل ہو جائیں تو کونسا امر ہے۔ اعتراض تو مخالفین کا جیسے سورۂ یٰسین کی آیات بالا سے ظاہر ہوتا ہے یہ تھا۔ کہ جب مرنے پر ہماری ہڈیوں تک پس جائیں گے۔ تو ان سے پھر وہی انسان پیدا ہو گا۔ جو مرنے سے پہلے تھا۔ یعنی اس کے اندر وہی قوت مدرکہ اور نفس ناطقہ اسی حالت میں دوبارہ پیدا ہو جائے گا۔ جیسے مرنے کے وقت تھا۔ قرآن کریم نے اس بات کے اثبات میں دلیل بالا دی ہے۔ کہ سبز درخت جو بغرض سوختنی بھی پیدا ہوتے ہیں۔ جلنے کے وقت ان کے اجزا اپنی اصلی کیفیت و کمیت کو قائم رکھتے ہیں۔ الغرض قرآن کی ساری تعلیمات ایسی ہیں۔ کہ مظاہر فطرت ان کی تصدیق کرتے ہیں۔ اگر سائنس آج ہمیں ایک علت العلل اور باعثِ اول کا پتہ دیتا ہے۔ جو پس پردہ کائنات کا انتظام کر رہا ہے۔ اور اس کی ذات میں کسی شرکت کی نفی بھی کرتا ہے۔ خواہ اس شرکتِ وحدت سے قوائے کائنات مراد لو۔ یا آلہیین من دون اللہ تو اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ کائنات کی ساری قوتیں بحیثیت مجموعی اس حقیقت کبریٰ یعنی اس علت العلل کے واحد ہونے پر شہادت دے رہی ہیں۔ قرآن نے اسی علت العلل کو "فعال لما یرید"

بتایا ہے اور اس حقیقت کو اس طرح واضح کیا ہے۔ کہ عالم اور عامی دونوں یکساں طور اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

مثلاً شرکت احدیت مآب کے خلاف قرآن مجید یوں فرماتا ہے۔

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ	بھلا کس نے آسمانوں اور
وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ	زمین کو پیدا کیا اور تمہارے
مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً	لئے بادل سے پانی اتارا
فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ	پھر ہم نے اس کے ساتھ
ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا	خوشنما باغ اُگائے۔ تمہارے
كَانَ لَكُمْ اَنْ	لئے (ممکن) نہ تھا کہ ان کے
تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا	درختوں کو اُگاتے۔ کیا اللہ تعالیٰ
ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ	کے ساتھ (کوئی اور) معبود بھی
هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ	ہے بلکہ یہ ایسے لوگ ہیں۔ جو
اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ	ایک طرف جھک گئے ہیں
قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ	بھلا کس نے زمین کو قرارگاہ
اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا	بنایا، اور اس کے اندر دریا
رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ	بنائے، اور اس کے لئے پہاڑ
الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ط	بنائے اور دو دریاؤں کے
ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ	درمیان روک بنائی۔ کیا اللہ
لَا يَعْلَمُوْنَ اَمَّنْ يُّجِيْبُ	کے ساتھ (کوئی اور) معبود ہے۔
الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ	بلکہ ان میں سے اکثر علم نہیں
وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ	رکھتے۔ بھلا کون بیقرار کی فریاد
يَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ	کو پہنچتا ہے جب وہ اسے پکارتا ہے۔
الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ	اور مصیبت کو دور کرتا ہے اور تمہیں

قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ؕ
اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ
الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ
الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ
رَحْمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَى
اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ اَمَّنْ
يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ
وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ
وَالْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ
قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ
قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ
اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَمَا يَشْعُرُوْنَ
اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ بَلِ ادّٰرَكَ
عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ بَلْ
هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا
بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ؑ
(النّمل) ٢٧: ٦٠-٦٦

زمین میں حاکم بناتا ہے۔ کیا اللہ کے
ساتھ (کوئی اور) معبود ہے۔ تم بہت ہی
کم نصیحت قبول کرتے ہو۔ بھلا کون
تمہیں خشکی اور تری کی تاریکیوں میں
رستہ دکھاتا ہے۔ اور کون اپنی رحمت
کے آگے آگے ہواؤں کو خوشخبری دیتے ہوئے
بھیجتا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ (کوئی
اور) معبود ہے۔ اللہ اس سے بلند ہے
جو وہ (اس کے ساتھ) شریک ٹھہراتے ہیں
بھلا کون مخلوق کو پہلے پیدا کرتا ہے۔ پھر
اسے لوٹاتا رہتا ہے۔ اور کون تمہیں آسمان اور
زمین سے رزق دیتا ہے۔ کیا اللہ کے ساتھ
(کوئی اور) معبود ہے کہہ اپنی روشن دلیل لاؤ
اگر تم سچے ہو۔ کہہ جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے
سوائے اللہ کے کوئی غیب کو نہیں جانتا اور وہ
نہیں جانتے کہ کب اٹھائے جائیں گے۔ بلکہ
آخرت کے پانے سے ان کا علم پیچھے رہ گیا۔
بلکہ وہ اس کے متعلق شک میں ہیں۔ بلکہ
وہ اس سے اندھے ہیں۔

بحث کے اس پہلو کو ختم کرنے سے پہلے ایک بات کہنی چاہتا ہوں۔ اگر مقصد مذہب یہ ہے کہ انسان کو خدا کے متعلق صحیح علم حاصل ہو۔ اور اس طرح اس کی رہنمائی کی جائے کہ وہ خالق کائنات کی مشیئت کے مطابق

زندگی بسر کر سکے۔ اور انسان خود اس کی مشیئت کا جزوِ اعظم ہے۔ تو میری رائے میں یہ بات نہایت ضروری ہے۔ بلکہ نبی کا سب سے بڑا فرض یہی ہے۔ کہ وہ مذہب کی صداقتوں کو ایسے سلیس اور عام فہم پیرایہ میں بیان کر دے۔ اور ہر طبقہ کے لوگ ان سے یکساں فائدہ اٹھا سکیں۔

مغرب میں مادیت نے مذہب کی روح نکال کر اسے لاشہ بیجان بنا دیا ہے۔ کیونکہ ایک طرف تو مغرب کے مذہب میں فقدانِ عقل و منطق تھا۔ دوسری طرف ہر ایک بات تحکمانہ رنگ میں منوائی گئی۔ لیکن سائنس نے عین وقت پر کام کیا۔ اس نے دہریت کے سیلاب کو روک دیا۔ جس نے قصرِ مسیحیت کو متزلزل کر دیا تھا۔ لیکن نبی کریمؐ نے اپنا کام تکمیل کو پہنچا دیا۔ اور اثبات واجب الوجود اسی پیرایہ میں کیا۔ جس طرح آج سائنس نے کیا۔

اگر میں حقائقِ مذہبی پر تفصیلی اقتباسات قرآن مجید سے پیش کروں۔ تو نفس مضمون سے دور جا پڑوں گا لیکن قرآن شریف نے ہستی باری تعالےٰ کا جو ثبوت پیش کیا ہے۔ اس کے متعلق دو چار باتیں ضرور کہوں گا۔ الٰہیاتِ جدیدہ میں خدا کی ہستی کے ثبوت میں اس میں نظام ابلغ کو پیش کیا جاتا ہے۔ جو کائنات میں نظر آتا ہے۔ نیز اشیاء مادی میں جو باہمی ارتباط ہے۔ اور اس کی پیدائش میں جو ایک خاص غرض نظر آتی ہے۔ جس کی سائنس تصدیق کرتی ہے۔ یہ سب کی سب ہستیٔ باری تعالےٰ کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اس طرز استدلال میں سائنس بھی الٰہیات کا معاون ہے۔ لیکن قرآن مجید نے صدہا برس پہلے اس دلیل کو ایک ہی رکوع میں تفصیلی طور پر بیان کر دیا ہے۔

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ	"اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے اس
لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ	کے سوا کوئی معبود نہیں وہ بے انتہا رحم والا
الرَّحِيْمُ اِنَّ فِيْ خَلْقِ	بار بار رحم کرنے والا ہے۔ آسمانوں اور
السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ	زمین کی پیدائش میں اور رات اور
وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ	دن کے ادل بدل میں اور کشتیوں میں
وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ	جو سمندر میں چلتی ہیں کہ اس کے ساتھ
فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ	لوگوں کو نفع دیں۔ اور پانی میں جو اللہ
وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ	بادل سے اتارتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ

مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ	زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ
بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ	کرتا ہے اور اس کے اندر ہر قسم کے جانور
كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ	پھیلاتا ہے۔ اور ہواؤں کے ہیر پھیر میں
وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ	اور بادل میں جو آسمان اور زمین کے
بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ	درمیان کام میں لگایا گیا ہے۔ ان لوگوں
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ	کے لئے یقینی نشان ہیں جو عقل سے کام
(البقرہ ۲: ۱۶۳-۱۶۴)	لیتے ہیں"

ان آیات پر غور کیجئے۔ ان میں صحیفۂ فطرت کے اندر ایک نظام اور مقصد دونوں کی طرف اشارہ موجود ہے۔ دن اور رات کی تبدیلی سے جس سے موسم میں تغیر ہوتا ہے۔ ہواؤں میں تبدیلی ہوتی ہے۔ اس سے بارشیں آتی ہیں۔ اور ان سے خزاں اور برسات بالترتیب پیدا ہوتی ہیں۔ یعنی فطرت مردہ ہو کر دوبارہ زندہ ہو جاتی ہے۔ یہ سب باتیں اس ایک بات پر منحصر ہیں۔ کہ کرۂ ارضی اپنی گردش گاہ میں ایک خاص طرف جھکی ہوئی ہے تو کیا یہ انتظام محض اتفاقی یا ہنگامی ہے؟ کیا سب باتیں ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں نہیں ہیں؟ ہر شے اپنے دائرہ میں عمل کرتی ہے۔ لیکن بایں ہمہ دوسروں کے ساتھ اتحادِ عمل بھی موجود ہے جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے۔ "یہ باتیں زمین کو اس کی وفات کے بعد دوبارہ زندہ کرتی ہیں" یہ تمام حقائق حال ہی میں دریافت ہوئے ہیں۔ لیکن قرآن میں پہلے سے موجود ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کتاب اللہ ہے۔ اور یہ باتیں ایسے وقت قرآن میں آئیں جبکہ ساری دنیا جہالت میں مبتلا تھی۔ کیا یہ سب کی سب باتیں لغو اور مہمل ہیں؟ کائنات پر نظر ڈال کر دیکھ لو۔ ایک چیز بھی ایسی نہ ملے گی۔ جو ہماری حیات سے متعلق نہیں ہے۔ سب اشیاء میں ایک نظام اور مقصد پوشیدہ ملے گا۔ اس لئے خدا فرماتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا	"جو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور اپنی
وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ	کروٹوں پر یاد کرتے رہتے ہیں اور
وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ	آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں
وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ	فکر کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے رب

هٰذَا بَاطِلًا ج (آل عمران ۳: ۱۹۱) تو نے اسے بے فائدہ پیدا نہیں کیا"

جو باتیں کل تک مہمل معلوم ہوتی تھیں۔ آج ان سب میں ایک مقصد ثابت ہوتا جاتا ہے۔ بیشک ابھی لکھوکہا اشیا ایسی ہیں۔ جن کی ماہیت سمجھنے سے عقولِ انسانی قاصر ہیں۔ لیکن اب تک جو کچھ تحقیقات ہو چکی ہے۔ یعنی جس قدر اشیاء معلوم ہو سکی ہیں۔ وہ سب کی سب ایک مقصد خاص کی تکمیل کے لیۓ بنی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ پس اگر بذریعہ الفاظ قرآن مجھے یہ معلوم ہو جائے۔ کہ نظام شمسی کی موجودہ ترتیب ایک مقصد کے ماتحت ہے۔ اور یہ کہ کائنات کا ہر ذرّہ اس ترتیب کے لیۓ ضروری ہے۔ تو منطق استقرائی کی مدد سے مجھے یہ یقین کرنے کا حق حاصل ہے۔ کہ کائنات کا ہر ذرّہ میرے فائدہ کے لیۓ بنایا گیا ہے۔ اور میں اپنے فائدہ کے لیۓ استعمال کر سکتا ہوں۔ کیونکہ ایک علیم و حکیم طاقت نے جسے اللہ کہتے ہیں۔ اسے میرا محکوم بنا دیا ہے۔ اب اس آیت کو پڑھیے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآىٕبَیْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ط

"اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اوپر سے پانی اتارا پھر اس کے ساتھ تمہارے لیۓ پھلوں سے رزق نکالا، اور کشتیوں کو تمہارے کام میں لگایا تاکہ وہ سمندر میں اس کے حکم سے چلیں اور دریاؤں کو تمہارے کام میں لگایا۔ اور سورج اور چاند کو جو ایک قانون پر چل رہے ہیں۔ تمہارے کام میں لگایا۔ اور رات اور دن کو بھی تمہارے کام میں لگایا۔ اور جو کچھ تم مانگو۔ اس میں سے تمہیں دیتا ہے"

(ابراہیم ۱۴: ۳۲-۳۴)

ان آیات پر غور کیجئے۔ اوران باتوں کو ذہن میں لائیے۔ جو ہم نے اپنی آسائش کے لئے کی ہیں۔ لیکن کیا آپ نے کوئی ترکیب اپنے آرام کے لئے ایسی بھی کی۔ جس میں آپ کو کائنات کی اشیاء سے مدد نہ مل سکی؟ پس کس طرح آپ اس کائنات کو مہمل قرار دے سکتے ہیں؟ الٰہی قانون کی حکومت کے متعلق قرآن شریف فرماتا ہے۔

وَاٰیَةٌ لَّهُمُ الَّیْلُ نَسْلَخُ	"اور ایک نشان ان کے لئے رات ہے
مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ	اس سے ہم دن کو کھینچ لیتے ہیں۔ تو
مُّظْلِمُوْنَ وَالشَّمْسُ	ناگہاں وہ اندھیرے میں رہ جاتے ہیں،
تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا	اور سورج اپنے مقررہ رستے پر چلتا رہتا
ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ	ہے، یہ غالب علم والے کا اندازہ ہے
الْعَلِیْمِ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ	اور چاند کے لئے ہم نے کئی منزلیں مقرر
مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ	کر دیں۔ یہاں تک کہ وہ پھر کھجور کی
الْقَدِیْمِ لَا الشَّمْسُ	پرانی سوکھی شاخ کی طرح ہو جاتا ہے۔
یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ	نہ سورج کو حاصل ہے کہ چاند کی غایت
الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ	کو پہنچے اور نہ رات دن سے آگے
النَّهَارِ وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ	نکلنے والی ہے۔ اور سب (اپنے اپنے)
یَّسْبَحُوْنَ (یٰسین ۳۶: ۳۷-۴۰)	دائرہ میں چل رہے ہیں۔"

ان الفاظ سے تمام نظام شمسی کا ایک الٰہی قانون کے ماتحت ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اور اس ماتحتی پر وہ ضابطہ اور استواری گواہ ہے۔ جو ان تمام اجرام سماوی میں موجود ہے۔ اور وہ ضابطہ اس قدر صحیح ہے۔ کہ ریاضی کے اصولوں کی طرح ان میں بال بھر کا فرق نہیں پڑ سکتا۔ اور اس لئے تصادم باہمی کا امکان بھی نہیں۔ مثال کے طور پر کرۂ ارض کو ہی لے لیجئے۔ ہماری زمین حرارتِ شمسی کا نتیجہ ہے۔ جس نے مختلف ارتقائی منازل طے کر کے موجودہ شکل اختیار کی ہے۔ بعد ازاں بفحوائے قانون ثقل اس نے آفتاب کے گرد اک بیضاوی مدار پر گردش شروع کی۔ اور اس کا محور اس دورہ کی طرف قدرے مائل ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ کل حوادث یا اتفاق کا نتیجہ ہی ہوتا

جیسے کہ اہل دہریت خیال کرتے ہیں۔ تو کیا زمین کے لئے بیضاوی یا مستطیل مدار کی جگہ مدوّر مدار اختیار کرنا ممکن نہ تھا؟ اس کے محور نے بجائے ۲۳½ درجہ کے اپنے مماس پر ۶۷½ درجہ کا زاویہ کیوں نہیں بنایا؟ اور یہ محور مدار سے متوازی بھی ہو سکتا تھا۔ اگر موجودہ صورت کسی غرض خاصہ کے لئے نہ ہوتی۔ تو زمین کوئی اور صورت گردش اختیار کر لیتی۔ اگر قانون ثقل نے زمین کی گردش کو آفتاب کے گرداگرد معیّن کر دیا تھا۔ تو سوال یہ ہے کہ وہ کون سا قانون ہے۔ جس نے زمین کا محور مدار کی جانب جھکا دیا؟ اگر یہ قانون اتفاقی ہے۔ تو اسی کا نام "اجتماع ضدّین" ہے جو عند العقلا محال ہے۔ کیا یہ ممکن ہے۔ کہ "قانون" محض اتفاقی طور پر مقرر اور معیّن ہو جائے۔ قانون تو وہ ہے جس میں تبدیلی نہ ہو۔ لیکن پھر بھی بہت سے تعلیم یافتہ لوگ اس خلاف عقل نظریہ کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں محض اس لئے کہ مشیت ایزدی سے انکار کرنے کا موقعہ ہاتھ آجائے۔

اس لحاظ سے میں ہر ایسے انسان کو دعوت مقابلہ دیتا ہوں جو اپنے مذہب کی عالمگیریت کا مدعی ہے۔ اگر کوئی شخص مجھے اپنے مذہب میں شامل کرنا چاہتا ہے۔ تو پہلے اسے میرے عقاید دینی کا بطلان کرنا چاہیئے اور اس کے بعد عقلی طور پر اپنے عقاید کا اثبات اور یہ دونوں باتیں اس کو اپنی الہامی کتاب کی مدد سے انجام دینی ہوں گی۔ میں ایسے خدا کو مان کر کیا کروں گا۔ جو خود خاموش ہے۔ اور دوسروں کا محتاج ہو۔ عیسائی پادریوں کا فرض ہے۔ کہ وہ سب سے پہلے یسوع کے الفاظ سے خدا کی ہستی ثابت کر دیں۔ اور اس کے بعد ان کی الوہیت مزعومہ کا ثبوت انجیل سے پیش کریں۔ اور انہی کی تعلیم سے کفارہ تجسم اور دیگر رسوم مروجہ کا اثبات کریں۔ مناسب ہے کہ مسیحیت مروجہ کا بانی مبانی خود اپنی صفائی پیش کرے۔ اور پولوس وغیرہ کی مدد کا محتاج نہ ہو۔ جنہوں نے اس کے سیدھے سادے مذہب کو بت پرستی کے رنگ میں رنگین کر دیا۔ علاوہ بریں ہر غیر مسیحی بعض ایسے عقاید رکھتا ہے۔ جو تعلیم مسیح مندرجہ بائبل کے خلاف ہیں۔ پس دوسروں کو دعوت دینے سے پہلے یسوع کو چاہیئے کہ وہ ان غیروں کے عقاید کی بھی تردید فرمائیں۔ مثلاً ایک شخص "تناسخ" کا قائل ہے۔ اور ضرورت وحی نبوّت ملائکہ معاد اور حشر و نشر وغیرہ کا منکر ہے۔ ازلیت مادہ و روح پر ایمان رکھتا ہے۔ یہ باتیں مسیحیت کے ایمان میں داخل ہیں۔ لیکن کیا تمام بائبل میں ان عقاید کفریہ کے بطلان کا مواد مل سکتا ہے تاکہ لوگوں کو مسیحیت قبول کرنے کے لئے آمادہ کیا جا سکے؟ ظاہر ہے تعمیر سے پہلے انہدام عمارت سابقہ ضروری ہے کوئی شخص دوسرا مذہب تو اسی وقت قبول کر سکتا ہے۔ جب اس کا اپنا مذہب اس کی نگاہ میں غلط ثابت ہو۔ میں دعوے

سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ یسوع اور ان کے حواریوں بلکہ ناقص الاستدلال پولوس کے جملہ ملفوظات و اقوال میں کوئی بات ایسی نہیں مل سکتی۔ جو اس ضرورت کو پورا کر سکے۔ اندریں حالات کیا ضرور ہے۔ کہ یوروبین اقوام تبلیغ مسیحیت فی البلاد غیر پر اس قدر رقوم خطیر صرف کریں۔ جب دوسرے لوگ اپنے عقائد کی اشاعت عقل و حکمت کے زور سے کرتے ہیں۔ تو ان کا مقابلہ بھی عقل و حکمت ہی کی رو سے کرنا چاہیئے۔

غیر تعلیمیافتہ اقوام میں تبلیغ مسیحیت کی ناکامی اور تعلیمیافتہ اقوام میں تبلیغ اسلام کی کامیابی مثلاً انگلستان میں بادی النظر میں موجبِ حیرت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس حیرت کو دور کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہے۔ کہ قرآن شریف اور اقوالِ انبیاء کا بامعانِ نظر مطالعہ کیا جائے۔ اس وقت ظاہر ہو گا۔ کہ کلامِ الٰہی اور آنحضرتؐ دونوں نے اپنی تعلیمات کے اثبات میں اور غیر اسلامی تعلیمات کے ابطال میں ہر جگہ منطق اور قوانینِ فطرت سے استدلال اور استشہاد کیا ہے۔ اگرچہ آپؐ کو غیر سامی مذاہب سے مطلق رسمی واقفیت نہ تھی۔ لیکن قرآن نے مسئلہ تناسخ پر بھی سیر کن بحث کی ہے۔ اور اس کے مالہ و ماعلیہ پر استدلالی رنگ میں روشنی ڈالی ہے۔ (ملاحظہ ہو سورۃ یٰسین) علاوہ ازیں الہام و وحی کے مسئلہ کو لیجیے۔ اس کے متعلق بھی قرآن نے سورۃ نحل میں تفصیلی بحث کی ہے۔ اور الہام کی ضرورت کو دلنشین پیرایہ میں ثابت کیا ہے۔ مثلاً کیا انسان کو الہام کی ضرورت ہے؟ مختلف اقوام کو بار بار "الہام" کیوں دیا گیا؟ کتب قدیمہ کے ہوتے ہوئے قرآن شریف کے نزول کی کیا ضرورت تھی؟ الہام کی نوعیت و کیفیت و حالت کیا ہے؟ اور انتخاب کے لئے مواد کثیرہ کی موجودگی میں مخصوص کتب کو تسلیم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور اگر سابقہ کتب محرف ہو چکی تھیں۔ تو کیا ہم خود جھوٹ اور سچ میں امتیاز نہیں کر سکتے تھے؟ غرضکہ اس قبیل کے بہت سے تفصیلی مباحث سورۃ نحل میں موجود ہیں۔ جو غور کرنے والوں کے لئے بمنزلہ غذائے روحانی قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ اور بعض مباحث تو ایسے ہیں۔ جن کی اہمیت اسی زمانہ میں بروئے کار آئی ہے۔ چونکہ میں اس مبحث پر اپنی تالیف موسومہ "ضرورتِ وحی" میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ اظہار خیالات کر چکا ہوں۔ اس لئے ناظرین سے درخواست ہے۔ کہ وہ اس کی طرف رجوع کریں۔ بخوفِ طوالت اس بحث کو من و عن اس جگہ نقل نہیں کیا جا سکتا۔

باب دہم

اسوۂ حسنہ | جملہ ہادیانِ مذاہب میں آنحضرتؐ ہی ایسے قدسی نفس انسان گزرے ہیں۔ جنہوں نے ان تمام اصولوں پر خود عمل کر کے دکھادیا۔ جو آپؐ نے دوسروں کو تلقین فرمائے تھے۔ قرآن میں کوئی حکم ایسا نہیں ہے۔ جس کی تفسیر عملی طور پر آپؐ نے نہ فرمادی ہو۔ دیگر مذاہب میں ہم کو خوش آیند نصائح بکثرت ملتی ہیں۔ اور فلسفۂ اخلاق کے متعلق ناقابلِ عمل نظریئے بھی اکثر بزرگوں نے پیش کئے ہیں۔ لیکن کسی فرد واحد نے ان باتوں پر عمل کر کے نہیں دکھایا۔ لیکن آپؐ اس کُلیہ میں ایک دلپذیر استثناء ہیں۔ جو تعلیم دوسروں کو دی۔ اس پر خود بھی عمل فرمایا۔

واضح ہو۔ کہ کسی میں کسی استعداد کا ہونا اس بات کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔ کہ وہ اپنی استعدادات کو بالفعل پیش کر سکتا ہے۔ اور بعض ہادیانِ طریقت میں بالفرض اگر ارتکاب گناہ کی استعداد نظر نہیں آتی تو چنداں لائق ستائش نہیں۔ کیونکہ ان کے اکتساب میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اور نہ وہ ان لوگوں کے لئے مفید ہو سکتی ہیں۔ جو اخلاقی تعلیمات کی عملی تصویر دیکھنے کے طالب ہیں۔ دوسروں کو عفو اور رحمدلی کی تعلیم دینا نہایت آسان کام ہے۔ کیونکہ محض زبانی تلقین سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا۔ کہ ہم خود بھی ان صفات سے متصف ہیں۔ اس کے ثبوت کا تو صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم اپنی تعلیم پر عمل کر کے دکھادیں۔ علاوہ ازیں جس بات کا خود ہمیں نے تجربہ نہیں کیا۔ وہ ہم دوسروں کو کس طرح سمجھا سکتے ہیں۔ صبر اور تحمل کی تعلیم وہی شخص دے سکتا ہے۔ جس نے مثل آنحضرتؐ یا حضرت مسیح خود تکالیف اور مصائب دنیوی برداشت کئے ہوں۔ مگر فرق دونوں میں یہ ہے۔ کہ مسیح کو دوسری صفات کو عملی جامہ پہنانے کا موقعہ نہیں ملا۔ آنحضرتؐ کو ملا اور خوب ملا۔

دراصل جس نے حوادث و تغیرات زندگی کا تجربہ نہیں کیا۔ وہ دوسروں کے لئے کامل نمونہ بھی نہیں بن سکتا۔ ہر اخلاقی صفت کے اظہار کے لئے بعض مخصوص حالات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جب تک وہ حالات کسی کی زندگی میں رونما نہ ہوں۔ وہ شخص ان صفات سے متصف ہونے کا دعوےٰ نہیں کر سکتا۔ عسرت اور خوشحالی۔ یہ دونوں حالتیں، مختلف صفاتِ ذاتی کے اظہار کے لئے ضروری ہیں۔

آنحضرتؐ یتیمی سے ترقی کرتے ہوئے بادشاہی تک پہنچے۔ اور اس سبب سے آپؐ کی زندگی حالاتِ بوقلموں کا مرقع ہے۔ آپؐ کی زندگی میں مختلف الانواع حالات پیدا ہوئے۔ اور اس لئے آپؐ کو مختلف صفات کے اظہار کا موقع بھی ملا۔ ہر موقعہ پر آپؐ کا امتحان ہوا۔ لیکن آپؐ ہمیشہ پورے ہی اترے۔ چونکہ ہمیں اپنی زندگی کے مختلف شعبوں میں مختلف نمونوں کی ضرورت ہے۔ اور آپؐ کی زندگی میں ہر شخص کے حالات کے مطابق ایک نمونہ موجود ہے۔ اسلئے آپؐ ہی ایک اسوۂ کامل ہیں آپؐ اپنی زندگی میں مختلف حالات سے دوچار ہوئے۔ یتیم، تاجر، ہمسایہ، بیٹا، خاوند، مہاجر، فاتح، قاضی، معلم، جنگ آزما سپہ سالار۔ مدبّرِ ملک۔ بادشاہ۔ مرشد ۔ ہادی۔ ان حالات مختلفہ میں آپؐ کی زندگی ہر قسم کے لوگوں کے لئے کامل نمونہ ہے۔ ہم آپؐ کی خصلت اور کیریکٹر کی عظمت کا اندازہ ان نصائح سے نہیں کرتے جو وقتاً فوقتاً آپؐ کی زبان وحی ترجمان پر جاری ہوئیں۔ بلکہ آپؐ کے اعمال اور افعال سے اور اس لحاظ سے آپؐ تاریخ عالم میں فرد فرید ہیں۔ فقید المثال اور بے نظیر ہیں۔ لیکن اگر کسی شخص کی زندگی میں یہ شان عالمگیریت نہیں پائی جاتی۔ تو وہ عالمگیر اسوہ کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے؟ قطع نظر زندگی کے بلند پہلوؤں سے جنابِ یسوع تو روزمرہ کی زندگی میں بھی نمونہ نہیں قرار دیئے جا سکتے۔

مثلاً صفتِ عفو کے اظہار کے لئے معین حالات کی ضرورت ہے۔ اور ان کی عدم موجودگی میں کوئی شخص اس صفت سے متصف نہیں ہو سکتا۔ فرض کیجئے ایک شخص ہے۔ جس کو اس کے دشمن آج بُری طرح ستا رہے ہیں۔ کل ایسا اتفاق ہوتا ہے۔ کہ وہ مظلوم برسر اقتدار آجاتا ہے۔ اور اسے ان ظالموں سے بدلہ لینے کی قوت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ تو اب اگر وہ چاہے تو صفت عفو کا اظہار کر سکتا ہے۔ محض عفو کی تعلیم دینے سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ "معلم" میں بھی یہ صفت موجود ہے۔ علاوہ بریں اگر کوئی مظلوم حالتِ یاس میں اپنے دشمنوں کو معاف کر دے تو ظالم یا دشمن اس عفو کی مطلق قدر و منزلت نہیں کر سکتے۔ مثلاً صلیب پر لٹکائے جانے کے بعد اگر یسوع نے اپنے دشمنوں کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔ تو بیشک اس سے ان کے دل کی پاکیزگی ضرور ثابت ہوتی ہے۔ لیکن انھیں وہ مواقع نہ مل سکے جو وہ ان دشمنوں پر قدرت حاصل کرنے کے بعد انھیں معاف کرتے۔ اور اس طرح صفتِ عفو کا اظہار ہوتا۔ تاریخ مذاہب میں تو اس بات کی صرف ایک مثال مل سکتی ہے۔ اور وہ آنحضرتؐ ہیں۔ خیال کیجئے آپؐ فاتحانہ انداز میں داخل مکہ ہوتے ہیں۔ کل عرب آپؐ کے زیر نگین آچکا ہے۔ اور اہلِ مکہ تو یکسر آپؐ کے قدموں میں پڑے ہوئے ہیں۔ اگر آپؐ چاہتے تو ان میں سے ہر ایک کا سر تن

سے جدا کر دیتے۔ ان دشمنوں کا جنہوں نے آپؐ کو برسوں رات دن ستایا۔ اور ترک وطن پر مجبور کیا۔ جنہوں نے آپؐ کی تذلیل و توہین میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا تھا۔ اگر آپؐ ان کو قتل کر دیتے تو حق بجانب تھے انبیائے یہود میں سے اکثروں نے اپنے دشمنوں کو قتل کیا۔ سزائیں دیں۔ رامچندر اور کرشن نے بھی اپنے دشمنوں کے ساتھ رحمدلی کا برتاؤ نہیں کیا۔ اور اگر آپؐ مکّہ والوں پر جود و عفو کی بارش نہ فرماتے۔ تو کوئی قابلِ اعتراض فعل نہ ہوتا۔ لیکن شاید صفت عفو قیامت تک پردہ خفا ہی میں رہتی۔

بخاری شریف میں مرقوم ہے۔ کہ آپؐ کے افعال ذاتی اغراض سے کبھی ملوث نہ ہوتے۔ تعلی اور اقتدار ذاتی یا نمود سے آپؐ کو ہمیشہ نفرت رہی۔ جب آپؐ کے دشمن مغلوب ہو کر آپؐ کے سامنے آئے تو آپؐ نے فرمایا "تم لوگ مجھ سے کس قسم کے سلوک کے متمنّی ہو"؟ انھوں نے جواب دیا۔ "آپؐ اخی کریم الطبع اور رحیم النفس ہیں۔" اس پر آپؐ نے فرمایا۔ "آج تم پر کوئی الزام نہیں لگایا جائے گا۔ جاؤ تم لوگ سب آزاد کئے گئے۔" انہیں لوگوں میں سردار قریش عتبہ کی بیٹی ہندہ بھی تھی۔ جو حضورؐ کو ستانے میں کسی متنفس سے پیچھے نہیں رہی تھی۔ بلکہ اسی عورت نے آپؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کا کلیجہ سینہ چاک کر کے نکال لیا تھا۔ اور چبا گئی تھی۔ چونکہ اسکا ضمیر اس وقت اُسپر لعنت کر رہا تھا۔ اس لئے بُرقعہ اوڑھ کر آپؐ کے سامنے گئی۔ تاکہ آپؐ شناخت نہ فرما سکیں۔ لیکن آپؐ نے فوراً پہچان لیا۔ مگر اس ناخوشگوار واقعہ کی طرف مطلق اشارہ نہ فرمایا۔ کیا عفو اور درگزر کرنے کی اس سے بہتر مثال دنیا کے پردہ پر مل سکتی ہے؟ اور یہی وہ عورت ہے۔ جو آگے چل کر پہلے اسلامی بادشاہ کی ماں بنی۔ آپؐ کا دوسرا ایمانی دشمن اسی ہندہ کا خاوند ابوسفیان تھا۔ جس نے آپؐ کے خلاف کئی مرتبہ چڑھائی کی تھی۔ اور ہرقل کے دربار میں بھی آپؐ کے خلاف یاوہ گوئی کی تھی۔ اس لئے بغیر وساطت اسے آپؐ کے سامنے آنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے حضرت عباس اس کے ساتھ آئے لیکن حضورؐ نے نہ صرف اسکا قصور معاف کیا بلکہ اعلان فرما دیا۔ کہ جو شخص ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے گا۔ اس کو معاف کیا جائے گا۔ جبر ابن الاسود نے جو ایک طور سے آپؐ کی بیٹی کی وفات کا موجب تھا۔ فتح مکّہ کے بعد ایران بھاگ جانے کا فیصلہ کیا۔ مگر آپؐ کے اس طرز عمل کو دیکھ کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر یوں گویا ہوا۔ "یَا نَبِیَّ اللّٰہِ میں ایران بھاگا جا رہا تھا۔ لیکن آپؐ کی شفقت اور مہربانی نے مجھے آپؐ کے پاس آنے کی جرأت دلائی۔ آپؐ نے میرے متعلق جو کچھ سنا ہے۔ وہ سب سچ ہے۔ میں اپنے قصوروں کا اعتراف کرنے آیا ہوں۔" حضورؐ نے اسے معاف کر دیا (اصابہ)

عکرمہ ابنِ ابوجہل جو مثل اپنے باپ کے آپؐ کا جانی دشمن تھا۔ بعد فتح مکہ یمن کی طرف بھاگ گیا لیکن حضورؐ کے عزمِ عمل کو دیکھ کر اس کی زوجہ یمن جا کر اسے واپس لے آئی۔ اور دوسرے دن آپؐ کی خدمت میں اسے حاضر لائی قبل اس کے کہ وہ حضورؐ کو سلام کرے۔ آپؐ نے خود بڑھ کر معانقہ فرمایا۔ اور کہا "اے مہاجر! یوطن واپس آمدن مبارکباد۔" جدید اور قدیم تہذیبوں کے صفحات الٹ جاؤ۔ جس قوم اور ملک کی تاریخ چاہو۔ از اوّل تا آخر پڑھ جاؤ۔ تم کو اس طرح کی کوئی مثال کسی شخص کی نہ ملے گی۔ جس نے آنحضرتؐ کی طرح جس نیکی کا وعظ کیا۔ اس پر خود بھی عملدرآمد کر کے دکھا دیا۔

اس جگہ میں آپؐ کے فرمان انسدادِ انتقامِ خونی کا ذکر بھی کر دوں تو نامناسب نہ ہوگا۔ جس کا رواج ماقبلِ اسلام ہر جگہ ملک عرب میں موجود تھا۔ اگر کوئی شخص کسی کو قتل کر دیتا تھا۔ تو کئی نسلیں گزر جانے کے بعد بھی قاتل کے قبیلہ کے لوگوں کو قتل کر کے دل ٹھنڈا کیا جاتا تھا۔ اور ایسا کرنے میں وہ حق بجانب سمجھے جاتے تھے۔ آپؐ کے ایک بھائی کو جس کا نام ابن ربیع تھا۔ بچپن میں قبیلۂ بنی لیث کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ اس کو بچپن ہی میں قبیلۂ بنو ہزیل کے بعض افراد نے قتل کر دیا تھا۔ اس کے خون کا ہنوز قصاص نہیں لیا گیا تھا۔ اس لئے اس کا حق آپؐ کو پہنچا۔ آپؐ نے اپنے آخری وعظ میں مجملہ دیگر باتوں کے یہ بھی فرمایا۔ "آج سے خونی انتقام کی رسم جو زمانۂ جاہلیت میں عام تھی۔ بند کی جاتی ہے۔ اور حارث کے بیٹے ابن ربیع کا خون اس کے دشمنوں کو معاف کیا جاتا ہے۔"

اگر قرآن شریف میں اخلاق کی جزئیات تک بیان کر دی گئی ہیں۔ اور اس کے نرم و گرم دونوں پہلوؤں کو واضح کر دیا گیا ہے۔ تو نبی کریمؐ کی زندگی میں ان سب کی تصاویر اصلی حالت میں دکھا دی گئی ہیں۔ حالتِ یتیمی سے لے کر بادشاہی تک آپؐ مختلف حالات میں ہو کر گزرے۔ اور زندگی کے ہر شعبہ کا تجربہ حاصل کیا۔ اور ان تمام حالات سے متعلق فرائض منصبی کو بھی بوجہِ احسن ادا کیا۔ اس لئے آپؐ بجا طور پر "اسوۂ حسنہ" ہیں حضورؐ والا کو طفل، نوجوان، متاہل انسان، تاجر، بیٹا، باپ، خاوند، سپاہی، سپہ سالار، مہاجر، مظلوم، مغلوب، غالب، قاہر، بادشاہ، ہمسایہ، فاتح، قاضی، مفتی، مقنن، مرشد، ہادی غرضکہ مختلف حیثیات سے دیکھیں ہر حیثیت میں آپؐ بنی نوعِ آدم کے لئے "اسوہ حسنہ" ہی ثابت ہوں گے۔ ان تمام حالات میں آپؐ نے یکساں طور پر شرافتِ ذاتی کا اظہار فرمایا۔ کبھی آپؐ کے مزاج میں تغیر اور تلوّن رونما نہ ہوا۔ نہ آپؐ کی طرز زندگی

میں کوئی تبدیلی پیدا ہوئی۔ پس اُن ہادیوں کے متعلق کیا رائے قائم کی جائے۔ جو اپنے آپ کو انسانیت کے معمولی درجہ سے بلند تر نہ ثابت کر سکے۔ خواہ ہم کسی طریق کے پابند کیوں نہ ہوں۔ آپؐ کی زندگی ہمارے لئے بہرحال سبق آموز ہے۔ اور ہر پریشانی میں اس سے رہنمائی اور تسلی مل سکتی ہے۔ نیز آپؐ کا یہ منشاء بھی نہیں۔ کہ ہم اپنے افعال اور خیالات میں دوسروں کا غلامانہ اتباع کریں۔ آپؐ نے "آزادی رائے" کی ہمیشہ عزت فرمائی ہے۔ اور اسی لئے آپؐ نے وسیع پیمانہ پر اخلاق اصول قائم فرمائے۔ تاکہ ہم لوگ حسب ضرورت ان سے اپنے موافق جزئیات مستنبط کر سکیں۔

آپؐ کی زندگی قرآن شریف کی جیتی جاگتی تفسیر ہے۔ ہمیں قرآنی احکام کی تفہیم کے لئے مختلف مفسروں کی کتب کی ورق گردانی کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ آپؐ کی زندگی میں ان سب کی مثالیں موجود ہیں۔ اوامر اور نواہی دونوں قسم کے احکام قرآنی پر آپؐ نے عمل پیرا ہو کر دکھا دیا۔ چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہؓ جب کسی کو قرآن کی کسی آیت کا مطلب سمجھاتی تھیں۔ تو اس کی تفسیر یا تائید آپؐ کے اقوال و افعال سے کر دیتی تھیں۔ اور اگر کسی معاملہ میں نبی کریمؐ کے طرزِ عمل کو لوگ آپؐ سے دریافت کرتے تھے۔ تو وہ قرآن کی مخصوص آیات تلاوت فرما دیتی تھیں۔ اور ایک دفعہ انہوں نے ہی یہ فرمایا تھا۔ "کَانَ خُلُقُہٗ قرآن" اور ان کی اتباع میں اکثر مفسرین نے بھی ایسا ہی کیا ہے اور کہ قرآنی اوامر و نواہی کی تفسیر کو آپؐ کے اقوال و افعال سے مؤید کیا ہے۔ قرآن میں پانچسو سے اُوپر احکام پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان سب کی مثالیں آپؐ کی زندگی میں مل سکتی ہیں۔

جو مثالیں عفو کی اوپر بیان ہوئیں۔ وہ سچ مچ قرآنی آیات متعلقہ عفو کی تفسیر کہی جا سکتی ہیں۔ اسی طرح قرآن شریف میں غلاموں کو آزاد کرنے کے متعلق یہ حکم ہے۔ "خدا کی محبت میں اپنی دولت ان غلاموں کو آزاد کرنے میں صرف کرو۔ جنہیں لڑائی میں گرفتار کیا گیا ہو"۔ اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے دشمنوں سے محبت کرنے کا عملی سبق دیا ہے۔ اور حضورؐ نے سب سے پہلے اس آیت پر بھی عمل کر کے دکھا دیا۔ بخوفِ طوالت آئندہ صرف انہی قرآنی آیات کی عملی تصاویر دکھاؤں گا۔ جن پر عمل کرنے کے لئے غیر معمولی اور فوق العادت لیاقت ذاتی کی ضرورت ہونی چاہیئے۔

ایفائے عہد

مومنوں کی شناخت یہ بھی ہے۔ کہ وہ اپنے معاہدات کی پابندی کرتے ہیں (۸:۲۳) اور جب وعدہ کرتے ہیں۔ تو اسے وفا کرتے ہیں (۱:۵)

اگر اس حکم کی پابندی ہر شخص اپنا شعار بنالیتا تو آج دنیا کا اور ہی نقشہ ہوتا۔ لیکن آنحضرتؐ نے اس اصول پر بطرزِ احسن عمل کر کے دکھا دیا۔ باب ششم میں چند مثالیں پیش کی جا چکی ہیں۔ جو عیسائی مشنریوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہیں۔ اور اس لائق ہیں۔ کہ عیسائی حکومتیں ان کو ہر دم سامنے رکھیں۔ تاکہ وہ ان مواعید کا احترام کر سکیں۔ جن کی خلاف ورزی ان کا شعار عام ہو چکا ہے۔ آپؐ نے بھی بحیثیت بادشاہ دشمنوں سے معاہدات کئے۔ جنہوں نے آپؐ کے سامنے ایسی کڑی شرطیں پیش کیں۔ جو آپؐ کے مقاصد کو بعید نقصان پہنچانے والی تھیں لیکن آپؐ نے ان کو تسلیم کیا۔ اور ایسے نازک حالات میں ان کی پابندی کی۔ جبکہ مدبرین یورپ کو ان سے انحراف کرنے میں مطلق باک نہ ہوتا۔ جنگ بدر کے موقعہ پر مسلمانوں کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ آپؐ کے دو ساتھی پیچھے رہ گئے انھیں دشمنوں نے روک لیا۔ اور اس شرط پر رہائی دی۔ کہ ان کے خلاف جنگ میں شریک نہ ہوں۔ جب یہ لوگ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور اس واقعہ کا تذکرہ کیا۔ تو آپؐ نے انھیں اہل مکّہ کے مقابل شرکت جنگ سے ہمیشہ باز رکھا حالانکہ اس وقت ایک ایک شخص ایک ایک دستہ کے برابر وقیع تھا۔

انصاف پسندی

یہ امر ایفائے عہد سے بھی زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ جب فریقین میں سے ایک فریق اپنا دشمن ہو۔ اور دوسرا دوست۔ لیکن قرآن شریف فرماتا ہے۔ یقیناً اللہ انصاف کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی فریق کی معاندانہ روش تم کو جادۂ انصاف سے منحرف کر دے۔ خبردار انصاف کو مدنظر رکھو۔ کیونکہ معدلت تقوےٰ سے قریب ہے (۱۶ : ۹۰ - ۵ : ۸) لیکن آنحضرتؐ نے اس پر من وعن عمل کر کے دکھا دیا۔

قبیلۂ مخزوم کی اِک عورت، علّت سرقہ میں گرفتار ہوئی۔ اس کے اعزا نے اُسامہ ابنِ زیدؓ سے آپؐ کی خدمت میں سفارش کرنے کی درخواست کی۔ حالانکہ آپؐ ابن زیدؓ کا بہت خیال فرماتے تھے۔ لیکن اس موقعہ پر آپؐ نے فرمایا۔ "اسامہ! کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری خوشنودی کے لیۓ اللہ تعالےٰ کے احکام سے روگردانی کروں" اس کے بعد آپؐ نے مجلس عام میں یوں تقریر فرمائی۔ "تم لوگوں سے پہلے بہت سی قومیں صرف اسی وجہ سے تباہ ہوگئیں کہ انہوں نے غریبوں کے معاملات میں قانون ملکی کو سخت طریقہ میں برتا۔ اور امیروں کے لیۓ اس کو ملائم کر دیا۔ خدا کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہؓ چوری کا ارتکاب کرے۔ تو اس کے ہاتھ بھی اسی طرح کٹوائے جائیں گے" (بخاری)

اپنی وفات سے چند روز پہلے آپؐ نے اعلان فرمایا۔ کہ اگر آپؐ کے ذمّہ کسی کا کچھ آتا ہو تو بے تکلف طلب کرے۔

اگر کسی کو کبھی جانی یا مالی نقصان آپؐ کے ہاتھ سے پہنچا ہو۔ تو آپؐ کی جان اور مال دونوں اس کی مرضی پر چھوڑ دیئے جائیں۔ کل جماعت خاموش تھی۔ ایک شخص چند درہم کا متقاضی ہوا۔ فوراً وہ رقم قلیل ادا کر دی گئی۔ (ابن اسحاق)

ایک مرتبہ آپؐ مالِ غنیمت تقسیم فرما رہے تھے۔ ایک جماعت آپؐ کے گرد تھی۔ اس اثناء میں ایک شخص نے اپنے بدن کا سارا بوجھ آپؐ پر ڈال دیا۔ آپؐ نے ایک پتلی سی چھڑی سے اسے ہٹا دیا۔ لیکن چھڑی کی نوک سے اس کے چہرے پر ایک خفیف سی خراش آ گئی۔ آپؐ نے فوراً اس سے فرمایا "مجھ سے انتقام لے سکتے ہو۔" اس نے کہا "یا رسول اللہ! میں نے بطیبِ خاطر آپؐ کو معاف کیا۔" (ابن داؤد)

آپؐ ہر شخص کے ساتھ خواہ وہ امیر ہو یا غریب اعلیٰ یا ادنیٰ خادم یا مخدوم یکساں سلوک فرماتے تھے سلمانؓ۔ صہیبؓ اور بلالؓ یہ لوگ آزاد کردہ غلام تھے۔ لیکن ان کے ساتھ وہی برتاؤ ہوتا تھا۔ جو کسی بڑے سے بڑے قریشی سردار سے۔ ایک مرتبہ سلمانؓ۔ بلالؓ اور ابو سفیان زعیم قریش تینوں ایک ہی جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ سلمانؓ اور بلالؓ نے آپس میں کہا۔ کہ ہماری تلوار نے ابھی تک ابو سفیان کو نیچا نہیں دکھایا۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان سے کہا۔ تم لوگوں کو یہ جرأت کس طرح ہوئی۔ کہ سردار قریش کے حق میں ایسی بات کہتے ہو؟ اسکے بعد انہوں نے آنحضرتؐ سے یہ واقعہ بیان کیا۔ آپؐ نے فرمایا "میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ کہ تمہارے اس اعتراض سے ان لوگوں کی دل آزاری تو نہیں ہوئی۔ اگر ہوئی تو یقیناً تم سے خدا ناراض ہے۔" ابوبکرؓ فوراً ان لوگوں کے پاس آئے اور کہا "بھائیو! کیا میرے اعتراض سے آپ کی دل آزاری ہوئی؟ انھوں نے کہا "نہیں ہم آپ سے مطلق ناراض نہیں ہیں۔ عفاک اللہ" (مسلم)

حج ادا کرنے سے پہلے قریش لوگ مزدلفہ نامی اک جگہ پر قیام کرتے تھے۔ اور اس جگہ کو انہوں نے اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا۔ کیونکہ بوجہ غلوئے نسب عامۃ الناس کے ساتھ مل کر بیٹھنے کو معیوب جانتے تھے نبی کریمؐ نے اس امتیاز کو کبھی روا نہ رکھا۔ نبوت سے پہلے اور بعد میں بھی آپؐ عام لوگوں کے ساتھ ہی اس جگہ قیام فرماتے تھے۔ اور کبھی کوئی آرام دہ جگہ اپنے لئے مخصوص نہ فرمائی۔ آپؐ فرماتے تھے۔ کہ جو شخص مزدلفہ میں پہلے پہنچ جائے۔ اسے اچھی سے اچھی جگہ منتخب کرنے کا حق حاصل ہے (مسند ابن حنبل)

صفتِ ایثار

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا (الدھر ۷۶:۸)

"اور اس کی محبت کی وجہ سے مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔"

وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِن قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (الحشر ۵۹:۹)

"اور وہ جو ان سے پہلے (ہجرت کے) گھر میں رہتے اور ایمان رکھتے تھے وہ اس سے محبت کرتے ہیں۔ جو ہجرت کر کے ان کی طرف آتا ہے۔ اور اپنے سینوں میں اس کی کوئی حاجت نہیں پاتے جو انہیں دیا جاتا ہے۔ اور وہ اپنے آپ پر (انہیں) مقدم رکھتے ہیں۔ گو انہیں تنگی ہی ہو اور جو شخص اپنے نفس کے بخل سے بچ جائے۔ تو وہی کامیاب ہوں گے۔"

حضورؐ کی زندگی میں صفت ایثار، اک نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ آپؐ اپنے بچوں سے بیحد محبت فرماتے تھے جب کبھی حضرت فاطمہؓ آپؐ سے ملنے آتی تھیں۔ تو آپؐ اپنی الفت قلبی کے اظہار کے لئے ان کی تعظیم کھڑے ہو کر فرماتے تھے۔ اور اپنی جگہ بٹھاتے تھے۔ لیکن آپؐ کی بیٹی کے گھر میں کوئی خادمہ نہ تھی۔ وہ خود ہی آٹا پیستی تھیں۔ اور خود ہی کنوئیں سے پانی لاتی تھیں۔ بعض اوقات آپؓ کے ہاتھ پاؤں میں درد ہونے لگتا تھا۔ وہ اپنی تکلیف آنحضرتؐ سے بیان کرنی چاہتی تھیں۔ لیکن ہمت نہ ہوتی تھی۔ ایک دن حضرت علیؓ نے موقعہ پا کر آنحضرتؐ سے عرض کی۔ کہ اگر فلاں کنیز جو فلاں جنگ میں گرفتار ہو کر آئی ہے۔ فاطمہؓ کے لئے دے دی جائے۔ تو انھیں بڑی آسائش ہو جائے گی۔ آپؐ نے فرمایا "ابھی تک اصحابِ الصُّفّہ کے لئے کوئی تسلی بخش انتظام نہیں ہو سکا۔ اور جب تک اس طرف سے اطمینان نہ ہو جائے۔ اس وقت تک میں کسی طرف توجہ نہیں کر سکتا۔" (ابن داؤد)

ایک مرتبہ ایک عورت نے ایک چادر آپؐ کی خدمت میں پیش کی۔ آپؐ نے اس تحفہ کو قبول فرمایا۔ کیونکہ اس وقت آپؐ کو ضرورت بھی تھی۔ جب آپؐ زیب تن فرما چکے۔ تو ایک شخص نے کہا "کیسی اچھی چادر ہے"! یہ سنتے ہی آپؐ نے وہ چادر اسے عنایت کر دی۔ لوگوں نے اس شخص کو ملامت کی۔ کہ تم جانتے ہو کہ نبی کریمؐ کو اس وقت چادر کی ضرورت تھی۔ اور یہ بھی کہ حضورؐ کسی کا سوال رد نہیں فرماتے۔ پھر تم نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے جواب دیا۔ "ہاں میں یہ دونوں باتیں جانتا ہوں۔ لیکن میں نے بغرض حصولِ برکت ایسا کیا۔ میں وصیت کر جاؤں گا۔ کہ مرنے کے بعد اس چادر کا مجھ کو کفن دیا جائے اور اسی میں دفن کیا جاؤں" (بخاری)

ملکِ عرب میں باغات، نہایت قیمتی جائداد خیال کئے جاتے ہیں۔ ایک شخص نے آپؐ کو سات باغات تحفہ میں پیش کئے۔ آپؐ نے اس جائداد کو مصرفِ خیر کے لئے وقف فرما دیا۔ اور ان کی آمدنی ہمیشہ فقراء اور مساکین پر تقسیم کر دی جاتی تھی (اصابہ)

ایک شخص نے نکاح کیا۔ لیکن اس کے پاس دعوتِ ولیمہ کے لئے کوئی چیز نہ تھی۔ آپؐ نے فرمایا "عائشہؓ کے پاس جاؤ۔ اور ان سے ایک بوری آٹا لے آؤ"۔ چنانچہ وہ شخص حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے بوری کی بوری اٹھا کر اس کے حوالہ کر دی۔ حالانکہ شام کو کھانے کے لئے آپؐ کے پاس اور کچھ بھی نہ تھا (مسند ابن حنبل)

ایک مرتبہ قبیلۂ بنو غفار کا ایک شخص آپؐ کا مہمان ہوا۔ آپؐ کے پاس شام کے کھانے کے لئے صرف تھوڑا سا بکری کا دودھ تھا۔ وہ تو آپؐ نے مہمان کی نذر فرمایا۔ خود گرسنہ ہی سو رہے (مسند ابن حنبل)

خوش معاملگی

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا	"اور جب تم ماپو تو ماپ کو پورا کرو"۔
(بنی اسرائیل ۱۷: ۳۵)	
اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا	"اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کو ادا کرو"۔
(النسآء ۴: ۵۸)	

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۙ

"اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس رکھنے والے ہیں۔"

(المؤمنون ۲۳ : ۸)

اگرچہ آنحضرتؐ بوجہ فراخ دلی ہمیشہ مقروض ہی رہتے تھے۔ حتّٰے کہ وفات سے قبل آپؐ کی زرہ ایک مہاجن کے پاس ایک من اناج کے بدلے گرو تھی۔ تاہم معاملات میں آپؐ نہایت استوار رہتے تھے۔ مدینہ میں مالدار طبقہ صرف یہود کا تھا۔ اور جب کبھی آپؐ کو ضرورت پڑتی تھی۔ تو انھیں سے قرض لیتے تھے۔ آپؐ کا زمانہ ماقبلِ نبوّت خود آپؐ کی خوش معاملگی پر ایک روشن دلیل ہے۔ اسی لئے قریش نے آپؐ کو "الامین" کا لقب دے دیا تھا۔ یہ لقب آپؐ سے پہلے کسی کو نہیں دیا گیا۔ ایک تاجر صائب نامی آپؐ کی خدمت میں مشرّف بہ اسلام ہونے کے لئے آیا۔ لوگوں نے تعریفی الفاظ کے ساتھ اس کا تعارف کرایا۔ آپؐ نے فرمایا "میں ان کو تم لوگوں سے بہتر جانتا ہوں۔" اس پر اس نے کہا۔ "روحی فداك یا رسول اللہ! آپؐ میرے شریک تجارت رہے ہیں۔ اور تجارتی معاملات میں آپؐ نہایت صاف اور ایماندار تھے۔" (ابن داؤد)

ایک دفعہ آپؐ نے ایک اونٹ کسی سے مستعار لیا۔ جب آپؐ نے واپس کیا۔ تو اس سے اچھّا اونٹ اس کو دیا۔ اور کہا۔ "اچھے لوگ وہ ہیں جو خوبی کے ساتھ اپنا قرضہ ادا کرتے ہیں۔" (ترمذی)

ایک دفعہ ایک بدّو نے جس کے آپؐ مقروض تھے تقاضاء کیا بدوی بالطبع دُرشت اور بدمزاج ہوتے ہیں۔ پس اس نے نالائم الفاظ میں اپنا روپیہ طلب کیا۔ صحابہؓ نے اُسے سرزنش کی اور کہا۔ "تم جانتے ہو۔ کہ کس شخص سے گفتگو کر رہے ہو۔" اس نے کہا۔ "ہاں بخوبی جانتا ہوں۔ لیکن میں نے طلبِ رقم کے علاوہ اور کوئی بات تو نہیں کی ہے۔" اس پر آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا۔ "تمہیں تو اس کی طرفداری کرنی چاہیئے۔ کیونکہ وہ حق پر ہے۔" (ابن ماجہ)

ایک بدّوی اونٹ کا گوشت بیچ رہا تھا۔ آپؐ نے اس خیال میں کہ گھر میں تھوڑی سی کھجوریں رکھی ہیں۔ ان کے مبادلہ میں گوشت کا ایک ٹکڑا طے فرمالیا۔ جب گھر میں جاکر دیکھا تو معلوم ہوا۔ کہ کھجوریں خرچ ہو چکی ہیں۔ آپؐ نے باہر آکر اس بدّو سے معذرت فرمائی۔ وہ چلّا اٹھا۔ "تم بے ایمان ہو۔" صحابہؓ نے اس سے کہا۔ "کیا تم مخبوط الحواس ہو گئے ہو۔ آنحضرتؐ اور بے ایمانی! ع

عہ۔ ایں خیال ست و محال است و جنوں

آپؐ نے انھیں روکا اور فرمایا "کہنے دو اُسے حق ہے" آپؐ نے دوبارہ معذرت فرمائی۔ اس نے پھر انھیں الفاظ کا اعادہ کیا۔ صحابہؓ اسے خاموش کرنا چاہتے تھے۔ لیکن حضورؐ نے فرمایا "اُسے جو جی میں آئے کہنے دو۔ وہ حق پر ہے۔" تب آپؐ نے اس سے فرمایا "اچھا تم فلاں خاتون کے پاس چلے جاؤ وہ تم کو مقررہ کھجوریں دے دیں گی۔" چنانچہ وہ گیا۔ اور جب کھجوریں لے کر لوٹا۔ تو نبی کریمؐ وہیں تشریف فرما تھے۔ آپؐ کی خوش معاملگی نے اس کے دل پر ایسا گہرا نقش کیا تھا۔ کہ وہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور پکار اٹھا۔

"اے محمد! جزاک اللہ تعالیٰ احسن الجزاء تم نے پوری قیمت دی۔ اور بہتر معاوضہ"۔

ایک دفعہ ایک قافلہ مدینہ کے نواح میں خیمہ زن ہوا۔ اونٹوں میں ایک اونٹ لال رنگ کا تھا۔ آنحضرتؐ ادھر سے گزرے۔ اور اس اونٹ کی قیمت دریافت کی۔ لوگوں نے قیمت بتائی۔ آپؐ نے اُسے منظور کرلیا۔ جب آپؐ اونٹ سمیت کچھ دور نکل گئے۔ تو ان لوگوں کو خیال آیا۔ کہ مشتری اجنبی ہے۔ بغیر قیمت لیئے مال دے دینا قرین مصلحت نہیں ہے۔ لیکن قافلہ میں ایک خاتون تھی اس نے کہا "واللہ ہم نے اس سے پہلے کبھی ایسا منور چہرہ نہیں دیکھا۔ کوئی غم کی بات نہیں ہے۔" یعنی جس کا چہرہ اس قدر نورانی ہوگا۔ وہ دغا نہ کرے گا۔ شام کے وقت آپؐ نے اس اونٹ کی قیمت کی کھجوریں مالک کے پاس بھیج دیں۔

(دار قطنی)

جنگ حُنین کے موقعہ پر آپؐ کچھ ہتھیار خریدنا چاہتے تھے۔ صفوان کے پاس جو اس وقت غیر مسلم تھا۔ اس وقت بہت سامان حرب موجود تھا۔ آپؐ نے کچھ زرہیں عاریتاً لینی چاہیں۔ اس نے کہا "اے محمد! کیا تم مجھے ٹھگنا چاہتے ہو؟ خوب شد۔ میری زرہیں استعمال کرو۔ اور خراب کر کے مجھے واپس کر دو۔ مفت ہی کام نکالنا چاہتے ہو۔" آپؐ نے فرمایا "میں قرض نہیں لیتا۔ مستعار لیتا ہوں۔ اور اگر کوئی زرہ خراب ہوگئی تو اس کی قیمت ادا کر دوں گا۔ غرضکہ آپؐ نے چالیس زرہیں لے لیں۔ جنگ کے خاتمہ پر چند زرہیں کم ہوگئیں۔ آپؐ نے صفوان سے کہا "چند زرہیں کم ہو گئی ہیں۔ ان کی پوری قیمت بخوشی ادا کر دوں گا۔" لیکن اس نے کہا "یا رسول اللہ! اب قیمت دینے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ میرے خیالات میں تبدیلی ہو گئی ہے۔ اب میں مسلمان ہوں۔ یعنی اب میں آپؐ کا غلام ہوں" (ابو داؤد)

جب کوئی جنازہ بغرضِ نماز لایا جاتا تو آپؐ نماز پڑھنے سے قبل تحقیق فرما لیتے۔ آیا متوفیؓ یا متوفیہؓ مقروض تو نہیں ہے۔ اگر مقروض ہوتا تو آپؐ صحابہؓ کو نماز ادا کرنے کا حکم دیتے اور خود ادا فرماتے۔

عدمِ احساس نمود

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ "کہہ میں صرف تمہاری طرح بشر ہوں۔"

(الکہف ۱۸ : ۱۱۰)

(۲) آنحضرتؐ دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے۔ آپؐ ہر قسم کے جسمانی کاموں میں صحابہؓ کے ساتھ برابر کے شریک ہوا کرتے تھے۔ مکّہ سے ہجرت کے بعد آپؐ کو سب سے مقدّم فکر مسجد کی تھی۔ چنانچہ اس مسجد کی تعمیر میں جو بعد ازاں "مسجد نبوی" کے لقب سے مُلقّب ہوئی۔ آپؐ نے عام مزدوروں کے ساتھ شرکتِ کار فرمائی۔ اور اینٹیں سر پر ڈھو ڈھو کر لائے۔ صحابہؓ نے ہر چند منع کیا۔ مگر آپؐ نے ایک نہ مانی۔ وہ لوگ ہزاروں طرح سے سمجھاتے۔ "ارواحنا فداک یا رسول اللہ! آپؐ ہمارے ہوتے ہوئے کیوں تکلیف فرماتے ہیں؛ آخر ہم لوگ کس لئے ہیں؛" مگر آپؐ برابر ان کے ساتھ مشغول رہے۔

جنگ احزاب میں جب خندقوں کے کھودنے کی ضرورت ہوئی۔ تو آپؐ نے مزدوروں کی طرح کام کیا۔ یہاں تک کہ آپؐ کے جسد مبارک پر گرد کی تہ جم گئی (بخاری)

ایک مرتبہ بعض صحابہؓ شریک سفر تھے۔ چونکہ زادِ راہ ساتھ نہ تھا۔ لہٰذا صحابہؓ نے کھانا پکانے کا انتظام کیا۔ جب تقسیم کار ہوئی۔ تو آپؐ نے سوختہ لانے کا کام اپنے ذمّہ لیا۔ صحابہؓ نے عرض کی "حضور! ہم لوگ خود ہی اس کام کو انجام دے سکتے ہیں۔" آپؐ نے فرمایا "ہاں میں جانتا ہوں۔ لیکن میں اپنے آپ کو تم لوگوں سے بالاتر نہیں سمجھتا جب شریک طعام ہوں گا۔ تو شریک کار ہونا بھی ضروری ہے۔ اور خدا بھی اس شخص کو پسند نہیں کرتا۔ جو اپنے آپ کو اپنے احباب سے بالاتر سمجھتا ہے۔" (زرقانی)

جنگ بدر میں آپؐ کے پاس بہت تھوڑے اونٹ تھے۔ اور اسی لئے ایک اونٹ پر تین تین سپاہی سوار تھے۔ اور باری باری چڑھتے تھے۔ نبی کریمؐ بھی دو صاحبین کے ساتھ شریک تھے۔ وفادار صحابہؓ اپنی اپنی باری آپؐ کو دینا چاہتے تھے۔ اور کہتے تھے۔ حضور! آپؐ تشریف فرما رہیں۔ ہم آپؐ کی خاطر پیدل چلنے

کو تیار ہیں"۔ لیکن آپؐ ہمیشہ یہی کہتے تھے۔" میرا خیال ہے کہ میں تم لوگوں سے زیادہ پیدل چل سکتا ہوں۔ علاوہ بریں نعماءِ الٰہیہ کے حصول کا تم سے زیادہ خواہشمند ہوں۔ پس میں سب لوگوں کے ساتھ پیدل بھی چلوں گا۔ اور سوار بھی ہوں گا۔" (مسند ابن حنبل)

(ب) آپؐ مبالغہ آمیز تعظیم کو ناپسند فرماتے تھے:۔

شرک کی بناء عموماً یہ ہوتی ہے۔ کہ لوگ مقدّس نفوس کی شان میں مبالغہ آمیز الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ نبی کریمؐ اس حقیقت سے باخبر تھے۔ اس لئے آپؐ نے فرمایا "میری شان میں ایسے الفاظ مت کہو۔ جیسے نصاریٰ مریمؑ کے متعلق استعمال کرتے ہیں۔ میں صرف عبداللہ اور رسول اللہ ہوں۔" (بخاری)

قیس بن سعد روایت کرتے ہیں۔ کہ حرا میں میں نے دیکھا۔ کہ لوگ اپنے سردار کو سجدہ کرتے ہیں۔ واپس آکر انھوں نے آنحضرتؐ سے اس کا تذکرہ کیا۔ اور تجویز پیش کی۔ کہ آپؐ اس سردار سے زیادہ لائق مسجودیت ہیں۔ آپؐ نے فرمایا۔ "کیا میری وفات کے بعد میری قبر کو سجدہ کرو گے"؟ انھوں نے کہا "نہیں" تب آپؐ نے فرمایا۔ "تو میری زندگی میں مجھے سجدہ کرنے کی کیا ضرورت ہے"؟ (ابن داؤد)

ایک مرتبہ آپؐ معوذ ابن عفرا کے یہاں اس کی بیٹی کے نکاح میں تشریف لے گئے۔ اور اس جگہ تشریف فرما ہوئے۔ جو عروس کے لئے مہیّا کی گئی تھی۔ لڑکیاں آپؐ کے گرد جمع ہو گئیں۔ اور وہ مرثیہ پڑھنے لگیں۔ جس میں شہداء بدر کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک لڑکی نے آپؐ کی تعریف میں چند اشعار پڑھنا شروع کئے جن کا پہلا مصرع یہ تھا۔ "فینا نبیٌّ یعلم مافی غدٍ" یعنی ہم میں اس وقت وہ رسول موجود ہے جو کل کی بات جانتا ہے۔ آپؐ نے یہ مصرع سن کر فرمایا۔ اس کو چھوڑ دو۔ اور وہی گاؤ جو تم پیشتر گا رہی تھیں۔

شرم و حیا نرمئ طبع اور انکسار پس یہ خدا کا فضل ہے "کہ تم ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرو"۔[1] (آل عمران ۳: ۱۵۹) "زمین پر اتراتے ہوئے مت چلو"[2] (بنی اسرائیل ۱۷: ۳۷)

---

[1] فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ [2] وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ (النور ۲۴: ۳۰)

"مومنوں کو کہہ دو اپنی نظریں نیچی رکھا کریں"۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ (الاعراف ۷: ۳۳)

"کہہ میرے رب نے صرف بیحیائی کی باتوں کو حرام کیا ہے"۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا (الفرقان ۲۵: ۶۳)

"اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر انکساری سے چلتے ہیں"۔

صحاح میں مرقوم ہے۔ کہ حضورؐ کنواری لڑکیوں سے بھی زیادہ شرمگین تھے۔ اور آپؐ کے ہر قول اور فعل سے شرم و حیا کا اظہار ہوتا تھا۔ آپؐ نے کبھی درشت کلامی نہیں کی۔ اور راستہ میں ہمیشہ چپ چاپ چلتے تھے۔ آپؐ نے کبھی زور سے قہقہہ بھی نہیں مارا بلکہ تبسم ہی پر اکتفا کی۔ اور دوسروں کے جذبات کا اس درجہ احترام تھا۔ کہ کبھی کسی بات پر اظہار تنفر نہیں فرمایا۔ ہاں دوسروں کے افعال پر پسندیدگی یا ناپسندیدگی کی کیفیت آپؐ کے چہرے ہی سے ظاہر ہو جاتی تھی۔

عربوں میں "حیا" کوئی قابلِ تعریف بات نہیں خیال کی جاتی تھی۔ برہنہ ہو کر نہانا ان کی عادت تھی۔ اور اکثر اوقات کعبہ کا طواف بھی اسی حالت میں ہوتا تھا۔ لیکن نبی کریمؐ بیحیائی کو بیحد ناپسند فرماتے تھے۔ آپؐ نے لوگوں سے پوچھا "کیا تم لوگ حمام میں نہاتے ہو"؟ انہوں نے کہا۔ "ہاں! وہاں نہانے سے میل دور ہو جاتا ہے۔ اور بیماری چلی جاتی ہے"۔ آپؐ نے فرمایا "لیکن برہنہ ہو کر مت نہاؤ"۔ خاص عرب میں تو حمام تھے نہیں۔ لیکن سرحدی مقامات پر ضرور موجود تھے۔ اسی لیے آپؐ نے فرمایا "جب تم لوگ ایران فتح کرنے جاؤ۔ راہ میں حمام ملیں گے لیکن قمیص پہن کر داخل ہونا"۔

حمص کی چند عورتیں امّ سلمہؓ کے پاس آئیں۔ انہوں نے ان کی جائے رہائش دریافت کی۔ جواب دیا "حمص"۔ انھوں نے کہا۔ "کیا تم وہ عورتیں ہو جو ننگی ہو کر نہاتی ہو"؟ انھوں نے کہا "کیا حمام میں جا کر برہنہ ہو کر نہانے میں کوئی حرج ہے"؟ انھوں نے کہا۔ میں نے رسول اللہؐ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جو عورت اپنے گھر کے علاوہ اور کہیں برہنہ ہو۔ خدا کی نظر میں ذلیل ہو جاتی ہے۔

ابو داؤد میں مرقوم ہے۔ کہ اگرچہ آپؐ نے حمام میں نہانے سے منع فرمادیا تھا۔ لیکن مردوں کو اس شرط پر اجازت دے دی تھی۔ کہ ننگے ہوکر نہ نہائیں۔ عورتوں کو بہرحال ممانعت فرمائی ہے (بخاری)

معاذ ابن جبل جو شہر مدینہ کی ایک مسجد میں نماز پڑھاتے تھے۔ طویل سورتیں تلاوت کرنے کے عادی تھے ایک شخص نے آپؐ سے اس بات کی شکایت کی۔ کہ وہ اس قدر طویل سورتیں پڑھتے ہیں۔ کہ میں ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھ سکتا۔ آپؐ بیحد ناراض ہوئے۔ اور ابو مسعود کہتے ہیں۔ کہ میں نے آپؐ کو اس سے زیادہ ناراض کبھی نہیں دیکھا آپؐ نے فرمایا" بعض لوگ غلطی سے دوسروں کے قلوب میں مذہب کی طرف سے تنفر پیدا ہونے کا باعث ہوجاتے ہیں۔ لازم ہے کہ تم میں جو شخص نماز پڑھائے۔ وہ چھوٹی سورتیں تلاوت کرے۔ کیونکہ جماعت میں کمزور بھی ہوتے ہیں۔ اور ضعیف بھی" (بخاری)

تعزیری معاملات میں آپؐ بیحد محتاط تھے۔ اور حتے الوسع عفو کو کام میں لاتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر کسی جرم کا اقبال کیا۔ اور سزا برداشت کرنے کے لیئے آمادگی ظاہر کی۔ آپؐ خاموش ہورہے۔ حتےٰ کہ نماز ظہر کا وقت آگیا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد اس نے پھر عرض کی" جو سزا از روئے شرع مجھ پر عاید ہوتی ہے جاری فرمادیجئے" آپؐ نے فرمایا" نماز پڑھی"؟ اس نے جواب دیا" ہاں" اس پر آپؐ نے فرمایا۔ "خدا نے تمہارا قصور معاف کردیا" (بخاری)

آپؐ اپنے متبعین پر غیر ضروری قیود کبھی عاید نہ فرماتے تھے۔ اور حد شرع جاری کرنے میں بھی آپؐ نرمی اور کمی تکلیف کا خیال رکھتے تھے۔ بخاری میں مرقوم ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر کسی جرم کا اقبال کیا۔ اور سزا کا طالب ہوا۔ آپؐ نے فرمایا" ایک غلام آزاد کردو۔ اس نے جواب دیا" میرے پاس کوئی غلام نہیں" آپؐ نے فرمایا" دو ماہ تک روزے رکھو" اس نے کہا" مجھ میں اس قدر سکت نہیں ہے"۔ آپؐ نے فرمایا" ساٹھ بھوکوں کو کھانا کھلاؤ" اس نے کہا" مجھے مقدور نہیں" آپؐ خاموش ہورہے۔ تھوڑی دیر میں ایک شخص ایک ٹوکرا کھجوروں کا آپؐ کی خدمت میں لایا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا" وہ شخص موجود ہے"؟ اس نے جواب دیا" حاضر ہوں" آپؐ نے فرمایا" یہ کھجوریں مساکین میں تقسیم کردو"۔ اس نے کہا" یارسول اللہ! میرے برابر مکہ بھر میں کوئی نادار نہیں ہے" آپؐ نے تبسم فرمایا۔ اور کہا" اچھا یونہی سہی۔ جاؤ اپنے خاندان والوں میں تقسیم کردو"۔ سبحان اللہ!

ستائش سے نفرت

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ	"ہرگز خیال نہ کرو کہ جو لوگ اس پر خوش
بِمَآ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا	ہوتے ہیں۔ جو انہوں نے کیا اور پسند کرتے
بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ	ہیں کہ اس کے لئے ان کی تعریف کی جائے
بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ	جو انہوں نے نہیں کیا یہ ہرگز بھی خیال نہ
(آل عمران ۳: ۱۸۸)	کرو۔ کہ وہ عذاب سے نجات پا گئے"

اپنی تعریف و ستائش کرنے سے حضورؐ کو دلی نفرت تھی۔ اور کبھی گوارا نہ کرتے تھے۔ کہ کوئی شخص آپؐ کی شان میں ستائش آمیز کلمات کہے۔ ایک مرتبہ چند لوگ سرگرم گفتگو تھے، بہ سبیل تذکرہ ایک شخص کے متعلق تعریفی الفاظ استعمال ہوئے۔ آپؐ نے فرمایا "تم اس شخص کو ذبح کر ڈالا۔ اگر کسی کے متعلق کچھ کہو تو یوں کہو۔ میرا خیال ہے" (مسند ابن حنبل)

ایک دفعہ اسود ابن سریع نے آپؐ کی خدمت میں آکر عرض کی۔ کہ میں نے خدا اور رسول کی شان میں چند اشعار تصنیف کئے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا "بیشک خدا کو ساری تعریفیں سزاوار ہیں" اسود نے قصیدہ خوانی شروع کی۔ اسی اثناء میں کوئی شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ نے اسود کو خاموش کر دیا۔ جب وہ چلا گیا۔ تو انہوں نے پھر شروع کیا۔ وہ شخص پھر وارد ہوا۔ آپؐ نے پھر اسود کو خاموش کرا دیا۔ غرضکہ تین مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ اسود نے کہا۔ حضورؐ یہ کون شخص ہے۔ جس کی وجہ سے آپؐ نے مجھ کو اتنی مرتبہ خاموش کر دیا؟ آپؐ نے جواب دیا۔ "یہ وہ شخص ہے۔ جو بیکار بات سننی پسند نہیں کرتا" (بخاری)

شائستگی

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ	"اور تو یقیناً بلند اخلاق رکھتا ہے"
(القلم ۶۸: ۴)	

ایک شخص عباس ابن شراحیل ایک دفعہ بحالت گرسنگی بزمانۂ قحط سالی مدینہ کے ایک باغ میں داخل ہوا۔

کہ چند پھل توڑ کر بھوک کا علاج کرے۔ اس نے کچھ تو کھا لئے۔ اور کچھ جیب میں رکھ لئے۔ قضارا باغ کے مالک نے چوری کرتے دیکھ پایا۔ فوراً پکڑ لیا اور بہت مارا۔ اور پھل چھین لئے۔ اور کپڑے اتار لئے۔ عباس حضورؐ کے پاس فریادی ہو کر آیا۔ آپؐ نے مالک کو بلایا۔ اور فرمایا "یہ نوجوان نادانستگی کی وجہ سے اس فعل کا مرتکب ہوا تمہیں چاہیئے تھا۔ کہ اسے متنبہ کر دیتے۔ کہ یہ باغ فلاں شخص کی ذاتی ملک ہے۔ اور چونکہ بھوکا تھا۔ اس لئے اسے کھانا کھلانا ضروری تھا۔ تم نے تو اس بیچارے کے کپڑے بھی اتار لئے" مالکِ مذکور نے کپڑے واپس کئے اور حضورؐ نے اسے ۳۰ سیر اناج عطا کیا۔

ایک دفعہ کوئی شخص حضورؐ سے ملنا چاہتا تھا۔ صحابہؓ سے اطلاع کی درخواست کی۔ آپؐ نے فرمایا "اگرچہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ تاہم آنے دو" جب وہ آپؐ کے سامنے آیا۔ تو آپؐ نے اس کے ساتھ بہت عمدہ سلوک فرمایا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ اس بات سے متعجب ہوئیں۔ آپؐ نے ان کے استعجاب کو دیکھ کر فرمایا "خدا کی نظر میں وہ شخص بدترین خلائق ہے۔ جو انسانوں کے ساتھ اس قدر درشت مزاجی سے پیش آئے۔ کہ وہ اس سے نفرت کرنے لگیں" (ابوداؤد)

ایک مرتبہ حضورؐ چند صحابہؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ اس اثناء میں آپؐ کی رضاعی والدہ کا خاوند آپؐ سے ملنے آیا۔ آپؐ نے اپنی چادر کاندھے سے اتار کر اس کا ایک کونہ اس کے لئے بچھا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی ماں آئی۔ آپؐ نے دوسرا کونہ اس کے لئے بچھا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کا سالا آیا۔ آپؐ کھڑے ہو گئے۔ اور اسے اپنی جگہ پر بٹھایا (ابوداؤد)

ایک مرتبہ آپؐ کچھ گوشت مساکین میں تقسیم فرما رہے تھے۔ اس اثناء میں ایک عورت آپؐ سے ملنے آئی۔ آپؐ فوراً گوشت چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور حتی الوسع اس کی مدارات فرمائی۔ جب وہ چلی گئی۔ تو لوگوں نے پوچھا۔ آپؐ نے فرمایا۔ "وہ میری رضاعی ماں تھی"۔ (ابوداؤد)

باب یازدہم

مجموعۂ حسنات قلت گنجائش کی وجہ سے میں آپؐ کی سیرت مبارکہ کے مختلف پہلوؤں پر مفصل بحث نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ امر واقعی ہے۔ کہ تاریخِ عالم میں آپؐ کے علاوہ اور کوئی شخصیت ایسی نہیں دکھائی دیتی جو مجموعۂ حسنات ہو۔ یا جس پر یہ شعر صادق آسکے۔

حُسنِ یوسف دمِ عیسیٰ یدِ بیضا داری ۔۔۔ آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اور اس خصوصیت کی وجہ نے آپؐ کی شخصیت فوق العادت ہو گئی تھی۔ آپؐ کی سادگی، تحمل، فیاضی، کفایت شعاری، انسانیت، عالی حوصلگی، استقلال فی الافلاس حلم فی الاقتدار، عجز فی العظمت، شفقت علی الحیوانات، رافت علی الاطفال، جرأت و دلیری، علو ہمت، نصفت پسندی وغیرہ کو مفصل طور پر بیان کرنے کے لئے ضخیم مجلدات درکار ہیں۔

آنحضرتؐ کے خصائل و عادات و اطوار کا مفصلہ ذیل نقشہ میں نے مشہور یورپ اسلامی عالم و فاضل امام حجۃ الاسلام غزالیؒ کی تصنیف سے ماخوذ کیا ہے۔ کہیں کہیں میں نے اپنی طرف سے بھی کوئی بات بڑھادی ہے۔ بیشک اس اقتباس میں بعض مقامات پر اعادۂ ماسبق بھی کیا گیا ہے۔ لیکن اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اگر یورپ کے وہ لوگ جو اسلام کے متعلق مستند سمجھے جاتے ہیں۔ انصاف سے کام لیتے تو حضورؐ کی سیرت پر انھیں قلم اٹھانے کے لئے صحیح اطلاعات اور معتبر مواد کافی مل سکتا تھا۔ لیکن ان کی نیت کچھ اور ہی تھی۔ اور اس لئے وہ امام غزالیؒ سے کیوں استفادہ کرتے؟ ان کا مطلب تو واقدی جیسوں کی تصانیف ہی سے حل ہو سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اسی کی تصانیف کو پیش نظر رکھا ہے۔ امام موصوف لکھتے ہیں۔

"آپؐ سب لوگوں سے زیادہ حلیم زیادہ بہادر زیادہ شریف اور زیادہ پرہیز گار تھے۔ زر نقد کبھی آپؐ نے دوسرے دن کے لئے اٹھا کر نہ رکھا۔ اور اگر رات ہو گئی۔ اور کوئی رقم آپؐ کے پاس بچ رہی تو آپؐ جب تک اسے فقراء میں تقسیم نہ فرما لیتے مکان پر واپس نہ آتے۔ نعماء الٰہیہ میں سے آپؐ اپنی ذات کے لئے وہی خرچ کرتے تھے۔ جو ناگزیر تھا۔ اور وہ بھی سادہ قسم کا مثلاً جَو اور کھجوریں۔ جو شخص آپؐ سے کچھ طلب کرتا بے تامل عطا فرماتے۔ سالانہ محاصل

بھی محتاجوں کے لئے وقف تھے۔ کیونکہ آپؐ اپنی ضروریات پر فقرا کی ضروریات کو ترجیح دیتے تھے۔ اور اگر سال گزرنے سے قبل آپؐ کی آمدنی کُل خرچ ہو جاتی۔ تو آپؐ اپنے ہاتھ سے اپنی کفش کی مرمت فرماتے۔ گھر کا کام کاج کرتے۔ اور انتظام خانہ داری میں ازواج کی امداد فرماتے۔ آپؐ سب لوگوں سے زیادہ شرمگیں تھے۔ کسی کی طرف گھور کر نہ دیکھتے ہمیشہ نیچی نگاہ رکھتے تھے۔ بزرگوں کے ساتھ تہذیب اور غریبوں کے ساتھ شفقت اور مغروروں کے ساتھ تمکنت سے پیش آنے کی وجہ سے ہر شخص آپؐ کا مداح تھا۔ ایک مرتبہ جب کہ آپؐ مکّہ کے ایک معزز آدمی کے ساتھ مذہبی گفتگو فرما رہے تھے۔ آپؐ نے ایک غریب نابینا کی طرف اپنی توجہ مبذول نہ فرمائی اللہ تعالےٰ نے آپؐ کو نصیحت فرمائی (عبس ۸۰) کیونکہ وہ اندھا بھی صداقت مذہبی حاصل کرنے کے لئے آیا تھا۔ بعدازاں جب کبھی آپؐ اس اندھے کو دیکھتے تھے۔ تو فوراً اس سے معانقہ فرماتے۔ اور یوں گویا ہوتے کہ یہ آدمی لائق صد تکریم ہے۔ اس کی وجہ سے میرے خدا نے مجھے نصیحت فرمائی۔ آپؐ نے اس شخص کو دو مرتبہ مدینہ کا حاکم بھی مقرر فرمایا۔" (ولیم میور)

آپؐ احرار اور غلاموں دونوں کی دعوت بخوشی قبول فرما لیتے۔ اور ادنےٰ سے ادنےٰ تحفہ بھی پسند فرماتے خواہ وہ دودھ کا ایک پیالہ ہوتا یا خرگوش کی ایک ران اور ان کے عوض میں دوسروں کو تحفے عنایت فرماتے۔ جو چیز سامنے آتی تناول فرما لیتے۔ لیکن صدقہ کی چیزوں سے احتراز فرماتے۔ آپؐ ہمیشہ غلاموں کی دعوت پر ان کے ساتھ تشریف لے جاتے۔ خدا کے معاملات میں آپؐ کو ضرور غصہ آجاتا تھا۔ لیکن اپنے نفس کے لیے کبھی کسی پر ناراض نہ ہوتے۔ خواہ آپؐ کو اپنے اور اپنے احباب کے مفاد کو قربان ہی کیوں نہ کرنا پڑتا۔ لیکن اعلان حق سے آپؐ باز نہ رہتے۔ ایک مرتبہ بعض کفّار نے دوسرے کفّار سے بدلہ لینے کے لئے آپؐ کی امداد کرنی چاہی۔ لیکن آپؐ نے اسے منظور نہ کیا۔ اور فرمایا کہ میں امداد کفّار کو روا نہیں رکھ سکتا۔ حالانکہ اس وقت آپؐ کے ساتھی اس قدر تھوڑے تھے۔ کہ ان میں ایک متنفس کا اضافہ بھی اہمیت رکھنے کا موجب ہو سکتا تھا۔ رفع گرسنگی کے لئے آپؐ اپنے شکم پر پتھر باندھ لیتے تھے۔ جو چیز سامنے آتی بشوق تناول فرما لیتے تھے۔ اور اگر کھجوریں بغیر دودھ کے ملتیں یا گوشت یا روٹی یا شیرینی کی چیزیں مثلاً شہد یا دودھ ملتا تو بھی شوق سے کھا لیتے آپؐ نے اپنی تمام عمر مسلسل تین دن تک روٹی نہیں کھائی اس وجہ سے نہیں۔ کہ آپؐ خسیس تھے یا محتاج بلکہ ضبط نفس مدنظر تھا۔ اکثر آپؐ گرسنہ ہی رہتے تھے۔ مہینوں آپؐ کے گھر میں آگ نہ جلتی تھی۔ اور یہ حالت اس زمانہ میں تھی۔ جب آپؐ مدینے میں برسر حکومت تھے۔ اپنے ہاتھ سے

پیوند لگا لیتے۔ اور بکریوں کا دودھ آپؐ خود دوہتے۔

شادیوں میں بخوشی شرکت فرماتے۔ مریضوں کی عیادت فرماتے۔ جنازوں کے ہمراہ جاتے۔ اور ادنےٰ آدمیوں کے یہاں جاکر ان کی ہمدردی فرماتے۔ دشمنوں میں تن تنہا چلے جاتے۔ اور بغیر اظہار مباہات، مہمان داری میں دوسروں سے بڑھ جاتے۔ ہر شب دو چار دوستوں کو کھانے کے لئے مدعو فرما لیتے۔ بحالتِ افلاس کبھی مہمان نوازی سے باز نہ رہتے۔ آپؐ فصیح تھے۔ مگر کلام میں طوالت نہ تھی۔ ہمیشہ خندہ پیشانی رہتے۔ زیادہ تر آپؐ خاموش رہتے تھے لیکن جب کلام فرماتے۔ تو بہت زور اور سنجیدگی کے ساتھ۔ چنانچہ آپؐ کے ارشادات سامعین کے قلوب میں کالنقش فی الحجر ہو جاتے تھے۔ حیا اور رافت، صبر اور تحمل، ایثار اور فیاضی یہ صفات تمام عمر آپؐ کے اقوال اور افعال سے ظاہر ہوتی تھیں۔ دنیاوی معاملات سے آپؐ کبھی متفکر نہیں ہوئے۔ جو لباس ملتا زیب تن فرما لیتے، کبھی ادنےٰ عمامہ کبھی یمنی چادر، کبھی سوتی ٹوپی۔ آپؐ کے دائیں یا بائیں ہاتھ کی چھنگلیاں چاندی کی انگشتری پڑی رہتی تھی۔ جس میں محمد رسول اللہ تین سطروں میں لکھا ہوا تھا۔ خچر، گھوڑا، گدھا یا اونٹ جو جانور ملتا۔ اس پر بخوشی سوار ہو جاتے۔ بعض اوقات آپؐ ننگے پاؤں بغیر ٹوپی عمامہ اور چادر پہنے دولت کدہ سے دور مریضوں کی عیادت کے لئے تشریف لے جاتے۔ خوشبو سے الفت اور بدبو سے نفرت تھی۔ آپؐ زہاد سے بیحد مانوس تھے۔ اور عموماً غریبوں کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ شائستہ لوگوں کی قدر فرماتے۔ اور ان سے رسم و راہ کر کے قلوب اغیار کو مسخر فرماتے۔ قابل رحم لوگوں کے ساتھ بلا امتیاز اقرباء سلوک حسنہ فرماتے تھے۔ آپؐ نے کبھی کسی پر ظلم نہیں کیا۔ اور جس نے معافی چاہی فوراً عطا فرمائی بلکہ جانی دشمنوں کے ساتھ بھی آپؐ کا طرز عمل رحمدلانہ ہوتا تھا۔ اگرچہ دشمنان ملک کے معاملہ میں آپؐ بیحد سخت تھے۔ لیکن فتح مکہ کے بعد دشمنوں کی سابقہ تکالیف، استہزاء، دشنام، سب و شتم غرضکہ ساری باتیں آپؐ نے اپنے دل سے بھلا دیں۔ اور بدترین مجرم کو بھی معاف فرما دیا۔ تکلیف میں بھی سوائے سچ کے اور کوئی بات آپؐ کے منہ سے نہیں نکلی۔ آپؐ تبسم فرماتے۔ قہقہہ لگا کر نہیں ہنستے تھے۔ جائز مشاغل میں شرکت فرماتے۔ کبھی ان کی تحقیر نہ کی۔ کبھی کبھی آپؐ اپنے دوستوں کے ساتھ دوڑتے تاکہ معلوم ہو کون زیادہ تیز دوڑ سکتا ہے۔ بعض اوقات لوگ آپؐ کی موجودگی میں اونچی آواز سے بولنے لگتے۔ تاہم آپؐ چشم پوشی فرماتے۔ آپؐ کے پاس بہت سی بکریاں اور اونٹ تھے۔ جن کا دودھ آپؐ اور آپؐ کے عیال استعمال کرتے تھے۔ آپؐ کے یہاں غلام اور کنیزیں بھی تھیں۔ جن کو آپؐ نے آزاد کر دیا تھا۔ اور ہمیشہ ان کو اپنے ساتھ کھلایا۔ اور جیسا خود پہنا ویسا ہی ان کو پہنایا۔ کوئی لمحہ ایسا نہ گزرتا تھا جس میں آپؐ خدا

کے لئے یا اپنے نفس کی بہتری کے لئے کوئی کام یا بات نہ کرتے ہوں۔ آپؐ اپنے متبعین کے باغات میں بھی تشریف لے جاتے تھے۔ اور کسی شخص کو اس کی مفلسی کی وجہ سے حقیر خیال نہ فرماتے تھے۔ نہ کسی مالدار آدمی کی ثروت سے مرعوب ہوتے تھے۔ بلکہ ان دونوں حالتوں کو خدا تعالےٰ کی مشیت سے منسوب فرماتے تھے۔ غرضکہ خدا نے آپؐ کو بہترین اخلاق اور برترین اصول عطا فرمائے تھے۔ آپؐ اُمّی محض تھے۔ اور ایک تاریک ملک میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن خدا نے آپؐ کو اعلےٰ ترین صفات عنایت کی تھیں۔ جس کی محافظت آپؐ پر ہوتی۔ اس کے مفاد کے بہترین محافظ اور نگہبان ہوتے۔ آپؐ کی گفتگو نہایت دلچسپ اور شیریں ہوتی تھی۔

آپؐ جس کسی مسلمان کو نصیحت یا تنبیہ فرماتے۔ تو اس کے لئے دعا کرتے کہ الٰہی اس پر رحم فرما۔ آپؐ نے کبھی کسی عورت یا خادم کو برا بھلا نہیں کہا۔ ایک دفعہ دورانِ جنگ میں لوگوں نے آپؐ سے کہا۔ کہ دشمنوں کے حق میں بددعا کیجئے۔ آپؐ نے فرمایا۔ "میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں نہ کہ بددعا کرنے کے لئے۔" چنانچہ آپؐ نے ہمیشہ مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لئے دعا ہی کی۔

آپؐ نے سوائے جہاد فی سبیل اللہ کے اور کسی موقعہ پر کسی کے خلاف تلوار نہیں اٹھائی۔ اور ذاتی طور پر کسی سے انتقام نہیں لیا۔ مگر اس وقت جبکہ کسی نے خدا تعالےٰ کی شان میں گستاخی کی۔ دو صورتوں میں آپؐ ہمیشہ آسان صورت کو پسند فرماتے تھے۔ بشرطیکہ وہ منجر بضلالۃ نہ ہو۔ اور کسی تعلق روحانی کو منقطع نہ کرتی ہو۔ کیونکہ آپؐ کو یہ دونوں پسند نہ تھیں۔ جب کبھی کوئی غلام یا کنیز آپؐ کی خدمت میں امداد کی طالب ہوتی۔ آپؐ دریغ نہ فرماتے اور نے غلام بھی آپؐ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے آقا کے پاس لے جاتا۔ تاکہ اس کی شکایت کا ازالہ فرمایا جائے۔ انسؓ کا قول ہے۔ "خدا کی قسم جس نے نبی کریمؐ کو صداقت عطا کر کے بھیجا۔ خواہ میرے کسی فعل سے آپؐ ناراض ہو جاتے۔ لیکن زبان سے کچھ نہ فرماتے۔" آپؐ کو بستر کی مطلق پرواہ نہ تھی۔ اگر بستر موجود ہوا تو اس پر آرام کر لیا۔ ورنہ زمین ہی پر سو گئے۔ آپؐ جس شخص سے ملتے، پہلے سلام کرتے۔ اور جب کوئی شخص آپؐ کو اپنا نمایندہ بناتا تو جب تک فریق ثانی معاملہ کو ختم نہ کرتا۔ آپؐ برابر شریک کار رہتے۔ جب کسی شناسا سے ملتے۔ تو پہلے مصافحہ فرماتے۔ اور گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ پکڑتے خواہ آپؐ بیٹھے ہوتے یا کھڑے۔ اور جب تک دوسرا آدمی اپنا ہاتھ نہ کھینچتا۔ آپؐ نہ چھوڑتے۔ اور جب تک وہ رخصت نہ ہوتا آپؐ توقف فرماتے۔

خدا کا نام ہمیشہ وردِ زبان تھا۔ بحالتِ نماز اگر کوئی شخص آپؐ سے ملنے آتا۔ آپؐ فوراً نماز مختصر فرماتے

اور اس سے ملاقات کرتے۔ اور جب اس سے فراغت پاتے تو پھر نماز میں مشغول ہو جاتے۔ عموماً آپؐ پاؤں سمیٹ کر بیٹھتے تھے۔ خصوصاً جبکہ اور لوگ بھی ہوتے۔ آپؐ کی نشست کا طریقہ دوسروں سے جداگانہ نہ تھا۔ جہاں جگہ ملتی وہیں بیٹھ جاتے۔ احباب کے ساتھ آپؐ پاؤں پھیلا کر نہ بیٹھتے تھے۔ مبادا زیادہ جگہ گھیر لیں۔ ہاں جگہ ہوتی تو پاؤں پھیلاتے۔ آپؐ مریضوں کی عیادت کے لئے جاتے اور جنازوں کی مشایعت فرماتے۔ جو شخص آتا اس سے بہ تواضع پیش آتے۔ خواہ وہ رشتہ دار ہوتا یا غیر۔ اور اس کے آرام کا حتےالوسع خیال فرماتے۔ راہ میں مساکین کی تکالیف سننے کے لئے رک جاتے۔ جب کوئی ملنے آتا تو اپنا تکیہ اسے عنایت فرماتے۔ اگر وہ انکار کرتا تو آپؐ اصرار فرماتے۔ بعض اوقات اپنا کمبل بھی اس کے نیچے بچھا دیتے۔ اگرچہ آپؐ ہر ملنے والے کے مرتبہ کو ملحوظ رکھتے تھے۔ لیکن ہر شخص یہی یقین کرتا تھا۔ کہ آپؐ اس کو سب سے زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔ آپؐ کی معیت، گفتگو، صحبت، ملاقات اور دوستی میں حیا، تہذیب، سلیقہ اور اعتماد کا رنگ نظر آتا تھا۔ چنانچہ خدا نے آپؐ سے خطاب کیا ہے۔ "اے محمدؐ یہ خدا کا فضل ہے۔ کہ تم لوگوں سے بلطف وکرم پیش آتے ہو۔ اگر تم درشت مزاج اور غیر مہذب ہوتے تو کوئی تم سے رفاقت نہ کرتا۔" دوستوں کو خوش کرنے کے لئے آپؐ ان کو ان کے قبیلوں کے نام سے بھی پکارتے تھے۔ اور جن لوگوں کا کوئی اسم صفاتی نہ ہوتا۔ انھیں اپنی رائے سے نام عطا فرماتے تھے۔ اور پھر لوگ انھیں اسی نام سے پکارتے۔ جو عورتیں صاحب اولاد ہوتیں۔ ان کو ان کی اولاد کے نام سے یاد فرماتے۔ اور بےاولاد عورتوں کو ان کے قبیلہ کے نام سے پکارتے۔ آپؐ اپنے اہل وعیال پر بیحد مہربان تھے۔ چنانچہ آپؐ کے ایک بیٹے نے آپؐ کے سینہ پر وفات پائی۔ آپؐ بچوں سے بڑی الفت رکھتے تھے۔ راہ میں جو بچے ملتے انھیں پیار کرتے اور چمکارتے اور ان کو پیارے پیارے نام عطا فرماتے۔ اس لئے بچے بھی آپؐ کو بہت محبوب رکھتے۔ آپؐ دیر میں ناراض ہوتے اور فوراً راضی ہو جاتے۔ گفتگو میں اس سے بدتر کلمہ آپؐ سے کبھی سرزد نہ ہوا۔ "اسے کیا ہو گیا ہے" "خدا کرے۔ اس کی پیشانی سیاہ ہو جائے"۔ آپؐ ہر فرد کے ساتھ مہربانی رافت اور فیاضی کا برتاؤ کرتے۔ آپؐ کی مجلس میں کبھی شور وغل نہ ہوتا۔ اور جب آپؐ مجلس برخاست فرماتے تو یوں ارشاد فرماتے۔ "سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ"۔

آپؐ کی نوازشات کریمانہ

آپؐ سب سے زیادہ سخی اور فیاض تھے۔ خصوصاً ماہ رمضان میں تو آپؐ کسی شے کو دریغ نہ رکھتے تھے۔ حضرت علیؓ آپؐ کی صفات حسنہ بیان کرتے ہوئے

لکھتے ہیں۔ کہ آپؐ سب لوگوں سے زیادہ فراخ دست، وسیع القلب، راستگو اور عہد کے پابند تھے۔ نیز نرمیٔ مزاج اور وجاہت خاندانی میں بھی سب سے زیادہ تھے۔ جو شخص آپؐ کو پہلی بار دیکھتا مرعوب ہو جاتا۔ لیکن رسم و راہ پیدا ہونے کے بعد آپؐ کو اپنا محبوب بنالیتا۔ آپؐ کا سوانح نگار لکھتا ہے۔ کہ "میں نے کسی شخص کو نہ آپؐ سے پہلے آپ کا مثل دیکھا نہ آپؐ کے بعد"۔ جب کوئی شخص اسلام قبول کر لیتا۔ تو پھر آپؐ کوئی شے اس سے دریغ نہ فرماتے۔ ایک دفعہ ایک شخص نے آپؐ سے سوال کیا۔ آپؐ نے اس کو اس قدر بکریاں اور اونٹ عنایت کئے۔ کہ ایک وادی معمور ہو گئی۔ یہ شخص اپنے قبیلہ کو واپس گیا۔ اور لوگوں سے درخواست کی۔ کہ وہ بھی اسلام لے آئیں۔ کیونکہ آنحضرتؐ تو اس قدر سخی ہیں گویا انھیں افلاس کا خوف ہی نہیں ہے۔ کوئی شخص آپؐ کے دروازہ سے خالی ہاتھ نہ گیا۔ اور جس نے جو مانگا وہی پایا۔ ایک دفعہ آپؐ کے پاس نوّے ہزار درہم آئے۔ آپؐ نے چٹائی پر ان کا ڈھیر لگا دیا۔ اور مساکین کو تقسیم کرنے شروع کئے۔ کوئی فقیر خالی ہاتھ نہ گیا۔ حتّےٰ کہ کل رقم صرف ہو گئی۔ ایک دفعہ ایک سائل حاضر ہوا۔ آپؐ نے فرمایا۔ فلاں شخص سے اس قدر رقم لے لو۔ اور کہہ دو۔ کہ جب محمدؐ کے پاس ہو گی۔ تمہیں واپس ملجائیگی حضرت فاروق اعظمؓ نے کہا۔ "یارسول اللہ! جس شے پر آپؐ کو قدرت نہیں اس کے کرنے کا حکم بھی خدا نے آپؐ کو نہیں دیا۔ پھر آپؐ اس قدر زیر بار کیوں ہوتے ہیں"؟ آپؐ اس بات سے ناخوش ہو گئے۔ تب اس آدمی نے کہا۔ "یقیناً آپؐ کا خدا آپؐ کی امداد کرے گا۔ خواہ آپؐ اس کی راہ میں کتنا ہی کیوں نہ صرف کریں"۔ اس بات سے آپؐ خوش ہو گئے۔ (مسلم)

جب آپؐ جنگِ حنین سے واپس آرہے تھے۔ بہت سے عرب آپؐ کے گرد جمع ہو گئے۔ اور خیرات طلب کرنے لگے۔ آپؐ ان کے تقاضے سے بچنے کے لئے ایک درخت کی آڑ میں ہو گئے۔ اس کے کانٹوں سے آپؐ کی چادر الجھ کر پھٹ گئی۔ آپؐ نے توقف فرما کر ارشاد کیا۔ "اگر میرے پاس اس قدر اونٹ ہوں۔ جس قدر کانٹے اس جنگل میں موجود ہیں، تو بھی میں ان سب کو خیرات کر دوں۔ یقیناً تم مجھے خسیس نہ پاؤ گے"۔ (بخاری)

آپؐ کی فیاضی اس قدر مسلّم الثبوت تھی۔ کہ ایک دفعہ ایک اعرابی نے آپؐ کو قمیص پکڑ کر روک لیا۔ اور کہنے لگا۔ محمد! صرف ایک آرزو رہ گئی ہے۔ ممکن ہے بھول جاؤں۔ لہٰذا میری امداد کرو۔ کہ وہ بھی پوری ہو جائے" آپؐ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے والے تھے۔ مگر جماعت کو چھوڑ کر اس کے ساتھ ہو لئے۔ اور اس کا کام پورا کرنے کے بعد نماز پڑھی۔ ایک مرتبہ دورانِ گفتگو میں ابوذرؓ سے فرمایا۔

"اگر کوہِ اُحد سونے کا ہو جائے۔ تو بھی تین دن میں میں اسے خیرات کر دوں"۔ ایک مرتبہ بحرین سے خراج کی رقم وصول ہوئی۔ آپؐ نے ہدایت فرمائی۔ کہ اس کو صحن مسجد میں رکھ دیا جائے۔ جب نماز کے لئے تشریف لائے تو اس پر نگاہ بھی نہ فرمائی۔ بعد نماز تقسیم شروع ہوئی۔ جو آیا۔ اسے حصّہ ملا۔ حضرت عباسؓ کو جو جنگ بدر کے بعد مفلس ہو گئے تھے۔ اس قدر عطا کیا۔ کہ وہ چل نہ سکتے تھے۔ جب تک کل رقم تقسیم نہ ہو گئی۔ آپؐ وہیں بیٹھے رہے۔ اُمّ سلمہؓ بیان کرتی ہیں۔ کہ ایک دفعہ شام کے وقت آپؐ تشریف لائے۔ مگر متفکر تھے۔ میں نے سبب پوچھا تو فرمایا۔ "کل مجھے سات دینار ملے تھے۔ وہ ابھی تک میرے بستر ہی پر پڑے ہوئے ہیں"۔ روایت ہے۔ کہ آپؐ بعد نماز عصر مکان پر تشریف لے گئے۔ اور جلد واپس آ گئے۔ لوگوں نے سبب پوچھا۔ تو فرمایا۔ "نماز کے بعد خیال آیا۔ کہ گھر میں چند دینار پڑے ہوئے ہیں۔ پس ان کو فقرا میں تقسیم کر دینے کی ہدایت دینے گیا تھا"۔ (بخاری)

لیکن آپؐ خود صدقہ یا خیرات کبھی قبول نہ فرماتے تھے۔ آپؐ فرماتے تھے کہ "بعض اوقات جب میں گھر میں جاتا ہوں تو بستر پر کھجور پڑی ملتی ہے۔ جی چاہتا ہے تو کھالوں۔ لیکن پھر خیال آتا ہے۔ کہ شاید کوئی بھوکا آدمی آ جائے گا۔ اسے دیدوں گا۔ تو بہتر ہے۔ یہ سوچ کر پھر اسے وہیں رکھ دیتا ہوں"۔ ایک مرتبہ آپؐ کے نواسہ حسنؓ نے صدقہ کی ایک کھجور مُنہ میں رکھ لی۔ آپؐ کو معلوم ہوا۔ تو فرمایا۔ "کیا تمہیں معلوم نہیں۔ ہم بنو ہاشم ہیں۔ اور ہمیں صدقہ کھانا جائز نہیں"۔ پس آپؐ نے اس کھجور کو اگلوا دیا۔ (بخاری)

آپؐ کی شجاعت

حضرت علیؓ کہتے ہیں۔ جنگ حنین میں جب دشمنوں کا غلبہ ہوا۔ تو ہم سبھوں نے آپؐ کے پاس پناہ ڈھونڈی۔ حالانکہ آپؐ دشمن سے قریب تر تھے۔ اور اس وقت جنگ بہت شدّت کے ساتھ ہو رہی تھی۔ جب دست بدست لڑائی شروع ہو گئی۔ تو ہم سب آپؐ کے پیچھے تھے۔ گویا آپؐ سے زیادہ دشمنوں کے قریب کوئی دوسرا نہ تھا۔ آپؐ کم گو تھے۔ اور جب دھاوا کرنے کا حکم دیتے تھے۔ تو خود سب سے آگے جنگ میں مشغول ہو جاتے تھے۔ جو شخص جنگ میں آپؐ سے قریب ہوتا تھا وہ ہم سبھوں میں نہایت جری خیال کیا جاتا تھا۔ کیونکہ آپؐ دشمنوں سے نہایت قریب ہوتے تھے۔ جب دشمن آپؐ کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ تو آپؐ خچر سے اتر پڑتے اور فرماتے۔

"میں خدا کا رسول ہوں۔ خُدا کا نبی ہوں۔ اور عبدالمطلب کا پوتا ہوں"۔

جنگ حنین واقع ۸ھ میں جبکہ مسلمانوں کی تعداد مخالف پارٹی سے بہت کم تھی۔ دشمنوں کی

طرف سے تیروں کی بارش ہونے لگی۔ اور مسلمان پسپا ہونے لگے۔ لیکن آپؐ اپنی جگہ سے مطلق نہ ہلے۔ بلکہ اپنے خچر کو آگے بڑھانا چاہا۔ مگر آپؐ کے جانثاروں نے جانے نہ دیا۔ اگرچہ آپؐ ہدفِ تیراعدا تھے۔ لیکن آپؐ نے مطلق کمزوری ظاہر نہ فرمائی۔ اور استقلال کے ساتھ مصروف پیکار رہے۔ براء سے لوگوں نے پوچھا۔ کیا تم بھاگ نکلے تھے! اس نے جواب دیا "بیشک لیکن آنحضرتؐ اپنی جگہ پر قائم رہے۔ اور صرف آپؐ کی ذات ہمارے لئے ملاذ و محاذ تھی اور جو شخص آپؐ کے ساتھ شریک جنگ ہو سکتا تھا۔ وہ ہم لوگوں میں نہایت شجاع خیال کیا جاتا تھا" (مسلم)

انسؓ جو سات سال تک آپؐ کی خدمت میں رہے۔ کہتے ہیں۔ کہ آنحضرتؐ سب سے زیادہ بہادر تھے ایک مرتبہ خبر مشہور ہوئی۔ کہ دشمن مدینہ کی دیواروں کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ اہلِ مدینہ نے اُن سے مقابلہ کرنے کی تیاری شروع کی۔ لیکن پہلا شخص جو اُن سے مقابلہ کرنے کے لئے نکلا۔ آپؐ ہی تھے۔ آپؐ اس قدر مستعد اور شیر دل واقع ہوئے تھے۔ کہ آناً فاناً اپنے گھوڑے پر زین کس لی۔ اور سوار ہو کر تمام موقعوں کا معائنہ کر کے واپس آ گئے۔ اور لوگوں کو اطمینان دلایا۔ کہ خطرہ کی کوئی بات نہیں (بخاری)

ابن حنبل روایت کرتے ہیں۔ کہ جنگ بدر میں جبکہ دشمن اپنے ساز و سامان اور اسلحہ اور تعداد کی وجہ سے شاداں اور فرحاں نظر آتے تھے۔ اور مسلمانوں کو مرعوب کر رہے تھے۔ کیونکہ ان کی تعداد صرف تین سو تیرہ تھی اس وقت صرف نبی کریمؐ ہی سب کے لئے مایۂ اطمینان تھے۔ چنانچہ غریب مسلمان جن کے پاس اسلحہ کی بھی کمی تھی آپؐ کے گرد جمع ہو گئے۔ اور آپؐ نے سب کو طمانیت قلب عطا فرمائی۔

صفتِ عفو جس کسی نے آپؐ کو آزار پہنچایا۔ اگرچہ آپؐ ذی مقدرت تھے۔ تاہم آپؐ نے اسے معاف کر دیا۔ آپؐ سب سے زیادہ حلیم اور نرم مزاج تھے۔ اور باوجودِ مقدرت دوسروں پر رحم فرماتے۔ ایک مرتبہ سونے چاندی کی زنجیریں آپؐ کے پاس تحفۃً میں آئیں۔ آپؐ نے انھیں تقسیم کرنا شروع کیا۔ ایک اعرابی اٹھ کر کہنے لگا۔ "اے محمدؐ! خدا نے تم کو انصاف کرنے کا حکم دیا ہے۔ لیکن میں دیکھتا ہوں۔ کہ تم ایسا نہیں کرتے" اس پر آپؐ نے فرمایا۔ "اے بدبخت! اگر میں انصاف نہ کروں گا۔ تو اور کون کرے گا" یہ سرزنش پا کر اس نے بھاگ جانے کا قصد کیا۔ لیکن آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا "اسے مہربانی کے ساتھ واپس لے آؤ" ایک مرتبہ آپؐ جنگ میں مشغول تھے۔ دشمنوں نے آپؐ کی صفوں میں کچھ بدنظمی پائی۔ اور ایک اعرابی تلوار سونت کر آپؐ کے سر پر آ گیا۔ اور کہنے لگا۔ "محمدؐ! تمہیں کون بچا سکتا ہے"؟ آپؐ نے نہایت استقلال کے ساتھ جواب دیا۔ "اللہ"

یہ نام سن کر اس پر ایسی دہشت طاری ہوئی۔ کہ تلوار چھوٹ کر گر پڑی۔ آپؐ نے فوراً اُسے اٹھا لیا اور فرمایا اب تجھے کون بچا سکتا ہے"؟ وہ کافر بولا" آپؐ نے مجھے اسیر کر لیا۔ اب دوسرے قید کرنے والوں سے بہتر سلوک میرے ساتھ کیجئے"۔ آپؐ نے اسے رہا کر دیا۔ جب وہ اپنے لوگوں میں واپس آیا تو کہنے لگا۔ "میں اس وقت دنیا میں سب سے بڑے آدمی کے پاس سے آرہا ہوں"۔

انس رضؓ راوی ہیں۔ کہ ایک یہود دن زہر آلودہ گوشت آپؐ کے لئے لائی۔ آپؐ کو معلوم ہو گیا۔ اور اس کو طلب فرمایا۔ اُس نے اقرار کیا۔ کہ"بیشک میری نیت آپؐ کو قتل کرنے کی تھی"۔ آپؐ نے فرمایا" مگر خدا کی منشاء نہ تھی۔ کہ تیری آرزو پوری ہو"۔ صحابہ رضؓ نے اسے قتل کرنا چاہا۔ آپؐ نے فرمایا"نہیں"۔ ایک مرتبہ آپؐ کچھ رقم تقسیم فرما رہے تھے۔ ایک نصرانی بول اُٹھا" اس تقسیم کے لئے خدا کی مرضی یوں نہ تھی"۔ کسی نے آپؐ سے یہ بات کہہ دی۔ آپؐ کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ مگر ضبط فرمایا اور کہا" خدا مغفرت کرے۔ میرے بھائی موسےٰ کی۔ ان کو اس سے بھی زیادہ ستایا گیا۔ لیکن انہوں نے صبر سے کام لیا"۔

آپؐ فرمایا کرتے تھے۔ "مجھ سے کسی صحابی کے متعلق کچھ نہ کہا کرو۔ کیونکہ اُن سب کی طرف سے سینہ صاف مرنا چاہتا ہوں آپؐ بہت زکی الحس تھے۔ خوشی یا رنج دونوں کا اثر فوراً آپؐ کے چہرے سے ظاہر ہو جاتا تھا۔ آپؐ وہ بات کبھی منہ سے نہ نکالتے جس کے متعلق آپؐ کو یہ خیال ہوتا۔ کہ اس سے دوسروں کو رنج پہنچے گا۔ ایک شخص زرد خوشبو لگا کر آپؐ کے پاس آیا۔ آپؐ کو وہ خوشبو ناپسند تھی۔ لیکن آپؐ نے اسے کچھ نہ کہا۔ جب وہ چلا گیا۔ تو آپؐ نے صحابہ رضؓ سے فرمایا" اس شخص سے کہہ دو۔ کہ یہ خوشبو لگا کر نہ آیا کرے"۔

انکسار اور فروتنی

باوجود مقدرت، آپؐ نہایت حلیم اور منکسر المزاج تھے۔ مریضوں کی عیادت فرماتے اور جنازوں کے ساتھ بھی جاتے۔ غلاموں کی دعوت قبول فرما لیتے۔ اور اپنی کفش کی مرمت خود ہی کر لیتے۔ کپڑوں پر پیوند خود ہی لگا لیتے۔ اور گھر میں ازواج کے ساتھ مل کر ان کے فرائض خانگی ادا کر دیتے (شمائل ترمذی) صحابہ رضؓ آپؐ کا کوئی کام نہ کرتے کیونکہ وہ جانتے تھے۔ کہ یہ بات آپؐ کو ناپسند ہو گی۔ جب آپؐ بچوں سے ملتے تو انھیں بھی سلام کر لیتے۔ ایک شخص کو صحابہ رضؓ آپؐ کے پاس لائے۔ وہ خوف زدہ ہو گیا آپؐ نے فرمایا" خوف مت کرو، میں بادشاہ نہیں ہوں۔ بلکہ قریش کی ایک عورت کا بیٹا ہوں۔ جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی"۔ دوستوں کے ساتھ اس قدر بے تکلف تھے۔ کہ گویا انہیں میں سے ایک تھے۔ اور اگر کوئی

آپؐ کو بلاتا تو فرماتے "حاضر ہوں"۔ جب کبھی لوگ یوم آخرت کا تذکرہ کرتے تو آپؐ اس کی تفصیلات بیان کرنے لگتے۔ اگر وہ کھانے پینے کا ذکر کرتے۔ تو آپؐ اس کے متعلق معلومات بیان کرنے لگتے۔ اور اگر وہ کوئی دنیاوی بات کرتے تو اسی میں شریک ہو جاتے۔ کیونکہ آپؐ ان کی دلجوئی ہمیشہ مدنظر رکھتے تھے۔ جب کوئی آپؐ کے سامنے اپنے بچپن کا تذکرہ کرتا یا کوئی شعر سناتا۔ تو آپؐ مسکرا دیتے اور سوا ممنوعاتِ شرعیہ کے کسی بات سے منع نہ فرماتے۔

ایک دفعہ آپؐ صحابہؓ کے سامنے اپنے مکان سے برآمد ہوئے۔ وہ تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ آپؐ نے فرمایا۔ "عجمیوں کی طرح میری تعظیم کے لئے کھڑے مت ہو" (ابن ماجہ) اور اس بات سے آپؐ کی صفت انکسار مد کمال پر ظاہر ہوتی ہے۔ کہ آپؐ لوگوں کو اس امر سے منع فرماتے۔ کہ میرے لئے کوئی تعظیمی لفظ استعمال کیا جائے۔ حالانکہ اس بات کے آپؐ واقعی مستحق تھے۔ ایک دفعہ ایک صحابی نے یوں خطاب کیا "اے ہمارے آقا" اور ہمارے آقا کے بیٹے اور ہم میں سب سے اچھے آدمی کے بیٹے"۔ آپؐ نے فرمایا" خبردار کہیں گناہ کے مرتکب نہ ہونا۔ مبادا شیطان تم کو بہکا دے۔ میں محمدؐ ابن عبداللہ اور رسول اللہ ہوں۔ دگرہیچ۔" ایک دفعہ ایک شخص نے آپؐ کو "افضل الناس" کہہ کر خطاب کیا۔ آپؐ نے فرمایا" میں نہیں بلکہ ابراہیم افضل الناس تھے"۔ عبداللہ ابن سخیر راوی ہیں۔ کہ ایک مرتبہ بنی امیر کے نمایندے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اثنائے گفتگو میں ایک شخص نے کہا "آپؐ ہمارے آقا ہیں" آپؐ نے فرمایا "تمہارا آقا خدا ہے"۔ دوسرے شخص نے کہا۔ آپؐ ہم سب سے افضل اور اشرف ہیں"۔ آپؐ نے فرمایا "جب بولو تو یہ سوچ لو" کہیں شیطان تو تمہیں نہیں ورغلاتا"۔ جب کسی کے گرد تعریف کرنے والوں کا مجمع ہوتا ہے۔ تو اس وقت اس کی انکساری کا سخت امتحان درپیش ہوتا جاتا ہے۔ لیکن آپؐ کی صفت انکسار تو اور بھی نمایاں ہو جاتی تھی۔ روایت ہے۔ کہ جب آپؐ فاتحانہ شان سے مکہ میں داخل ہوئے اور دس ہزار جاں نثار آپؐ کی جلو میں تھے۔ اس وقت آپؐ نے اپنا سر اس قدر جھکا لیا تھا۔ کہ قریب قریب زمین سے لگ گیا تھا (ابن ہشام)

ایک دفعہ آپؐ کے ایک صحابی مخرمہ نے اپنے بیٹے مصور سے کہا۔ "جاؤ اور نبی کریمؐ سے اپنے حصہ کی چادر لے آؤ"۔ جب وہ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا۔ کہ آپؐ چادریں تقسیم فرما کر مکان کے اندر جا چکے ہیں۔ چنانچہ وہ واپس چلے گئے۔ ان کے باپ نے کہا "جاؤ انہیں آواز دے لو"۔ انھوں نے کہا "میں ایسی گستاخی کس طرح کر سکتا ہوں"؟ انھوں نے کہا "بیٹے! آنحضرتؐ درشت مزاج نہیں ہیں"۔ چنانچہ انھوں نے دروازہ

پر جاکر دستک دی۔ آپؐ باہر تشریف لائے۔ اور اُن کا حصہ انھیں عنایت فرمایا۔

ایک دفعہ سفر میں صحابہؓ نے ایک بکری ذبح کی۔ اور کھانا پکانے کا انتظام کیا۔ دوران تقسیم کار میں آپؐ نے فرمایا۔ "میں جنگل سے لکڑیاں لے آؤں گا۔" صحابہؓ نے عرض کی "حضور تکلیف نہ کریں۔ ہم لوگ بہ آسانی اس کام کو کر سکتے ہیں۔" آپؐ نے فرمایا "میں تمہارے اور اپنے درمیان کوئی امتیاز قائم کرنا نہیں چاہتا" (زرقانی) کسی سفر میں آپؐ کے جوتہ کا تسمہ ٹوٹ گیا۔ آپؐ وہیں درست کرنے بیٹھ گئے۔ ایک صحابی نے عرض کی "میں اس کام کو انجام دوں" آپؐ نے فرمایا۔ "اسی کا نام تو شخصیت پرستی ہے۔ میں اس بات کو مطلق پسند نہیں کرتا۔" (زرقانی)

ایک دفعہ آپؐ اپنے مکان کی مرمت کر رہے تھے۔ دو صحابی آگئے۔ اور شریک کار ہو گئے۔ جب کام ختم ہو گیا۔ تو آپؐ نے ان کے لئے دعا فرمائی اور شکریہ ادا کیا (مسند ابن حنبل)

معاونتِ دیگراں

ایک دفعہ آپؐ نے خباب ابن عرت کو کسی مہم پر بھیجا۔ اُن کے مکان پر کوئی سودا سُلف لانے والا نہ تھا۔ لہٰذا جب تک وہ واپس نہ آئے۔ آپؐ روزمرہ کو اُن کے مکان پر جاکر ان کے خانگی فرائض انجام دیتے رہے۔

مُلک حبش سے بعض لوگ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جنہیں حضورؐ نے اپنا مہمان بنایا۔ صحابہؓ نے خواہش ظاہر کی۔ کہ ہمیں ان کی مہمانداری کا موقعہ دیا جائے۔ آپؐ تکلیف نہ فرمائیں۔ لیکن آپؐ نے فرمایا "نہیں میں بذات خود ان کی مہمانی کروں گا۔ کیونکہ انھوں نے ہمارے احباب کو پناہ دی تھی۔ اور اس لئے مجھ پر اُن کی مدارات فرض ہے (شفائے قاضی عیاض)

عبداللہ ابن عوف راوی ہیں۔ کہ جب کبھی آپؐ یتامیٰ اور بیوہ عورتوں کے ساتھ ہوتے تو مطلق عاجزی نہ فرماتے۔ بلکہ مردانہ ہمت کے ساتھ ان کی امداد کرتے۔ مدینہ کی لڑکیاں عموماً آپؐ سے طالب امداد ہوتیں۔ آپؐ بخوشی ان کے کاموں کو سرانجام دیتے۔

مبادلۂ تحائف

آپؐ فرمایا کرتے تھے۔ "تہادوا تحابوا" یعنی آپس میں ایک دوسرے کو تحفے دو۔ تاکہ محبت بڑھے۔ چنانچہ تحفے قبول فرماتے تھے۔ اور عوض بھی کرتے تھے۔ اسی لئے آپؐ کے صحابہؓ عموماً آپؐ کے پاس تحفے بھیجتے رہتے تھے۔ آپؐ ہمسایہ سلاطین کو بھی تحفے روانہ فرماتے تھے۔

شام کے حاکم نے ایک دفعہ آپؐ کو سفید خچر تحفہ میں بھیجا تھا۔ عزیز مصر نے بھی ایک سفید خچر آپؐ کو بھیجا تھا۔ قیصر روم نے آپؐ کو سمور کا لبادہ بھیجا تھا۔ اور ایک یمنی امیر نے موزہ کا جوڑا بھیجا تھا۔ سمور کی عبا، آپؐ نے تھوڑی دیر کے لیے استعمال بھی کی تھی۔ اس کے بعد حضرت علیؓ کے بھائی جعفر کو عطا کر دی۔ ڈی یزان بادشاہ یمن نے آپؐ کو ایک قیمتی عبا، جو ساٹھ اونٹوں کے عوض خرید کی تھی، تحفہ میں بھیجی، آپؐ نے بھی اس کے عوض ایک عمدہ عبا، جو آپؐ نے بیس اونٹوں کے عوض خرید کی تھی ڈی یزان کو بھیج دی۔ (ابوداؤد)

قبیلہ بنو فضاضہ کے ایک شخص نے آپؐ کو ایک اونٹ تحفہ میں دیا۔ آپؐ نے اس کے عوض کوئی چیز اُسے دینی چاہی۔ اس نے لینے سے انکار کیا۔ یہ بات آپؐ کو ناگوار معلوم ہوئی۔ اور آپؐ نے منبر پر یوں تقریر کی "تم لوگ مجھ کو تحفے دیتے ہو۔ لیکن معاوضہ سے ناخوش ہوتے ہو۔ لہٰذا آیندہ میں سوائے قریش بنی ثقیف انصار اور دادش کے اور کسی قبیلہ کا تحفہ قبول نہیں کروں گا"۔ اس سے آپ کا مطلب یہ تھا کہ یہ لوگ میری عادات سے اچھی طرح واقف ہیں۔

جو کھانا آپؐ کے استعمال سے بچ رہتا۔ وہ آپؐ ابو ایوب انصاریؓ کو بھیج دیتے اور عموماً اپنے ہمسایوں کو تحفے بھیجتے رہتے۔

آپؐ حتے الوسع ممنون احسان ہونے سے احتراز فرماتے۔ حد ہے کہ ابوبکرؓ صدیق جیسے مخلص ہمدرد اور جاں نثار خادم اور سچے دوست کا احسان بھی گوارا نہ فرماتے۔ بوقت ہجرت انہوں نے ایک عمدہ اُونٹ آپؐ کو نذر دینا چاہا۔ لیکن آپؐ نے اُس کی قیمت ادا فرما دی۔ تب سوار ہوئے۔ مدینہ میں جس جگہ مسجد بنائی۔ وہ زمین آپ کو نذر کی گئی تھی۔ لیکن آپؐ نے اس کی قیمت ادا فرما دی۔ تب مسجد تعمیر کی گئی۔

ایک دفعہ حضرت فاروق اعظمؓ اور عبداللہ ابن عمر آپؐ کے رفیق سفر تھے۔ عبداللہ کا گھوڑا کسی قدر سرکش اور مُنہ زور تھا۔ اس لیے حضورؐ کے گھوڑے سے آگے نکل جاتا تھا۔ انہوں نے لگام حتے الوسع سخت کی لیکن قابو میں نہ آیا۔ حضرت عمرؓ اس بات سے ناراض ہوئے۔ اور عبداللہ کو جو ان کا بیٹا تھا برا بھلا کہنے لگے آپؐ نے حضرت عمرؓ سے ارشاد کیا۔ کہ یہ جانور فروخت کر ڈالو۔ انہوں نے کہا۔ میں اُسے تحفہ میں دیتا ہوں۔ آپؐ نے کہا "نہیں تمہیں قیمت لینی ہوگی"۔ مجبوراً انہیں قیمت لینی پڑی۔ تب آپؐ نے وہ گھوڑا عبداللہ ابن عمرؓ کو عطا فرمایا اور کہا "اب یہ تمہاری ملکیت ہے"۔

گداگری سے نفرت

اگرچہ آپؐ اس قدر رحیم اور کریم تھے۔ لیکن گداگری سے آپؐ کو سخت نفرت تھی۔ خصوصاً جبکہ سائل فی الحقیقت محتاج نہ ہو۔ آپؐ فرماتے ”جنگل میں جاکر لکڑیاں کاٹ لانا۔ اور انھیں فروخت کرکے اپنا پیٹ پالنا، گداگری سے بدرجہا بہتر ہے“ (بخاری)

ایک دفعہ ایک صحابی آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور سوال کیا۔ آپؐ نے فرمایا ”تمہارے پاس کوئی شے بھی ہے“۔ انھوں نے عرض کی ”جی ہاں ایک پیالہ اور ایک بستر“۔ آپؐ نے فرمایا ”جاؤ دونوں چیزیں لے آؤ“۔ وہ گئے اور لے آئے۔ آپؐ نے صحابہ سے خطاب کیا ”تم میں سے کوئی شخص ان چیزوں کا خریدار ہے“؟ ایک صحابی نے کہا ”میں ایک درہم دے سکتا ہوں“۔ آپؐ نے کہا ”کوئی شخص اس سے زیادہ دے سکتا ہے“؟ دوسرے نے کہا ”میں دو درہم دے سکتا ہوں“۔ آپؐ نے قیمت وصول کرکے اس صحابی سے کہا۔ جاؤ ایک درہم آج کی خوراک کے لئے ہے۔ دوسرے کی رسی خریدو اور جنگل میں جاکر لکڑیاں جمع کرو“۔ دو ہفتے کے بعد وہ پھر حاضر خدمت ہوئے۔ آپؐ نے دریافت کیا۔ آپ کا کیا حال ہے؟ انھوں نے کہا خدا کا شکر ہے۔ اب تو میرے پاس پندرہ درہم جمع ہوگئے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا ”نصف رقم سے کپڑے خرید لو۔ اور نصف سے اناج لے آؤ۔ تاکہ آسائش میسر ہو۔ اور اب بتاؤ کونسی صورت پسند آئی۔ بھیک مانگنا یا محنت کرکے پیٹ پالنا؟ اور قیامت کے دن گداگری کا داغ لئے ہوئے خدا کے حضور میں آنا“ (ابوداؤد)

ایک دفعہ چند انصار آپؐ کی خدمت میں آکر طالبِ امداد ہوئے۔ آپؐ نے اُن کی مدد کی۔ کیونکہ اگر آپؐ کے پاس ایک پیسہ بھی ہوتا۔ تو کسی سائل کو محروم نہ جانے دیتے۔ پھر چند روز کے بعد وہی لوگ حاضر ہوئے اُس وقت آپؐ کے پاس کچھ نہ تھا۔ فرمایا ”اگر میرے پاس ایک چھوٹا سا دام بھی ہوتا۔ تو تمہیں دے دیتا۔ لیکن جو شخص خدا سے گداگری سے بچنے کی دعا کرتا ہے۔ وہ اس لعنت سے محفوظ رہتا ہے۔ جو شخص دولت کی دعا کرتا ہے۔ اسے تونگری نصیب ہوجاتی ہے۔ اور جو شخص صبر و تسلیم کی طلب کرتا ہے۔ اُسے یہ نعمت ملتی ہے۔ اور میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ کہ صبر سے بڑھ کر کوئی شے بہتر نہیں ہے“۔ (بخاری)

حاکم ابن حزام فتح مکہ کے بعد اسلام لائے۔ وہ ایک دفعہ حضورؐ سے طالبِ امداد تھے۔ آپؐ نے انھیں کچھ دے دیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد پھر آئے۔ پھر آپؐ نے کچھ مرحمت فرمادیا۔ تیسری مرتبہ پھر سوال کیا۔ آپؐ نے

فرمایا "حاکم جو شخص دوسروں کو دیتا ہے۔ خدا اسے غنی کر دیتا ہے۔ لیکن جو شخص لالچ کی رو سے دوسروں کے آگے دست سوال دراز کرتا ہے۔ خدا اسے اپنے فضل سے محروم کر دیتا ہے۔ وہ خرچ کرتا ہے۔ مگر سیر نہیں ہوتا۔ یاد رکھو دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے اونچا ہے" اس نصیحت کا ان پر ایسا اثر ہوا۔ کہ تادم مرگ ادنےٰ سی ضرورت کے لئے بھی کسی سے سوال نہیں کیا (بخاری)

حجۃ الوداع کے موقعہ پر آپؐ خیرات کر رہے تھے۔ تنومند آدمی مجمع میں آکر شامل ہو گئے۔ آپؐ نے نگاہ اٹھائی اور ان سے یوں خطاب کیا۔" اگر تم چاہو تو میں تمہیں بھی کچھ دے دوں گا۔ لیکن یاد رکھو کہ اس رقم میں ان لوگوں کے لئے کچھ حصّہ نہیں ہے۔ جو محنت مزدوری کرنے کے قابل ہیں" (ابو داؤد)

ایک شخص قبص نامی ایک دفعہ مقروض ہو گیا۔ وہ آپؐ کے پاس آیا اور ماجرا بیان کیا۔ آپؐ نے امداد کا وعدہ فرمایا۔ اور یوں گویا ہوئے " اے دوست! طلب کرنا صرف تین قسم کے آدمیوں کے لئے جائز ہے۔ اوّل جو مقروض ہو جائیں۔ لیکن قرض ادا کرنے کے بعد دوبارہ طالب نہ ہوں۔ دوسرے وہ جن کی دولت یکلخت تلف ہو جائے۔ اور مجبوراً جب تک وہ حالتِ عُسرت دور نہ ہو۔ دستِ سوال دراز کر سکتے ہیں۔ تیسرے وہ جو فاقہ سے ہو۔ اور محلّہ کے تین آدمی اس کی عسرت پر گواہی دیں۔ ان کے علاوہ جو شخص بھیک مانگتا ہے۔ وہ حرام خور ہے (شفائے قاضی)

مہمان نوازی

مہمان نوازی میں آپؐ مسلم اور غیر مسلم میں کوئی امتیاز نہیں کرتے تھے۔ آپؐ نے حبش کے مہمانوں اور نجران کے نصاریٰ کو اپنے گھر میں ٹھہرایا۔ اور بذاتِ خویش ان کی مدارات فرمائی۔ ایک دفعہ ایک کافر آپؐ کا مہمان ہوا۔ آپؐ نے ایک بکری کا دودھ اُس کے سامنے پیش کیا۔ وہ سب پی گیا۔" دوسری بکری کا دودھ منگوایا۔ وہ اسے بھی ڈکار گیا۔ حتےٰ کہ سات بکریاں اس وقت موجود تھیں۔ جب تک وہ سیر نہ ہوا۔ آپؐ برابر پلاتے رہے۔

اصحاب صُفہ آپؐ کے صحابہؓ میں سب سے غریب طبقہ تھا۔ اس لئے وہ سب مسلمانوں کے مہمان سمجھے جاتے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ تواضع آپؐ ہی فرماتے تھے۔ ایک دن آپؐ نے فرمایا۔ "تم میں سے جس شخص کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہو وہ تین اصحاب صُفّہ کو اپنے ساتھ کھلائے۔ اور جس کے پاس چار کا ہو۔ وہ پانچ کو۔ چنانچہ ابو بکرؓ تین آدمیوں کو اپنے ساتھ لے گئے۔ لیکن آپؐ دس آدمیوں کو اپنے ہمراہ لے آئے۔

اور پہلے انھیں کھلایا۔ بعد کو آپؐ نے کھایا (مسلم)

ابو ہریرہ بھی اصحابِ صفہ میں داخل تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں اس قدر بھوکا تھا کہ چل نہ سکتا تھا۔ مجبوراً سڑک کے کنارے بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ ابو بکرؓ آ رہے ہیں۔ ان سے ایک آیت کا مطلب اس غرض سے پوچھنے لگا۔ کہ میری گرسنگی سے واقف ہو جائیں۔ لیکن وہ نہ سمجھ سکے۔ اور آیت کا مطلب بتاکر آگے بڑھ گئے۔ بعد ازاں عمرؓ ادھر سے گزرے۔ وہ بھی اس راز کو نہ سمجھ سکے اور چلے گئے۔ پھر آنحضرتؐ کا اُدھر گزر ہوا۔ آپ نے انکو دیکھ کر کہا۔ "میرے ساتھ گھر چلو۔" گھر پہنچ کر معلوم ہوا۔ کہ کسی نے ایک دیگچی دودھ تحفہ میں بھیجا ہے آپؐ نے ان سے فرمایا۔ "جاؤ اوروں کو بلا لاؤ۔" چنانچہ جو لوگ مل سکے۔ وہ ساتھ لے آئے۔ اور حسب الارشاد وہ دودھ سب میں تقسیم ہو گیا۔ (ترمذی)

مقدادؓ راوی ہیں۔ کہ ایک دفعہ میں اور میرے احباب فاقہ کشی کی بدولت تقریباً اندھے ہو گئے تھے کئی آدمیوں سے درخواست کی۔ کہ ہمارے کھانے کا انتظام کر دو۔ لیکن کسی نے ذمہ نہ لیا۔ مجبوراً آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے تین بکریوں کی طرف اشارہ فرمایا۔ "یہ بکریاں آج سے تمہاری ملک ہیں ان کا دودھ پیا کرو۔" (مسلم)

میں اس بات کو اور وسعت دیتا۔ اور مغربی نکتہ چینیوں کے اعتراضات کا بھی جواب دیتا۔ لیکن جنوبی افریقہ سے تبلیغ اسلام کی دعوت آگئی ہے۔ اس لیے ما بقی کو اس کتاب کے حصہ دوم کے لیے چھوڑتا ہوں۔ ہاں اس بات کا اعادہ کر کے ناظرین سے رخصت ہوتا ہوں۔ کہ جن لوگوں نے آپؐ کی سیرت لکھنے کے لیے واقدی جیسے کذابوں کی تصانیف سے مدد لی ہے۔ ان کی نیت اظہر من الشمس ہے۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰی مُحَمَّدِنِ الَّذِیْ جَآءَ رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ ط

محسن انسانیت خاتم الانبیا کا خادم اور یورپ میں کامیاب ترین مبلّغ اسلام

الحاج حضرت خواجہ کمال الدّین صاحب کے بارے میں

غیر احمدی مشاہیر اسلام کی شہادت حقّہ

محسن انسانیت خاتم الانبیا کا خادم اور یورپ میں کامیاب ترین مبلغ اسلام

الحاج حضرت خواجہ کمال الدین صاحب کے بارے میں
غیر احمدی مشاہیر اسلام کی شہادت حقہ

مولوی عبدالمجید صاحب سالک مرحوم لاہور

"........ اس عرصہ میں آپ نے ہندوستان کے مختلف مقامات کا دورہ فرماکر مذہب اسلام پر لیکچر دیئے۔ آپ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ٹرسٹی اور فیلو بھی تھے۔

۱۹۱۲ء میں آپ نے جذبہ تبلیغ اسلام سے مجبور ہو کر تنہا انگلستان کا رُخ کیا ابتداء میں آپ کی سعی و جہد کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہ ہوئی۔ لیکن رفتہ رفتہ آپ نے مغربی ممالک کی مذہبی تاریخ کا رُخ تبدیل کر دیا ۱۹۱۳ء میں آپ نے اپنے مصارف پر ووکنگ (لندن) سے "اسلامک ریویو" اور لاہور سے رسالہ "اشاعت اسلام" جاری فرمایا۔ آپ نے بلیس سال بہ الفاظ صحیح تر تادمِ آخر (۲۸ دسمبر ۱۹۳۲ء) ان دونوں رسالوں کے فرائض ادارت نہایت کامیابی کے ساتھ ادا کیے۔

آپ ۱۹۱۳ء میں ووکنگ مسجد کے امام مقرر ہوئے تھے۔ اور اب تک اس منصب پر فائز رہے۔ آپ نے اسلام اور دیگر مذاہب پر بے شمار کتابیں تصنیف فرمائیں۔ جن کی وجہ سے دنیائے مذہب میں ایک انقلاب رونما ہو گیا۔ آپ کے بابرکت ہاتھ پر صدہا انگریز مردوں اور عورتوں نے اسلام قبول کیا۔ اور حاجی لارڈ ہیڈلے کا حلقہ اسلام میں داخل ہونا تو آپ کا شاہکار ہے۔

انگلستان جانے سے قبل آپ کی جائداد قریباً ڈیڑھ لاکھ کی تھی۔ اور ۱۹۲۷ء میں جب آپ کی صحت ذرا خراب ہوئی تو آپ نے اپنی تمام جائداد کو ووکنگ مشن کے لئے وقف کر دیا۔ اور اپنی تمام تصانیف کے مالکانہ حقوق کو بھی مسلم مشن لٹریری ٹرسٹ لاہور کے حوالہ کر دیا۔

مرحوم کے عقاید سے کسی کو خواہ کتنا ہی اختلاف ہو۔ لیکن آپ کا عدیم المثال ایثار جذبہ خدمت اسلام اور تقریر و تحریر کا مؤثر اسلوب و انداز مدت العمر یاد رہے گا۔ خدائے برتر و توانا مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔"

(اخبار "انقلاب" مورخہ ۳ دسمبر ۱۹۳۲ء)

جناب رئیس احمد جعفری صاحب

خواجہ کمال الدین۔ ایک ولی پوشیدہ اور کافر کھلا۔

"۱۹۲۲ء میں ندوہ کا سالانہ جلسہ بڑی دھوم دھام سے لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی (نواب صدر یار جنگ بہادر) صدارت کے لئے حیدرآباد سے تشریف لائے تھے۔ ندوہ کے طلبہ نے تحریک خلافت اور کانگرس میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ سیاسی لیڈروں کی بھی ایک معقول تعداد موجود تھی جن میں شیخ الاسلام مولانا شوکت علی پیش پیش تھے۔

میں ندوہ کے درجہ اوّل میں تعلیم حاصل کر رہا تھا امتحان سالانہ ختم ہو چکا تھا چھوٹے بچوں کو عام اجازت تھی کہ وہ تعطیل سے فائدہ اٹھائیں۔ اور اپنے گھر چلے جائیں۔ لیکن اسی اجلاس کی کشش ایسی غالب تھی کہ میں وطن نہیں گیا۔ اور اختتام اجلاس تک ندوہ ہی میں رہا۔

میں ہال کے بغلی برآمدہ میں کھڑا ہوا تھا۔ کہ میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا چلو خواجہ کمال الدین صاحب تقریر کر رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی ان کے ساتھ چل پڑا۔ اسٹیج پر ایک وجیہہ اور بارعب شخص کھڑا داد خطابت دے رہا تھا۔ آواز اتنی گرجدار کہ ہال کے آخری کونہ تک تقریر کا ایک ایک حرف سنا جا رہا تھا۔ بھرا بھرا چہرہ سیاہ داڑھی شرعی پاجامہ اچکن کے بجائے کوٹ زیب تن سر پر ایک طرہ دار صافہ تقریر کا موضوع تھا "تبلیغ اسلام" تقریر اتنی مؤثر اور دلنشین تھی کہ ہر شخص محو حیرت بنا ہوا سن رہا تھا۔

قادیانیوں کے بارے میں عام خیال یہ تھا کہ وہ کافر ہوتے ہیں خواجہ صاحب بھی اسی مسلک کے پیرو تھے حیرت تھی کہ ایک کافر کے دل میں اسلام کا یہ درد تبلیغ اسلام کا یہ ولولہ اشاعت اسلام کا یہ جذبہ کیسے آ گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یورپ میں خواجہ صاحب نے تبلیغ اسلام کا ایک مستقل ادارہ قائم کر رکھا ہے۔ وہاں ایک مسجد بھی تعمیر کر چکے ہیں۔ اور یورپ میں بہت سے لوگوں کو قبولِ اسلام کی سعادت سے مشرف بھی کر چکے ہیں۔ انگریزی میں ایک رسالہ بھی نکالتے ہیں۔ اس کا ماہوار اردو ترجمہ "اشاعت اسلام" کے نام سے ہر ماہ لاہور سے شائع ہوتا رہتا ہے۔ بعد میں یہ بھی معلوم ہوا کہ خواجہ صاحب احمدی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور یہ جماعت مرزا غلام احمد صاحب کو نبی نہیں مانتی۔ صرف مجدد مانتی ہے۔ بہرحال آگے چل کر جیسے جیسے خواجہ صاحب کی اسلامی سرگرمیوں کا علم ہوتا گیا

ان کی عزت وعظمت دل میں بڑھتی گئی۔ اور دل نے کبھی ایک لمحہ کے لئے یہ قبول نہ کیا کہ وہ خدانخواستہ "کافر" ہیں اگرچہ اکثر لوگ "انھیں" کافر ہی سمجھتے تھے۔ اور ان کے اسلام کے نہایت سختی کے ساتھ منکر تھے۔

خواجہ صاحب کو پھر میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ لیکن ایک واقعہ ان کی زندگی کا میں نے ایسا دیکھا جو مجھے آج تک یاد ہے۔ شاید ہمیشہ یاد رہے گا۔

خواجہ صاحب کی تقریر کے بعد اجلاس دوسرے روز کے لئے ملتوی ہوگیا۔ تمام مہمان اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ ایک کمرہ خواجہ صاحب کے لئے بھی مخصوص تھا۔ وہ اس میں تشریف لائے۔ اجلاس ختم ہونے کے بعد میں گھومتا گھامتا خواجہ صاحب کے کمرہ کی طرف سے گذرا۔ اس وقت بالکل سناٹا تھا۔ گیلری میں میرے سوا کوئی دوسرا آدمی نہ تھا۔ میں نے دیکھا خواجہ صاحب اپنے کمرہ میں تنہا عصر کی نماز پڑھ رہے ہیں۔ بڑے اور چھوٹے عالم اور جاہل ہر طرح کے لوگوں کو میں نے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ لیکن جس استغراق محویت اور خشوع وخضوع سے میں نے خواجہ صاحب کو نماز پڑھتے دیکھا۔ اس نے میرے دل پر بڑا اثر کیا۔ اور ایک ایسا نقش قائم کیا جو آج تک موجود ہے۔

نماز کی تعریف یہ ہے کہ پڑھنے والا یہ محسوس کرے کہ وہ خدا کو دیکھ رہا ہے وہ اگر یہ محسوس نہ کرسکے تو یہ خیال ضرور اپنے دل میں قائم کرے کہ خدا اُسے دیکھ رہا ہے۔ خواجہ صاحب کی نماز سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ محسوس کر رہے ہیں کہ وہ خدا کو دیکھ رہے ہیں۔ بغیر اس احساس کے وہ محویت و استغراق و خشوع و خضوع کی کیفیت پیدا ہی نہیں ہوسکتی ۔ جس کے ایک مجسّم پیکر خواجہ صاحب نظر آرہے تھے۔

ممکن ہے کہ کچھ لوگ اب بھی انھیں کافر سمجھتے ہوں لیکن میرے دل پر ان کے اسلام کا ایک ایسا نقش مرتسم ہوچکا ہے۔ جسے حوادثِ دہر بھی نہ مٹا سکے۔

کتاب "دید و شنید" صفحہ ۱۶۳ تا ۱۶۰   کتاب منزل کشمیری بازار لاہور

(رئیس احمد جعفری سنہ ۱۹۴۸ء)

عاشق حسین بٹالوی

"سنہ ۱۹۱۲ء میں خواجہ کمال الدین مرحوم لندن تشریف لائے خواجہ صاحب لاہور میں وکالت کرتے تھے اور اپنے پیشے میں بڑے کامیاب آدمی تھے۔ لیکن انھیں اسلام سے بے پناہ محبت تھی۔ انھوں نے پریکٹس ترک کرکے اپنی زندگی تبلیغ اسلام کے لئے وقف کر دی اور اسی غرض سے انگلستان تشریف لے آئے۔

وہ زمانہ انگریز قوم کے عروج کا تھا۔ مشرق و مغرب میں اس کی سلطنت پھیلی ہوئی تھی۔ اور کہا جاتا تھا کہ برطانوی سلطنت میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا مسلمان ہر جگہ محکوم و مغلوب تھے۔ اور اس محکومی اور غلامی نے اُن میں حد درجہ احساسِ کمتری پیدا کر دیا تھا۔ جب خواجہ صاحب نے انگلستان آکر تبلیغ اسلام کا ارادہ کیا تو اکثر لوگوں نے سمجھایا کہ کیوں چلتی وکالت کو تباہ کرنے لگے ہو۔ انگریزوں کو اسلام سے کیا دلچسپی ہے۔ اور دلچسپی ہوئی بھی تو وہ ایک غلام قوم کا مذہب کیوں قبول کریں گے۔ لیکن اِن باتوں سے خواجہ صاحب کے پائے استقامت میں لغزش نہ ہوئی۔ لندن آکر انھوں نے ابتدا میں رچمنڈ کے علاقے میں قیام کیا۔ اور تقریر و تحریر سے اسلام کا پیغام لوگوں کو پہنچانا شروع کیا۔ اسی کام کے لیے انھوں نے اپنا مشہور رسالہ اسلامک ریویو بھی جاری کیا۔ لیکن انھیں کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی۔ جسکو وہ اپنی سرگرمیوں کا مستقل مرکز بنا سکیں۔ اسی دوران میں انھیں ووکنگ کی مسجد کا حال معلوم ہوا۔ کہ یہ خانۂ خدا ویران پڑا ہوا ہے۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے ووکنگ جاکر مسجد پر قبضہ کر لیا۔ ڈاکٹر لائسنر کے ورثا نے ان کو وہاں سے نکالنے کی کوشش کی۔ لیکن خواجہ صاحب نے جواب دیا کہ مسجد شرع اسلام کی رو سے ہمیشہ مسجد رہتی ہے۔ اور کوئی شخص مسلمانوں کو وہاں نماز پڑھنے سے منع نہیں کر سکتا۔ اس سلسلہ میں مرزا سر عباس علی بیگ مرحوم نے جو اس زمانے میں وزیر ہند کی کونسل کے ممبر تھے۔ خواجہ صاحب کی بہت مدد کی۔ انجام کار مسجد ان کی تحویل میں آگئی۔

خواجہ صاحب قانون دان تھے۔ اس لئے انھوں نے مسجد کی حفاظت و صیانت کے لئے ایک ٹرسٹ قائم کیا۔ جس کے ابتدا میں تین ممبر تھے۔ ایک رائٹ آنریبل سید امیر علی جو پریوی کونسل کی جوڈیشل کمیٹی کے رکن تھے۔ دوسرے مرزا سر عباس علی بیگ اور تیسرے سر ٹامس آرنلڈ جو گورنمنٹ کالج لاہور میں علامہ اقبال کے اُستاد تھے۔ اس ٹرسٹ نے خواجہ صاحب کو امام مقرر کیا۔ اُس وقت سے ووکنگ کی مسجد انگلستان میں تبلیغِ اسلام کی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز چلی آرہی ہے۔

خواجہ صاحب کو ابتدا میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اسلام کے متعلق بڑی بڑی عجیب داستانیں اور بے سروپا افسانے اس ملک میں مشہور تھے۔ تعصب اور جہالت کی اس دیوار کو پاش پاش کرنا آسان نہ تھا۔ لیکن خواجہ صاحب غیر معمولی دل و دماغ لے کر دنیا میں آئے تھے۔ وہ حد درجہ ذہین اور محنتی انسان تھے۔ قلم اور

زبان دونوں پر انھیں قابلِ رشک عبور تھا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اسلام کی صداقت اور حقانیت پر انھیں ایمانِ کامل تھا اور اسی چیز نے ان کی ہمت کو برقرار رکھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی زندگی میں اس مشن کی روزافزوں کامیابی دیکھ لی تھی۔

خواجہ صاحب نے اسلام پر انگریزی میں کم وبیش بیس کتابیں لکھی ہیں، ان ہی کی کوشش سے ۱۹۱۷ء میں مولانا محمد علی لاہوری کا انگریزی ترجمہ قرآن شریف ووکنگ سے شائع ہوا۔ لاریب یہ بہت بڑا کارنامہ تھا۔ کیونکہ اس سے قبل دنیا کے کسی مسلمان کو کلام پاک کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ خواجہ صاحب کا انتقال ۲۸، دسمبر ۱۹۳۲ء کو لاہور میں ہوا تھا۔ لیکن وفات سے پہلے انھوں نے اپنی جائداد جس میں ان کی تصانیف اور رسالہ اسلامک ریویو بھی شامل تھا۔ ووکنگ مشن کے حوالے کردی۔

یہاں اگر مجھے چند لفظوں میں اپنا ذکر کرنے کی اجازت دی جائے تو یہ عرض کروں گا کہ مجھے خواجہ صاحب کی خدمت میں برسوں شرف نیاز حاصل رہا ہے۔ وہ میرے والد مرحوم کے دوست تھے۔ اور ان کے چھوٹے صاحبزادے سکول میں میرے ساتھ پڑھتے تھے۔ اس لئے میں نے خواجہ صاحب کو نسبتاً قریب رہ کر دیکھا ہے۔

خواجہ صاحب کے علاوہ جو لوگ وقتاً فوقتاً مسجدِ ووکنگ میں امامت کے فرائض ادا کرتے رہے ہیں اُن میں مولانا صدرالدین۔ مولانا محمد یعقوب خاں۔ مولانا عبدالمجید۔ مولوی مصطفےٰ خاں۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ اور مولوی آفتاب الدین کے اسمائے گرامی بڑی قدر ومنزلت کے مستحق ہیں۔ سوائے مولوی آفتاب الدین احمد مرحوم کے مجھے ان تمام حضرات سے شرفِ نیاز حاصل رہا ہے۔ بلکہ اول الذکر تینوں بزرگ تو میرے زمانہ طالب علمی میں میرے اُستاد بھی تھے۔

ووکنگ مشن کی سرگرمیوں کی اہمیت سمجھنے کے لئے پچھلی نصف صدی کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ کہ مشن کے کارکنوں نے یورپ میں اسلام کی کیسی گراں بہا خدمت کی ہے۔ ان متعدد تصانیف وتالیفات سے قطعِ نظر جو مشن نے شائع کی ہیں۔ تنہا اسلامک ریویو کے فائل اس بات کے گواہ ہیں۔ اسلامی فقہ وتاریخ اسلامی تہذیب وتمدن اور اسلامی روایات ومعاشرت کا مشکل سے کوئی پہلو ایسا ہوگا۔ جس پر اس میں فاضلانہ اور محققانہ مضامین شائع نہ ہوئے ہوں۔ یہ رسالہ دنیا بھر میں پڑھا جاتا ہے۔ اور اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے میں اس نے یقیناً بڑا کام کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

جس چیز نے مجھ کو زیادہ متاثر کیا، وہ یہ ہے کہ ووکنگ مشن والے فرقہ بندی سے بالکل علیحدہ بلکہ بالاتر ہو کر اسلام کی خدمت کر رہے ہیں۔ میں نے گذشتہ دس سال میں دیکھا ہے کہ عید کی نماز کی امامت

مختلف لوگوں نے کی ہے۔ ان میں ایران کے شیعہ مجتہد، انڈونیشیا کے سفیر، مشہور نومسلم انگریز ڈاکٹر کا دن اور عراق کے ڈاکٹر عبدالعزیز خلوصی شامل ہیں۔"

مولانا عبدالماجد دریابادی

"انھیں (مولانا محمد علی لاہوری) کے گروہ کے ایک اور رکن خواجہ کمال الدین تھے۔ ان سے دو تین بار ملاقات ہوئی۔ ہر بار ان کی غیرت دینی اور حمیت اسلامی سے بہت ہی متاثر ہوا۔ انھوں نے بھی انگریزی میں پبلک کے سامنے ایک بڑا تبلیغی کام کر دیا ہے۔ اپنی انگریزی تصانیف کے ذریعہ سے جمہور امت کو یہ چاہیئے تھا کہ ان سے جھگڑا کرنہیں بلکہ اپنے حسن تدبیر سے اس گروہ کو رفتہ رفتہ اپنے اندر جذب کرلیں۔" (معاصرین صفحہ ۴۳)

مولوی ابوالحسن علی ندوی

"مولوی محمد علی لاہوری کے بعد ان کے رفیق و معاصر اور انگلینڈ میں مشہور و معروف مبلغ اسلام اور انگریزی کے زبان آور خطیب خواجہ کمال الدین نے اس میدان میں خصوصی شہرت حاصل کی۔ اس سلسلہ میں ان کی دو کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک THE IDEAL PROPHET (مثالی نبی) دوسری SOURCES OF CHRISTIANITY (ینابیع المسیحیت) یہ بھی اپنے رفیق و امیر مولوی محمد علی لاہوری کی طرح مرزا غلام احمد صاحب کے معتقد و مرید تھے لندن کا WOKING MISSION سنٹر عرصہ تک ان کی زیر نگرانی اور سرپرستی میں کام کرتا رہا۔"

(اسلامیات اور مغربی مستشرقین و مسلمان مصنفین صـ۳۴)

مارماڈیوک پکتھال

"مجھے وہ دن بخوبی یاد ہیں جب میں نے انھیں (خواجہ کمال الدین) عین عنفوان شباب میں انگلستان کی سرزمین پر دیکھا اور جو تاثر انہوں نے اپنے ملنے والوں پر چھوڑا ہے۔ اُسے میں اب بھی محسوس کرتا ہوں۔ میں انھیں مشنری کی حیثیت میں یاد نہیں کرتا۔ کیونکہ لفظ مشنری کی وابستگیاں بہت گھٹیا ہیں۔ بلکہ میں انہیں پیغامبر اسلام کی حیثیت میں یاد کرتا ہوں۔ ناسازگاری طبع کے باعث ان کی مراجعت ہندا انگلستان میں تبلیغ اسلام پر وہ خطرناک دھچکا تھا جس سے وہ ابھی تک سنبھل نہیں سکی۔

مجھے ان سے بعض مسائل میں اختلاف تھا۔ جسکو میں اب اہم نہیں سمجھتا۔ لیکن میں انکو ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھتا رہا۔ اور اب جو میں ان کی زندگی کے اس عظیم کام کو دیکھتا ہوں۔ جو وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ تو میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کوئی بھی زندہ انسان اس وقت ایسا نہیں جس نے اسلام کی ایسی درخشاں اور مسلسل خدمت سرانجام دی ہو۔" (مارماڈیوک پکتھال)

مفسر قرآن مولوی محمد علی صاحب لاہوری کی شہرۂ آفاق و مایۂ ناز انگریزی تصنیف THE RELIGION OF ISLAM پر تبصرہ کرتے ہوئے مارمڈیوک پکتھال صاحب لکھتے ہیں :

"اسلام کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے مولانا محمد علی صاحب لاہوری سے بڑھ کر اور زیادہ قابل قدر خدمت غالباً کسی اور معاصر نے انجام نہیں دی ہے۔ مولانا موصوف اور مرحوم خواجہ کمال الدین صاحب کے علمی کارناموں کی بدولت احمدیت کو چار چاند لگ گئے ہیں"

جناب ڈاکٹر شیخ محمد اکرام صاحب ڈی لٹ مصنف "موج کوثر"

"قرآن مجید کی اشاعت اور عام مذہبی خدمت کے علاوہ اہم ترین کام جو لاہوری جماعت احمدیہ نے انجام دیا ہے۔ وہ بیرونی ملکوں میں اشاعت اسلام ہے۔ جس میں ابتدا اور غیر معمولی کامیابی کا سہرا جماعت کے سب سے کامیاب مبلغ خواجہ کمال الدین کے سر ہے۔

خواجہ کمال الدین ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے۔ اعلےٰ تعلیم مشن کالج لاہور میں پائی اور اس مخالفانہ مسیحی ماحول میں اسلام کی خوبیاں نمایاں کرنے کی وہ تڑپ پیدا ہوئی جس نے انھیں بالآخر ایک کامیاب تحریک تبلیغ کا بانی بنا دیا۔ اسی زمانے میں احمدیہ جماعت سے منسلک ہوئے۔ .... آپ نے دنیوی دولت اور مستقبل کی ترقیوں کو نظر انداز کر کے انگلستان کا رخ کیا اور اپنی زندگی اسلام کی خدمت کے لئے وقف کر دی۔ ......

خواجہ صاحب کی وفات سے (ووکنگ مسلم) مشن کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ مشن کی کامیابی کی بڑی وجہ خواجہ صاحب کی وجیہہ شخصیت، علمی قابلیت، مذہبی جوش اور اخلاقی جرأت تھی۔ تاہم مشن کا کام خواجہ صاحب کے وضع کئے ہوئے اصولوں پر چل رہا ہے۔ اور اب بھی ووکنگ مشن ایک اہم اسلامی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

لارڈ ہیڈلے مرحوم سر آرچی بالڈ ہملٹن، سر ہیوبرٹ رنکن، مسٹر ولیم بشیر پکیارڈ، مسٹر سعید فیلکس ویلائی، مسٹر حبیب اللہ لوگر وغیرہ جن لوگوں نے مشن کی تبلیغ سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا ہے ممتاز اور قابل قدر ہستیاں ہیں۔ اور اسلام یہ دعوے کر سکتا ہے۔ کہ اگر مشنریوں نے ہندوستان میں غریب یا ان پڑھ مسلمانوں میں سے چند ایک کو بپتسمہ دے لیا ہے۔ تو اس کے مقابلے میں کئی معزز تعلیم یافتہ اور قابل عیسائیوں نے اسلام کی حقانیت کا دل و جان سے اعتراف کر کے اسلام قبول کیا ہے۔ اس کام میں اولیت کا فخر خواجہ کمال الدین ہی کو حاصل ہے۔ اور ہندوستان کیا تمام عالم اسلامی کی مذہبی اور روحانی تاریخ میں ان کا نام یادگار رہے گا۔"

(کتاب "موج کوثر" از جناب شیخ محمد اکرام صاحب)

"ختم شد"

ماہنامہ "معارف" اعظم گڈھ

"عیسوی سال کے خاتمہ پر (۲۸/ دسمبر ۱۹۳۲ء) کو مذہب عیسوی کے سب سے بڑے نقاد اور عیسوی ممالک میں اسلام کے مشہور مبلغ خواجہ کمال الدین نے، افسوس ہے کہ وفات پائی۔ وہ کئی برس سے سِل کے مرض میں مبتلا تھے۔ اور اس حالت میں بھی وہ تصنیف و تالیف میں ہمیشہ معروف رہے۔ احمدی جماعت میں ہمارے نزدیک وہ عام مسلمانوں سے سب سے زیادہ قریب تھے۔ اسی لئے ان کے مشن کا بار اٹھانے میں عام مسلمانوں اور امراء نے بھی شرکت کی تھی اور شاید یہ راز نہ ہو کہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم اور مولانا شبلی مرحوم نے ان کی امدادی تحریکوں میں سب سے زیادہ دلچسپی لی۔ مولانا مرحوم نے ایک دفعہ علماء کے بالمقابل نوجوان تعلیمیافتوں میں سے خواجہ صاحب کے عزم تبلیغ کو سامنے رکھکر یہ شعر خود انہیں کے خط میں لکھا تھا۔ ؎

کامل اس فرقہ زہاد سے اُٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

گو ہمکو خواجہ صاحب کے بہت سے خیالات اور تاویلات سے اتفاق نہیں۔ تاہم یہ کہنا اظہار واقعہ ہے کہ انہوں نے ۱۹۱۲ء سے لیکر ۱۹۳۲ء تک اپنی پوری بیس برس کی زندگی اسلام کی تبلیغ اور اس کے محاسن کی اشاعت اور یورپ میں اسلامی لٹریچر کی فراہمی میں صرف کی اور نیز یہ کہ ان کی تصنیفات کے بڑے حصّہ کا موضوع "احمدیّت" نہیں "محمدیّت" ہے۔ افسوس کہ ان کی موت سے دنیا کی مذہبی بزم میں ایک اہم جگہ خالی ہو گئی۔ اللہ ان کے اعمال صالحہ کے صدقہ میں ان کو اپنی مغفرت سے نوازے اور ان کی لغزشوں سے درگذر فرمائے۔"

("معارف" بابت جنوری ۱۹۳۳ء)

"اخبار مشرق" گورکھپور

"موت ایک مسلم کے لئے یقیناً ایک بڑی مسرت و شادمانی کا موقع ہے خصوصیت سے جب ایک مسلم سپاہی کو میدان کارزار میں اس کے گھونٹ جام شہادت کے ساتھ حوران قدس کے ہاتھوں میسر ہوں۔ خواجہ کمال الدین صاحب میدان جہاد میں تلوار لے کر نہ اترے۔ لیکن دنیا جانتی ہے کہ آپ نے اپنی ہستی کا سارا خون محض قلم و دماغ کے ذریعہ صرف اسلام اور بانی اسلام کے واسطے اس سے زیادہ دلیری اور پامردی سے صرف کیا۔ جو کسی شہید حریّت کو صحیح جہادِ اسلامی میں نصیب ہو۔ اگر یہ سچ ہے اور یقیناً سچ ہے کہ ایک عالم دین کے قلم کی روشنائی بارگاہِ ربوبیت میں شہیدوں کے قطرہ ہائے خون سے زیادہ گراں تُلے گی۔ تو یقیناً حضرت خواجہ یوم نشور کو خدائے برتر و توانا کی درگاہ میں شہدائے بدر کے صف اوّل میں نظر آئیں گے۔ حضرت خواجہ نے اس دور میں جبکہ یہاں تک

نوبت آچکی ہے۔ کہ کلمہ شہادت کا محض زبان سے اقرار کرنے والا مومن قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ کام کیا ہے کہ جس کے لئے کم از کم ایک مجددِ وقت کی ضرورت پڑا کرتی ہے۔ یہ محض حضرت خواجہ کی سچی اور صحیح اسلامی خدمت کا نتیجہ ہے۔ کہ اسلام آج پھر اپنے صحیح اور اصلی روپ میں دنیا کے سامنے پیش ہو رہا ہے۔ اور ایک طرف تو ہمارا بڑا انگریزی داں طبقہ جو یورپ کی مادیت و دہریت سے مسموم ہو کر اسلام سے دور ہو رہا تھا۔ پھر اسی کملی والے کے دامنِ مزار شفقت میں سربسجود نظر آرہا ہے۔ اور دوسری طرف خود گمراہ یورپ اپنی تاریک چادروں کو جس سے اس۔ نہ صدیوں اپنی آنکھوں پر غلاف چڑھا رکھا تھا پارہ پارہ کر رہا ہے اور آفتاب اسلام کی روشنی سے آنکھوں ہی نہیں بلکہ اپنے دلوں کو بھی قلب ماہیت کر رہا ہے۔ یہ حضرت خواجہ کا فیض اثر ہے.......... خواجہ صاحب اس اندھیری مادی دنیا کو اس مشعل ہدایت کی ایک جھلک دکھا گئے جو آج سے ۱۴سو سال قبل فاران کی چوٹیوں سے بلند ہو کر دنیا کو دعوتِ صراطِ مستقیم دے چکا ہے......" (مشرق ۱۹/ جنوری ۱۹۳۳ء)

اخبار ہفت روزہ "وحدت"

"خواجہ کمال الدین نے.... صرف اسلام پر انگریزی میں بے شمار کتابیں لکھیں جن کو ساری دنیا میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ خواجہ صاحب نے ساری دنیا کا دورہ کیا۔ اور یورپ میں عیسائیوں کے بڑے بڑے مراکز میں پہنچ کر لارڈ ڈیوک اور سائنسدانوں کو مسلمان کیا۔ اور لارڈ ہیڈ لے جیسے معزز انگریزوں نے اسلام قبول کیا۔ دہریوں کی سوسائٹیوں میں جا کر خواجہ صاحب نے خدا کے وجود پر لیکچر دیئے۔ جو طبع ہو کر ساری دنیا میں پھیلے۔"

(وحدت ۷/ جنوری ۱۹۵۷ء)

جناب مولوی شوکت علی فہمی۔ مدیر "دین و دنیا"

"خواجہ کمال الدین مرحوم اسلام کے بہت بڑے مبلغ ہوئے ہیں۔ جنہوں نے نہ صرف انگلستان میں بلکہ پورے یورپ میں اسلام کے پھیلانے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔"

(ماہنامہ "دین و دنیا" دہلی جون ۱۹۶۳ء صا۴)

اخبار "تازیانہ" لاہور

"۱۹۱۲ء میں آپ نے چلتی وکالت کو خیرباد کہہ دیا۔ اور یکہ و تنہا مغرب میں اسلام کی اشاعت کی خاطر انگلستان تشریف لے گئے۔ گو اس وقت تو یہ ایک مجنونانہ فعل سمجھا جاتا تھا۔ لیکن بعد کے واقعات اور مغرب میں شاندار اسلامی فتوحات نے آپکے خلوص اور جذبہ اشاعت دین پر مہر تصدیق لگا دی۔...... آپ نے اسلام اور رد دیگر مذاہب پر سو ایک کتابیں لکھیں۔ اور شائع کیں۔ جنہوں نے دنیا کے مذہبی خیالات میں انقلاب عظیم برپا کر دیا ہے۔

آپ کا محکم ایمان تھا کہ اسلام میں کوئی فرقہ نہیں۔ آپ ہمیشہ اسلام کو اپنی اصلی صورت و شکل میں پیش کرنے میں مساعی رہے۔۔۔۔۔ آپ کے ہاتھ پر کئی ہزار انگریز نژاد مرد و خواتین حلقہ بگوش اسلام ہو چکے ہیں۔ اور عالی جناب دی رائٹ آنریبل لارڈ ہیڈلے صاحب بالقابہ کی قبولیت اسلام آپ کی محنت شاقہ کا بہترین ثمرہ ہے۔ آپ نے اسلام کی خاطر مشرق کے اہم مقامات کا دورہ فرمایا۔ اور ان تمام مقامات پر اسلام پر لیکچر دیئے۔ جو از حد مقبول عام ہوئے۔ آپ نے دو دفعہ حج فرمایا اوّل بار ۱۹۱۵ء میں دوسری بار عالی جناب لارڈ ہیڈلے صاحب بالقابہ کی معیّت میں ۱۹۲۳ء میں حج فرمایا۔ آپ نے ایک نہایت ہی سادہ زندگی بسر فرمائی۔ اور اسلام کی خاطر ہر ایک قیمتی چیز کو قربان کر دیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ نے اپنے ایام علالت میں ترجمۃ القرآن انگریزی اور اس کی تفسیر کو طبی مشیروں کے مشورہ کے خلاف جاری رکھا۔ اور اس خدمتِ قرآن میں آپ کا خاتمہ بالخیر ہو گیا۔۔۔ حضرت خواجہ کمال الدین صاحب ایک نمایاں شخصیت کے انسان تھے۔ اور پلیٹ فارم پر آپ کی ذاتِ مبارک ایک مؤثر ہستی ہوا کرتی تھی۔ آپ ایک زبردست فصیح و بلیغ مقرر تھے۔ اور گھنٹوں تک جلسوں میں لیکچر کیا کرتے تھے۔ آپ کے لیکچروں سے سامعین کبھی بھی اکتایا نہ کرتے تھے۔ آپ محبّت و اخلاق کے مجسمہ تھے۔ اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا۔ کہ اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت آپ اپنے پیچھے تمام دوست و مہربان ہی چھوڑ گئے ہیں۔ اور ان میں سے کوئی بھی آپ کا دشمن نہیں۔ آپ نے جس محبت و عشق سے خدمتِ اسلام و خدمتِ قرآن کی ہے۔ وہ عدیم النظیر ہے۔ اور اس زمانہ میں اسلام کی تبلیغی تگ و دو میں آپ کا ثانی ملنا محال ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس نقصان عظیم کی تلافی اسلامی دنیا میں مشکل اور ناممکنات میں سے ہے۔"

(اخبار تازیانہ۔ ۱۶ر جنوری ۱۹۳۳ء)

مولوی عبدالمجید قرشی مرحوم ایڈیٹر اخبار "ایمان" پٹنہ

"ہندوستان کے مبلغ اعظم خواجہ کمال الدین اس دنیا سے چل بسے اس حادثۂ پُرالم پر جس قدر بھی غم و اندوہ کا اظہار کیا جائے بجا ہے۔ خواجہ کمال الدین کا انتقال ایک مصیبت ہے۔ ان کی زندگی امت مسلمہ کے لئے ایک بشارت تھی۔ ایسا مجاہد اولوالعزم، مدبر نکتہ و راور صاحب قلب، صاحب قلم اور صاحب لسان آدمی، صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ ہم کو خواجہ کمال الدین صاحب کی فرض شناسی دردِ اسلام اور خدمتِ دین و ملت پر فخر ہے۔ وہ جب تبلیغ اسلام کے لئے عازم یورپ ہوئے اکیلے تھے۔ آج صدہا سفید روحیں ان کے نقش قدم پر چل رہی ہیں۔ خواجہ صاحب کی خدمات بے شمار ہیں۔ ان کی پوری زندگی اعلاء کلمۃ الحق میں بسر ہوئی۔ خواجہ صاحب ان لوگوں میں سے ہیں۔ جو اپنے کارناموں کے باعث موت کے بعد صدیوں

تک زندہ رہتے ہیں ہم اس جوانمرد تاریخی شخصیت کی بے مثال خدمات کا اعتراف کرتے ہیں۔ اور یقین رکھتے ہیں کہ خواجہ صاحب کے قدر دان اور جماعت احمدیہ ان کے مشن کو زیادہ وسعت اور عمدگی کے ساتھ جاری رکھے گی۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے دامنِ رحمت میں جگہ دے۔" (ایمان۔ مورخہ ۱۵ر جنوری ۱۹۳۳ء)

خواجہ صاحب ۲۸ر دسمبر ۱۹۳۲ء میں وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، آپ کی وفات کے موقع پر ملک کے متعدد علمی، ادبی جرائد نے جن خیالات کا اظہار کیا۔ ان میں سے چند ایک کا خلاصہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔

(ا) آپ ۱۹۱۳ء میں ورکنگ مسجد کے امام مقرر ہوئے۔ آپ نے اسلام اور دیگر مذاہب پر بے شمار کتابیں تصنیف فرمائیں جن کی وجہ سے دنیائے مذہب میں ایک انقلاب رونما ہو گیا۔ آپ کے بابرکت ہاتھ پر صدہا انگریز مردوں اور عورتوں نے اسلام قبول کیا۔ انگلستان جانے سے قبل آپ کی جائداد قریباً ڈیڑھ لاکھ کی تھی

الحاج خواجہ کمال الدین بانی ووکنگ مسلم مشن (انگلستان)

حضرت الحاج خواجہ کمال الدین ۱۸۷۰ میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا حضرت خلیفہ عبدالرشید لاہور کے مشہور شاعر اور قاضی تھے۔ آپ نے فورمین کرسچین کالج سے ۱۸۹۳ء میں بی اے پاس کیا اور اکنامکس میں گولڈ میڈل حاصل کیا اسلامیہ کالج لاہور میں لیکچرار اور پھر پرنسپل کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۸۹۸ء میں آپ نے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی اور پشاور میں وکالت شروع کی۔ اسی دوران برصغیر پاک و ہند کا دورہ فرمایا اور اسلام پر لیکچر دیئے آپ نے علیگڑھ یونیورسٹی کے مالی استحکام کے لئے بھی متعدد دورے کئے۔ ان خدمات کے صلہ میں آپ کو علیگڑھ یونیورسٹی کا فیلو بنادیا گیا۔ آپ اس یونیورسٹی بورڈ آف ٹرسٹیز کے ممبر بھی رہے۔ اسلام کے لئے درد اور تڑپ نے آپ کو برصغیر میں متعارف کرایا۔

۱۹۱۲ء میں تبلیغ اسلام کے لئے آپ انگلستان تشریف لے گئے اور مختلف ثقافتی جماعتوں میں اسلامی تعلیمات پر روشنی ڈالی۔ اہلِ مغرب کو اسلامی تعلیمات سے متعارف کرانے اور اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف غلط فہمیوں اور اعتراضات کو دور کرنے کے لئے ۱۹۱۳ء میں ایک انگریزی ماہنامہ اسلامک ریویو اینڈ مسلم انڈیا کے نام سے جاری کیا۔ اس رسالہ میں اسلام کے متعلق مضامین کے علاوہ مسلمانوں کے سیاسی اور تمدنی حالات و کوائف بھی شائع ہوئے انگلستان میں بیٹھے ہوئے بھی خواجہ صاحب ہندوستان کے مسلمانوں کی مشکلات سے بے پروانہ ہوئے اور گاہے گاہے ان کی رہنمائی کرتے رہے۔ چنانچہ ۱۰ فروری ۱۹۱۳ء میں خواجہ صاحب نے آل انڈیا مسلم لیگ کے لکھنؤ کے اجلاس کے لئے انگریزی میں ایک خط لکھا جس میں انگریزوں کے ذہن میں ہندوستانی مسلمانوں کے لئے خصوصاً اور دوسرے مسلمانوں کے خلاف عموماً مدرجہ کی نفرت اور تعصب کا بالتفصیل ذکر کیا اس وقت خواجہ صاحب کا دفتر ۱۱۱ فلیٹ سٹریٹ لندن میں تھا۔ انہی ایام میں سب سے پہلے قبول اسلام کرنے والی سعید روح ایک خاتون تھیں جن کا نام مسز دا ایولٹ ابراہیم تھا۔ جولائی ۱۹۱۳ء میں آپ نے کانگریس آف ریلیجس پر وگریس کے

جنے بین الاقوامی اجلاس منعقدہ پیرس میں شرکت فرمائی۔ ووکنگ سرے میں ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر نے بیگم بھوپال اور دوسرے مسلمان امراء کے عطیات سے ایک مسجد تعمیر کی اور اس کے ساتھ ایک رہائشی مکان بنوایا تھا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم اورینٹل انسٹی ٹیوٹ ووکنگ کے نام سے کئی بلند پایہ کتابیں بھی شائع کرتے رہے۔ یہ مسجد ڈاکٹر صاحب کی موت کے بعد سے بند پڑی تھی۔ خواجہ صاحب مرحوم نے سر عباس علی بیگ اور سید امیر علی مرحوم کی مدد سے یہ مسجد اور اس سے ملحقہ جائداد کا ایک ٹرسٹ قائم کیا۔ اور ۱۲ اگست ۱۹۱۲ء میں پہلی مرتبہ وہاں نمازوں کا سلسلہ جاری ہوا۔

۱۰ دسمبر ۱۹۱۳ء کو لارڈ ہیڈلے نے جب اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا۔ تو عیسائی دنیا میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ دسمبر ۱۹۱۳ء تک کپتان سٹیلے سگرہا، وائیکونٹ کاٹیڈیونیز تو بل مین یورکیوچ، لیڈی کیوبولڈ، مسز طورڈ خواتین جیسی نامور ہستیاں اسلام قبول کر چکی تھیں۔ دو سال کے قلیل عرصہ میں اسلام قبول کرنیوالوں کی تعداد ایک سو دس تک پہنچ چکی تھی۔ جون ۱۹۱۴ء میں آپ ہندوستان واپس آگئے۔ اور دو سال تک یہیں رہے۔ اور مرکزی دفتر کے قیام اور مالی وسائل کے لئے کوشاں رہے۔ ۱۹۱۶ء میں آپ پھر انگلستان تشریف لے گئے۔ مارچ ۱۹۱۹ء میں آپ سخت بیمار ہو گئے۔ اور ڈاکٹروں کے مشورہ کے مطابق آپ ہندوستان واپس تشریف لے آئے۔ جنوری ۱۹۲۰ء میں ہندوستان کے مختلف مقامات کا دورہ کیا۔ فروری ۱۹۲۰ء میں آپ مدراس گئے۔ اور متعدد جلسوں سے خطاب کیا۔ ستمبر ۱۹۲۰ء میں آپ نے رنگون، برہما اور جاوا کا دورہ شروع کیا۔ ۲۲ نومبر ۱۹۲۱ء کو انگلستان پہنچے۔ مئی ۱۹۲۳ء میں لیگ آف نیشنز یونین انگلستان کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۲۳ جون ۱۹۲۳ء میں لارڈ ہیڈلے الفاروق کے ساتھ حج بیت اللہ کے لئے انگلستان سے روانہ ہوئے۔ ۵ جولائی ۱۹۲۳ء کو اسکندریہ پہنچے۔ ان کے اور لارڈ ہیڈلے کے اعزاز میں متعدد اجلاس منعقد ہوئے جن میں آپ نے بھی تقاریر فرمائیں۔

۸ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو لارڈ ہیڈلے کی معیت میں ہندوستان پہنچے اور سارے ہندوستان کا دورہ کیا اگست ۱۹۲۴ء کو بمبئی میں ہندو مسلم اتحاد کے سلسلہ میں متعدد جلسوں سے خطاب کیا۔ نومبر ۱۹۲۴ء میں علیگڑھ یونیورسٹی میں مسلمان نوجوانوں کو اسلام پر متعدد لیکچر دیئے۔ اگست ۱۹۲۵ء میں پھر انگلستان تشریف لے گئے۔ فروری ۱۹۲۶ء میں لارڈ ہیڈلے کے ساتھ افریقہ کے دورے پر گئے اور ستمبر تک مشرقی اور

جنوبی افریقہ میں اسلام پر تقاریر کیں۔ اور پادری زویمر جیسے دشمن اسلام کے پھیلائے ہوئے زہر کا تریاق بنے۔ ۹ر ستمبر ۱۹۲۶ء کو آپ ہندوستان واپس آگئے۔ مارچ ۱۹۲۷ء میں مسلمانانِ ہند کی ذہنی اور سیاسی الجھنوں کا آپ کو شدید احساس ہوا اور اردو ماہنامہ اشاعتِ اسلام جس میں صرف اسلامک ریویو کے مضامین کا اردو ترجمہ شائع ہوا کرتا تھا۔ ان مسائل پر بھی مضامین لکھنے شروع کیے۔ افریقہ سے واپسی پر آپ کی صحت زیادہ گر گئی تھی۔ دو مرتبہ آپ کو ڈاکٹروں کے مشورہ پر کشمیر جانا پڑا، لیکن صحت کی خرابی کے باوجود آپ نے متعدد مضامین سپردِ قلم فرمائے اور تفسیر قرآن کے کام کو بھی جاری رکھا یہ مضامین جنوری ۱۹۳۲ء سے اشاعتِ اسلام میں شائع ہونے شروع ہوئے۔ دسمبر ۱۹۳۲ء میں آپ نے سورۃ فاتحہ کی نہایت فصیح و بلیغ تفسیر لکھنی شروع کی اور ۲۸ر دسمبر ۱۹۳۲ء کو اپنی وفات سے چند لمحات پہلے اس کو مکمل کر دیا۔

حضرت خواجہ کمال الدین کے متعلق مارماڈیوک پکتھال لکھتے ہیں :-

"مجھے وہ دن بخوبی یاد ہیں جب میں نے انہیں (خواجہ کمال الدین) عین عنفوان شباب میں انگلستان کی سرزمین پر دیکھا اور جو تاثر انہوں نے اپنے ملنے والوں پر چھوڑا ہے اسے میں اب بھی محسوس کرتا ہوں میں انہیں مشنری کی حیثیت سے یاد نہیں کرتا ——— کیونکہ لفظ مشنری کی وابستگیاں بہت گھٹیا ہیں ——— بلکہ میں انھیں پیغامبر اسلام کی حیثیت میں یاد کرتا ہوں۔ ناسازگاری طبع کے باعث ان کی مراجعت ہند انگلستان میں تبلیغ اسلام پر وہ خطرناک دھکا تھا جس سے وہ ابھی تک سنبھل نہیں سکی۔

مجھے اُن سے بعض مسائل میں اختلاف تھا۔ جس کو میں اب اہم نہیں سمجھتا، لیکن میں ان کو ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھتا رہا۔ اور اب جو میں ان کی زندگی کے اس عظیم کام کو دیکھتا ہوں جو وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں، تو میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کوئی بھی زندہ انسان اس وقت ایسا نہیں جس نے اسلام کی ایسی درخشاں اور مسلسل خدمت سرانجام دی ہو۔"

ISBN 81-900537-5-2